سوانح مولانا منصور انصاریؒ
سدا مہاجر
ریشمی رومال تحریک کا فراموش کردہ ہیرو
ڈاکٹر عبید اقبال عاصم

اِنِّیْ مُهَاجِرٌ اِلٰی رَبِّیْ

سوانح حیات علامہ محمد میاں منصور انصاریؒ

سدا مہاجر

ایک انصاری مجاہد کی داستان مہاجرت کا عنوان جلی

ریشمی رومال تحریک

مولف

ڈاکٹر عبید اقبال عاصم

امم سٹڈیز ہاؤس (Umam Studies House - USH) ٹورانٹو، کینڈا، کے تعاون سے

عنوان کتاب : سدا مہاجر

مولف عبید اقبال عاصم

نگراں و مدیر اعلی : ڈاکٹر عابد اللہ غازی

تدوین و تہذیب : محمد طارق غازی

قسم موضوع : سوانح - تاریخ - سیاسیات - عمرانیات

سنہ اشاعت : ۱۴۴۲ھ / ۲۰۲۱ء

ISBN 0 000 00000 000

یہ کتاب ہندستان میں یہاں دستیاب ہے:

مکتبہ ملت. دیوبند ۲۴۷۵۵۴ (سہارنپور) یو. پی.	013-3622-5268
کتب خانہ عبدالسلام قاسمی. بھنڈی بازار ممبئی ۴۰۰۰۰۳.	093-2260-3836
فردوس کتاب گھر. بھنڈی بازار ممبئی ۴۰۰۰۰۳.	098-9218-4258
ہندستان پیپر امپوریم. ۱۲۷ مچھلی کمان. حیدر آباد ۵۰۰۰۰۲.	092-4654-3507
دکن ٹریڈرس. ۸-۳۷۸-۲-۲۳ مغل پورہ. حیدر آباد ۵۰۰۰۰۲.	099-4886-9464
حنفی کتب خانہ. موتی. بنگلور (کرناٹک)	098-4561-5504
قاسمی کتب خانہ. ٦ لکی پلازا بیسمنٹ. ہائرسندرامن روڈ. تلک نگر. بنگلور.	098-8066-0766
مکتبہ الغزالی. مدینہ چوک. گاؤ کدل. سری نگر. (جموں و کشمیر)	
محفوظ بک ڈپو. مالیگاؤں.	093-7363-9359

انگلینڈ میں: **Al-Farooq International Ltd.**

68 Ashfordby Street. Leicester. LE5 3QG (UK). Tel: 116-253-7640

امریکہ میں: Iqra Book Center

2751 W. Devon. Chicago. Illinois. 60659 (USA). Tel: 773-274-2665

ناشر : **اقرا ایجوکیشن فاؤنڈیشن**

A-2 Firdaus. 24 Veer Savarkar Road. Mahim (W) Mumbai 400016. India

Tel: +91-22-2444-0494

Email: contact@iqraindia.org www.iqraindia.org

قیمت: ہندستان میں: Rs 500/- In the US/Overseas. $25/-

انتساب

حفصہ خاتون بنت مولانا صدیق احمد
اہلیۂ مولانا محمد میاں منصور انصاری

ایک انصاری مومنہ
جس نے جنوبی ایشیا اور عالم اسلام کی آزادی کی خاطر
اپنے جواں سال انصاری شوہر کو
دائمی ہجرت کی بے شجر گزرگاہوں میں گم کر دیا
اور تین کمسن بچوں کے ساتھ پیٹ پر پتھر باندھ کر زندگی کر گئی

عرض ناشر

مجاہد جلیل علامہ محمد میاں منصور انصاری کی سوانح اور ان کی حیرت انگیز ملی سیاسی خدمات کا تذکرہ نہ جانے کب سے اپنے اہل قلم کا انتظار کر رہا تھا. اب جبکہ ان کے سانحۂ انتقال کو ۷۰ برس گزر چکے ہیں یہ پہلی تفصیلی اور دستاویزی کوشش منظر عام پر آ رہی ہے.

اس تحقیق کی اشاعت کا خواب ۱۹۶۰ میں دیکھا گیا تھا جب مولانا محمد میاں منصور انصاریؒ کے نبیرۂ اکبر ڈاکٹر عابداللہ غازی نے لندن میں تعلیمی قیام کے دوران. اپنے تعلیمی وظیفہ سے رقمیں بچا بچا کر برٹش میوزیم اور انڈیا آفس لائبریری میں محفوظ اصل ریشمی رومال خطوط کی اور بہت سی دیگر ان چھوٹی دستاویزوں کی کاغذی اور فلمی (microfilms) نقول بہ زبان انگریزی حاصل کیں. ہزارہا گرد آلود کاغذات میں سے مطلوبہ دستاویزوں کا حصول بجائے خود مہم تھی.

اس بیش قیمت ذخیرہ پر مستزاد وہ دستاویزی تحریریں، نیز فارسی میں تحریر کئے ہوئے خطوط بہ سلسلۂ افغانستان وتحریک ریشمی رومال ہیں جو ڈاکٹر غازی نے افغانستان میں علامہ منصور انصاری کے صاحبزادگان قاری حمید میاں انصاریؒ، ماسٹر عبیداللہ منصور انصاری، مولانا قاری سیف اللہ منصور انصاری اور حضرت علامہ کے افغان شاگردوں اور منتسبین کے پاس سے مختلف شخصیات سے متعلق منتشر کاغذات ومضامین کی شکل میں جمع کئے تھے.. ان دستاویزوں میں مکمل رولٹ کمیٹی رپورٹ کے علاوہ مولانا منصور انصاری کے ان خطوط کی نقلیں شامل تھیں جو انہوں نے ریشمی رومال تحریک آزادی کے سلسلہ میں ملک کی مختلف اہم شخصیات کو لکھے تھے. اس مقصد کے لئے ڈاکٹر عابداللہ غازی نے زمانہ طالبعلمی ہی سے کئی بار افغانستان کا سفر کیا اور یوں جمع کئے ہوئے دستاویزی ذخیرہ دکی اساس پر ایک بڑے کام کا منصوبہ تھا.

ڈاکٹر عابداللہ غازی کی ہدایت پر اور نگرانی میں ریشمی رومال تحریک کے بارے میں انگلستان، افغانستان اور ہندستان میں بکھری ہوئی مستند تاریخی اور واقعاتی دستاویزوں کی بنیاد پر مرتب کی ہوئی یہ کتاب علمی دنیا کے حوالہ کی جارہی ہے.

یہ سعادت مولانا ڈاکٹر عبید اقبال عاصم کے حصہ میں آئی. انہوں نے ان تمام منتشر دستاویزوں، کاغذات، مکاتیب اور زبانی معلومات کو یکجا اور کتابی صورت میں مرتب کرنے کی مشقت اٹھائی. سوء اتفاق سے ان کی مرتب کی ہوئی کتاب کا اصل مسودہ کسی وجہ سے ضائع ہوگیا تھا. ہماری درخواست پر انہوں نے یہ کتاب اسی محنت شاقہ کے بعد از سر نو مرتب کی. اقرا فاؤنڈیشن اور خانوادہ علامہ منصور انصاری اس باب میں صمیم قلب سے ان کے شکرگزار ہیں.

برٹش میوزیم اور انڈیا آفس لائبریری میں تحریک ریشمی رومال کا صرف وہ حصہ محفوظ ہے جو بعض وطن دشمن افراد کے واسطوں سے برطانوی حکام ہند کے ہاتھ لگ گیا تھا. اس تاریخ کے بہت سے حقائق کا علم انگریزوں کو نہیں ہوسکا تھا کیونکہ شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ سمیت برطانیہ کی روایتی حکومتی دہشت گردی کے تحت زیر عتاب آنے والے لوگوں نے ظالمانہ تشدد برداشت کیا تھا لیکن تحریک کے رازوں پر سے پردہ نہیں اٹھایا تھا. چنانچہ اس موضوع پر جو اجمالی تذکرے کتابوں میں درج ہوئے ہیں وہ نامکمل شواہد پر مبنی ہیں. جن مورخین کو ان شواہد کے ذرائع کا علم نہیں تھا ان پر کوئی الزام نہیں بلکہ وہ ستائش کے مستحق ہیں کہ معلومات کی کمی کے باوجود انہوں نے پوری دیانت داری سے اس عہد کی صورت گری کی کوشش کی. البتہ جو افراد کسی ثانوی یا ثالثی اعتبار سے تحریک شیخ الہند سے وابستہ تھے یا اس سے وابستہ اکابر اور مجاہدین سے انتساب رکھتے تھے انہوں نے اگر فرض سے پہلوتہی کی تو وہ تاریخ کی مد میں قابل معافی نہیں ہے.

ڈاکٹر عابداللہ غازی نے لندن میں زمانہ طالبعلمی کے دوران برطانوی سرکاری ذرائع سے جو معلومات حاصل کیں انہوں نے بعض لوگوں کو راستہ دکھایا جن کو درحقیقت نہ تو ان دستاویزوں کا علم تھا اور نہ وہ ان کے حصول کا طریقہ جانتے تھے. حکومت برطانیہ نے یہ دستاویزیں

عام کردی تھیں اوراس لئے کوئی بھی شخص انہیں حاصل کر لینے کا مجاز تھا.اہم بات ان دستاویزوں تک رسائی کی نہیں بلکہ ان کواس تاریخی پس منظر میں پیش کرنے کی ہے جس کے لئے شیخ الہندؒ شہید ہوئے،مولانا عبیداللہ سندھیؒ مادروطن اور مادرعلمی میں اجنبی ہوئے،مولانا محمد میاں منصورانصاریؒ بھلادئے گئے،اورلاتعدادمجاہدین اپنوں میں بیگانے بن کرزمین اوڑھ کرکہیں سوگئے.

زیرنظر کتاب میں کوشش کی گئی ہے کہ تحریک کے مختلف فکری اور عملی ادوار کی ہیئت سامنے آجائے جن کی بنیاد پر مستقبل کے مورخین کوتجزیاتی مطالعات لکھنے میں سہولت ہو.چنانچہ اس دستاویز میں انگریز نقطۂ نظر سے انڈیا آفس لائبریری لندن سے حاصل کی ہوئی رولٹ کمیٹی رپورٹ کا ترجمہ کردیا گیاہےتو دوسری جانب اکابرین تحریک آزادی ہند،افغانستان کےممتاز حکام بہ شمول شاہ افغانستان،پشتون قبائل آزاد کےسرداروں کے نام مولانا محمد میاں منصورانصاریؒ کےمکاتیب اوربعض صورتوں میں مولانا انصاری کے نام ان حضرات کے خطوط بھی من وعن شامل اشاعت کردئے گئے.ایک اہم تاریخی حقیقت یہ ہے کہ جب مکہ مکرمہ میں شیخ الہند کی گرفتاری اورتحریک کےافشاہوجانے کے بعد برصغیرایک بار پھرمنزل حریت تک نہ پہنچ سکااورمولانا محمد میاں انصاری کی مراجعت وطن ممکن نہ رہی تو مولاناانصاری نےعملی تحریک کا رخ ایک بار پھرعملی میدان سے فکری میدان کی طرف موڑ دیا تھا.اس دور میں ان کی سیاسی بصیرت کا رخ زیادہ واضح ہوگیا تھا. چنانچہ تحریک کےمتعلق اوراس کے بعد کے دور کی ان کی بہت سی نادرونایاب تحریریں زیرنظر کتاب میں شامل ہیں.اس دور میں انہوں نے ہندستانی اور عالمی سیاست پر نیز اسلامی تصورحکومت اور حکومت الٰہیہ پرلگا تارکئی مقالےتحریر کئے.ان میں سے اکثر مقالے یا ان کے اقتباسات اس کتاب کا جزو ہیں جس سے نہ صرف ۱۹۱۶ سے ۱۹۴۶ کے ہندستان بلکہ عالم اسلام کے مسائل کا اندازہ کرنا آسان ہوتا ہے.

مولانا منصورانصاری کی زندگی کے بارے میں ایک غیرمطبوعہ تحریرخودان کےقلم سے پائی گئی.اس کے علاوہ ان کے صاحبزادہ مولانا حامدالانصاری غازیؒ کی مختلف یادداشتوں میں

سوانحی واقعات بھی ڈاکٹر غازی کے ذخیرہ میں موجود ہیں.اضافی طور پر محمد ضیاء الدین احمد علوی امروہی کی مرتبہ ''مراۃ الانساب'' اور علامہ انصاری کے نبیرہ محمد طارق غازی کی سوانحی تحقیق ''تذکار الانصار'' (اقرا ایجوکیشن فاؤنڈیشن، ممبئی) میں انصاریان سہارنپور کے کئی بزرگوں کی زندگیوں پر بہت سے سوانحی مقالوں سے بھی مدد لی گئی ہے.

درحقیقت یہ کتاب برصغیر جنوبی ایشیا اور عالم اسلام کی تاریخ آزادی کے ایک اہم باب کا ابتدائیہ ہے جو اس جذبہ کے ساتھ اہل علم کی نذر کیا جارہا ہے کہ آنے والی نسلیں اس موضوع پر تحقیق و تجزیہ کا حق ادا کریں گی.

ناشران

جماعت جو کسی اجتماعی ہدایت کی علمبردار بن سکے اور جو اجتماعی اصول کو تہہ تک سمجھ کر اس کی اصلی شکل میں دنیا کے سامنے پیش کر سکے ان ممالک میں ان ملل میں مل سکے گی جو بشریت کی ہمدردی و انسیت کی خاطر سرفروشی کے خوگر ہیں. جن میں اجتماعی تحقیقات کا آزاد دریا بے خوف وخطر ٹھاٹھیں مار رہا ہے اور جن میں جرأت اخلاقی بھی ہے، جن کو اب حیات اجتماعی کی بے حد طلب ہے، جو غلامی و آزادی میں امتیاز کر سکتے ہیں، اور آزادی انسانی ان کو دنیا و مافیہا سے زیادہ عزیز ہے. میری رائے میں، اگر وہ غلط نہ ہو، وہ یورپ و امریکہ اول نمبر، جاپان بہ مرتبہ دوم ہے. اور اگر ہندستان (حکومت ربانی کا) مرکز تبلیغ قائم کر سکے تو اس کو نمبر اول.

مکتوب بنام قاری حمید میاں انصاری

فہرست

علامہ خلیل اللہ خلیلی

تعارف ومقام علمی

مولانا منصورؒ ابوایوبی

مولانا منصور ابوایوبی. جہاد کی خاطر ان کے آوازۂ بلند اور ان کے مایۂ علمی کا آغاز سلطنت امانی کے دوران شہر کابل اور اس کے نواحی علاقوں میں ہوا. آغاز جوانی میں چونکہ میں شہر کابل کے شمال میں واقع مضافات میں ایک جگہ مقیم تھا اس لئے مولانا منصور انصاری کے دیدار کی دولت مجھے حاصل نہ تھی. پھر وقت بدلا اور نادرشاہ کے دورحکومت کے آخری دنوں میں ۱۳۱۱ ہجری شمسی سال (۱۹۳۲عیسوی) میں نواح کابل کے قلعہ غیبی میں ان کا قیام ہوا تو پہلی بار ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا.

وہ موسم بہار تھا. مولانا منصور کی درویشانہ اور مختصر اقامت گاہ رودخانہ کابل کے قریب بید مجنوں اور عرعر کے درختوں کے جھنڈ میں تھی. ایک سادہ سے کمرہ میں دیوار پر ایک پرانی تلوار آویزاں تھی اور فرش پر ایک بوریہ کی جانماز پر وہ بیٹھتے تھے.

ان کی قامت کوتاہ تھی مگر محاسن بلند تھے. کشادہ پیشانی، پیوستہ ابرو اور آنکھوں میں عقاب کی غضبناکی، لبوں پر اندوہ کے سائے میں تبسم کا نور دور سے اپنی جگہ بناتا دکھائی دیتا تھا. دیوار پر ایک طاقچہ میں چند کتابیں، ایک چوبی رحل پر قرآن حکیم، صدرنشین کے سجادہ کے سامنے ایک پست میز (ڈیسک) پر قلم دوات اور چند اوراق کے اوج فقر وعزت سے ان کا کمرہ مزین تھا. چند اوراق دفتر اخوۃ الایمانیہ کے بارے تھے جو انہوں نے قائم کی تھی.

سراج الملت والدین امیر حبیب اللہ خان کے زمانہ حکومت سے انہیں میرے والد سے واقفیت تھی تو تعارف میں ان ایام اندوہ کی سرگزشت کے حوالہ سے انہوں میں گرم

جوشی سے مجھ سے معانقہ کیا اور افغانی رسم کے مطابق تین بار گلے ملے اور بڑے ادب اور تواضع کے ساتھ مجھے اپنے پاس بٹھایا. میں ان کی جاں بخش باتیں سنتا رہا. ان کا سبک سخن گویا نرم ریشم اور کابل کی مشکبار نسیم بہار کی مانند تھا.

پھر مجھے ان کی دولت دیدار بار بار میسر آتی رہی. ان ملاقاتوں کے اکثر موجودین میں (افغانستان کے مشہور شاعر، سفارت کار اور امیر حبیب اللہ خان کے بھانجے) مرحوم سردار نجیب اللہ تورَوایانا، ان کے بھائی مرحوم ڈکتور محمد انس جو اس وقت مولانا منصور انصاری کے درس میں شریک ہوتے تھے، دونوں بھائی وزارت معارف میں برسرکار تھے؛ (ماہر لسانیات پشتو) مرحوم شاہ عبداللہ بدخشی جن کے بارے میں عبداللہ افغانی لکھتے ہیں کہ وہ اس عصر کے جواں سال فضلا میں شمار ہوتے تھے اور مولانا منصور انصاری کو مانند اولاد عزیز تھے.

مولانا منصور انصاریؒ کی سیاسی اور اجتماعی مجالس رات کے وقت مرحوم مولوی عبدالرب رئیس تمیز، اور ان کے بھائی عبدالرحیم کے گھر پر ہوتی تھیں. دونوں بھائی مجاہد بزرگ حاجی عبدالرزاق مرحوم کے صاحبزادگان تھے. ان مجالس کے حاضرین میں زیادہ تر وزیر فوائد عامہ (public welfare) عبدالرحیم خان کوہستانی، رکن مجلس سنا نادر علی جاغوری، معین مالیہ (finance secretary) غلام مجتبی، جنرل سید حسن کنڑی؛ خواجہ ہدایت اللہ اور عبد العزیز قندھاری ہوتے تھے. کوشش ہوتی تھی کہ راتوں میں منعقد ہونے والی یہ مجالس خفیہ رہیں. مجلسوں کے صدر نشین بلاشبہ مولانا منصور انصاری ہوتے تھے. ان مجالس میں معاشرتی فساد، مسلمانوں کے داخلی اختلافات، استبداد اور رشوت ستانی کے سد باب پر بات ہوتی تھی اور ان معاملات میں تائید کے طور پر مولانا منصور انصاری قرآنی آیات اور احادیث نبوی پیش فرماتے تھے، اور جو کچھ بھی بیان کرتے وہ حکومت الٰہی کی تفصیل ہوتی تھی.

ان مجلسوں میں ہندستان کی آزادی اور اسی ذیل میں ایشیائی اقوام کے بارے میں بحث و گفتگو ہوتی تھی. استاد بزرگوار مجاہد کبیر سید مبشر طرازی اور استاد ہاشم شایق بنی رابی،

رئیس دار التالیف، بھی نہایت راز داری کے ساتھ دعوت عمل دیتے تھے. ان کے علاوہ برصغیر کے دانشمند مرحوم یعقوب حسن بھی یہی دعوت دیتے تھے.

جیسا کہ ذکر ہوا یہ مجالس علامہ معروف حاجی عبدلرزاق کے صاحبزادگان عبدالرب خاں اور عبدالرحیم خان کے قلعہ میں گزشتہ صدی کی چوتھی دہائی کے دوران ہوتی تھیں اور عام طور سے شام سے صبح تک جاری رہتی تھیں. چونکہ حکومت وقت سخت نگرانی کر رہی تھی اور بیرونی جاسوس بھی نظر رکھے ہوئے تھے اس لئے اکثریت کی رائے ان مجلسوں کو مخفی رکھنے کی تھی.

علمی وابستگی اور خدمت قرآن حکیم

صدر اعظم محمد ہاشم کی خواہش تھی کہ تفسیر مولانا شبیر احمد عثمانی، جو اس عصر کے مسلم علماء میں شمار ہوتے تھے، اور شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ کے ترجمہ قرآن کو اردو سے فارسی اور پشتو میں ترجمہ کر کے کابل سے شائع کیا جائے. فارسی ترجمہ کی عبارات کی نگرانی اور نظر ثانی کے لئے مجھے اور پشتو عبارات کی نگرانی و نظر ثانی کے لئے مرحوم مولوی برہان الدین کشلکی کو مقرر کیا گیا اور تجویز کیا گیا کہ اردو سے فارسی ترجمہ کی عبارتی مطابقت کی نگرانی مرحوم مولانا منصور انصاری کریں گے. اس سلسلہ میں ہمکاری کے لئے مولوی عبدالحی پنجشیری، ملک الشعرا بیتاب اور مرحوم مولوی غلام نبی کاموی کو، اور اوائل کار میں مولوی محمد قاسم بدخشی کو مقرر کیا گیا.

میری زندگی کی بہترین گھڑیاں وہی تھیں جب میں حضرت قرآن حکیم کی خدمت میں سرگرم تھا.

ایک سال میں قرآن مبین کے آخری پارہ عم کے پہلے نصف کا ترجمہ و تطبیق کا کام مکمل ہوا اور اشاعت پزیر ہو گیا. ڈیڑھ سال گزرا تھا کہ علاقہ کنڑ میں شورش شروع ہو گئی اور جب سورہ النحل تک کی تفسیر کے ترجمہ اور طباعت کا انتظام ہوا تو مجھے اس شورش میں اشتراک کے الزام میں کنڑ کے بے گناہ لوگوں کے ساتھ زنداں میں ڈال دیا گیا.

مقامِ علمی و تبحر

مولانا منصور اصل اردو سے خود ان کے ترجمہ کی عبارت پر مبنی میری تحریر کی مطابقت اصل اردو عبارت سے کرتے تھے اور اسی طرح تفسیر کے ترجمہ پر مولوی عبدالحی مرحوم کی عبارت کو بھی اصل اردو سے ہم آہنگ کرتے تھے اور میں ان تحریروں کو زبان دری کی بلاغت سے آراستہ کرتا تھا. پھر علماء میری تحریر کو از سرنو پڑھتے، اس پر بحث کرتے اور میں جہاں ترتیب کلمات میں زبان دری کے قواعد کی رعایت کرتا تھا اس سے انکار کرتے تھے، مگر مولانا منصور انصاری دلائل سے میری حمایت اور پشتیبانی کرتے تھے. آخر کار طے پایا کہ لسانی احتیاط کا تقاضا ہے کہ خط کشیدہ جملوں کا تحت اللفظ فارسی ترجمہ کیا جائے جیسا کہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کی روایت ہے. بحث کبھی کبھی نزاع لفظی بن جاتی تھی. ایسے مواقع پر مولانا کے پایۂ تبحر اور بلندیٔ علمی آفتاب کی مانند روشن ہوتی اور مولانا عبدالحی کہ اپنے وقت کے بزرگ علماء میں شمار ہوتے تھے مولانا منصور انصاری کے گنجینۂ معلومات اور فیض دانش کے ذخیرہ کی تحسین فرماتے تھے. برصغیر میں مولانا عبدالحی نام کے ایک بزرگ اسلامی عالم ہوئے تھے. ان کی نسبت سے انہیں عبدالحی ثانی کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا.

جناب مولانا منصور انصاری کو وحدت اسلامی اور مسلم ممالک کی آزادی سے عشق تھا اور تمام عمر اسی راہ پر مردانہ وار چلتے رہے. احکام قرآنی کی اساس پر حکومت اعلائے الٰہی کی تشکیل ان کا مقصود تھی. صدہا شاگردان کے دامن فیض سے تربیت پا کر نکلے. وہ مسلمانان عالم میں استبدادی نظاموں اور مسلم ممالک کے حکمرانوں کے پھیلائے ہوئے فساد کو بڑے استعماری ملکوں کی تخریب کاری سے کمتر نہیں گردانتے تھے. اسی لئے ریاست کے بڑے عہدے انہیں پیش کئے جاتے مگر وہ نرمی سے انکار کر دیتے تھے اور تفسیر قرآن کریم کے اجزا کی تالیف اپنی جیب سے کرتے تھے اور ان کے لبوں پر ہمیشہ تاسیس حکومت الٰہی کے دلائل رہتے تھے. افغانستان کے مسلمان انہیں صدر اسلام کے مجاہد علماء کے مکارم اخلاق کا نمونہ

تصور کرتے تھے کہ جو بھی ان کی خدمت میں حاضر ہوتا انہیں پدر روحانی اور اجتماعیات کا آموزگار، حقیقی مجاہد اور اسلامی سیاست کا مدار سمجھتا تھا.

اے کاش وہ دن جلد آئے جب ان کے گراں بہا آثار زیور طبع سے آراستہ ہوں اور فرزندان توحید اس قیمتی خزانہ اور اعلیٰ ذخیرہ سے استفادہ کر سکیں. ان شاء اللہ تعالیٰ.

مولانا منصور انصاری کے جو رسائل اور کتابیں زبان دری میں مجھے دستیاب ہوئیں میری یادداشت کے مطابق ان کے عنوانات حسب ذیل ہیں:

(۱) حکومت الٰہی یا دستور اساسی امامت امت

(۲) انواع الدول و حریت الملل

(۳) تفسیر مجمل سورۂ الفاتحہ

(۴) تفسیر دو رکوع سورہ البقرہ یا فرمان تقریری حضرت خاتم النبیین (صلی اللہ علیہ وسلم)

(۵) آیا اسلام مسلک است

(۶) ملوکیت و قرآن عظیم

(۷) جمع و تدوین قرآن عظیم

(۸) ضرورت ترجمہ یا احتیاج انسان بہ قرآن عظیم الشان

(۹) خلافت الٰہیہ و قرآن عظیم

(۱۰) تفسیر مفصل سورۃ الفاتحہ

(۱۱) فلسفہ خودی و بے خودی یا ضرورت سلطنت

(۱۲) حقوق الکفار

(۱۳) اساس انقلاب یا فلسفۂ نماز

وغیرہ

ان کے گنجینۂ معرفت وحکمت کی اور چنداور کتب ورسائل اور مقالات دیگران کے فرزند بزرگوار مولوی قاری حمید انصاری کے پاس تھے اور ہیں.

وآخردعوانا ان الحمدللہ رب العالمین

خلیلی آوارہ

تعارفی مقالہ/ضرورت ترجمہ یا احتیاج بہ قرآن عظیم الشان. کابل نشر ثانی ۱۳۹٦ھ ش (محرم الحرام ۱۴۳۹ھ/اکتوبر ۲۰۱۷)

فارسی مقالہ کا اردو ترجمہ

☆

بندہ حالت عین ناتجربہ کاری میں وطن سے آوارہ ہوا. دنیا کے ایک حصہ میں رنگا رنگ حالتوں میں پھرا. عزتیں دیکھیں. ذلتیں اٹھائیں. بیابانوں، پہاڑوں کی پیادہ منزلیں کاٹیں. ریگستانوں کو گھوڑوں کے پیروں سے روندا. اچھے، بڑے، چھوٹے بڑے لوگوں کو دیکھا. مسلمانوں کی بڑی چھوٹی دور ونزدیک قوموں کا ان کے اندر رہ کر تجربہ کیا. ملکوں کے انقلاب عروج وزوال اپنی آنکھوں سے دیکھے. بلند آہنگ دعوے سنے اور پھر مدعیوں میں رہ کر ان کے دعووں کو پرکھا. علے الخصوص اس قوم کو جو عالم اسلام کی مرکز المراکز ہے جا کر دیکھا نہ صرف جا کر دیکھا بلکہ مدتوں اس کے اندر ایک اس کے ذاتی فرد کی حیثیت سے گھس کر دیکھا اور اس قدر زریں تجربات کے مواقع عطا ہوئے کہ کسی دوسرے کو نصیب نہیں ہوئے. ماسکو سفارت فوق العادہ افغانستان میں ایک معتمد کی حیثیت سے پہنچا. انقرہ میں بھی رسمی عضو سفارت تھا بلکہ ایک ماہ سے زائد وکیل سفیر رہا. وہاں کی پارٹیوں میں اس کے اعضا کی طرح مقبول رہا. بخارا، تاشقند، فرغانہ، باشقر و ترکستان سے تعلق رہا. آج رئیس بخارا اور ترکستان کے سرگرم خفیہ کارکن اس آوارہ کے شخصی دوستوں میں سے ہیں. قفقاز (آذربیجان اور داغستان) کے غیور مسلمانوں سے سابقہ رہا. اعلیٰ حضرت شیخ (احمد) السنوسی کے سے بےنظیر خادم اسلام ذات سے راز داری رہی، اور اس وقت بھی یاغستان (مہمند، باجوڑ، دیر، سوات) میں دوست رکھتا ہوں اور افغانستان میں بھی یہاں کی پارٹیاں بفضلہٖ عزت واعتماد کی نظر سے دیکھتی ہیں. اس تمام افضال خداوندی کے باوجود

چونکہ بےسُر ہوں عالم اسلام کی خدمت کے ہاتھ پاؤں نہیں رکھتا

انا لله وانا اليه راجعون، اِنَّمَا اَشكُوا بَثّيِ وَحُزنى اِلٰى اللّٰهِ.

ہندستانی رہنماؤں کے نام ایک مکتوب عام سے اقتباس

زندگی نامہ

آج کی انسانیت انس اور انسانیت سے عاری ہے. متمدن قومیں تک بھی بدترین درندوں سے زیادہ وحشی اور ہلاکت کے چوٹی کے دیوتا ہیں. تمام متمدن اقوام اپنی پوری دماغی اور جسمانی، مالی اور فنی قوتوں کو اس ایک شرمناک مقصد اور وحشیانہ ہدف نظر پر وقف کئے ہوئے ہیں کہ دنیا، اس کے اہالی، اس کی آبادی اور سرسبزی کو جلد سے جلد تباہ و برباد کرنے کی کیا صورت ہے. . . میرے دردبھرے دل نے مجھے آمادہ کیا کہ اس انتہائی نکبت وزوال بشری کے ازالہ کی تدبیر سوچی جائے. دل کی آواز سے متنبہ ہوکر گہری سوچ کے بعد نظر آیا کہ اس بے سابقہ بربریت کی یگانہ علت قومیت پرستی کے فتنہ انگیز فلسفہ کی حاکمیت ہے. اس کے بعد میرے قلب پر وارد کیا گیا کہ اس عالم تباہ زہر کا تریاق صرف وصرف حکمت حکومتی قرآنی کی تدوین اور اس کی تبلیغ میں ہے.

باب عالم اسلام/ ترک سیاست کا تجزیہ سے اقتباس

سرِ داستاں

مولانا محمد میاں عرف منصور انصاریؒ کی داستانِ عجیب کے یہ چند منتشر ابواب ہیں. ان کی مختصر سوانح یہ ہے کہ یورپی استعمار سے اپنے وطن اور عالم اسلام کی آزادی کا خواب لے کر گھر سے نکلنے والے اس ابدی مہاجر کے خواب حادثات کی چٹانوں پر پاش پاش ہو گئے اور وقت کے غبار میں اپنے خوابوں کے ساتھ وہ خود بھی گم ہو گئے. اس قصہ کی تفصیل ۳۰ برسوں پر پھیلی ہوئی وہ سخت آزمائشیں ہیں جن کا ذکر آئندہ صفحات میں آئے گا.

مولانا محمد میاںؒ کا نسبی تعلق انصار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قبیلہ سے تھا جو ۳۴ پشت اوپر میزبان رسول سیدنا ابی ایوب خالد ابن زید نجاری خزرجی رضی اللہ عنہ جیسے فقیہ صحابی اور مجاہد فی سبیل للہ تک پہنچتا ہے. حضرت ابی ایوب انصاریؓ کا خاندان اور قبیلہ صدیوں سے حجاز کی اس بستی کا باشندہ تھا جہاں سے دنیا میں روشنی پھیلنے والی تھی لیکن ساری عمر جہاد میں گزارنے والے انصاری مہاجر حضرت ابی ایوب کی آخری آرام گاہ وطن سے سیکڑوں میل دور یورپ کے دل استنبول میں ہے. اپنے جد امجد کی راہ کے مسافر مولانا محمد میاں منصور انصاری کی آخری آرام گاہ بھی ان کے وطن سے سیکڑوں میل دور افغانستان کے شہر جلال آباد میں ہے.

مولانا محمد میاں منصور انصاری کا وطن مغربی اتر پردیش میں واقع ضلع سہارنپور کا ایک چھوٹا سا تاریخی قصبہ انبہٹہ تھا جو اپنے نامور علماء وفضلاء ومشائخ کی نسبت کی وجہ سے انبہٹہ پیرزادگان کے نام سے جانا جاتا ہے. اس بستی کی بنیاد فیروز شاہ تغلق کے سپہ سالار سعد اللہ بیگ نے ۷۷۴ھ/ ۱۳۲۰ء میں فوجی چھاؤنی کے طور پر رکھی تھی. زرخیز آب وہوا کے

باعث کثرتِ پیداوار نے اسے خطہ کی دیگر بستیوں سے ممتاز کردیا اور 'انباٹا' کے نام سے مشہور ہوگیا جس کے معنی چمڑے کی اس مشک کے ہیں جس میں غلہ بھر کر محفوظ کیا جاتا ہے، انباٹا کا نام بعد میں بگڑ کر انبہٹہ ہوگیا.

یہ ایک اہم تہذیبی نکتہ ہے. اسلام میں علم کا حصول ہر انسان کا بنیادی حق ہے جس پر قرآن حکیم اور احادیث نبویہ میں بڑا زور دیا گیا ہے اور استاد اس کا معاوضہ طلب نہیں کرتے. یہ برہمنی اور مغربی طرز تعلیم سے بالکل مختلف طرز ہے.

قدیم ہند کے برہمنی نظام میں دھرم کا علم برہمنوں میں محدود رکھا گیا تھا، یہاں تک کہ کامگار شدر اقوام اور ان سے بھی کمتر اچھوت سمجھے جانے طبقات کے افراد کے کانوں میں ویدوں کا کوئی لفظ پڑ جائے تو ان کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ ڈالنے کا حکم تھا علم سیکھنے والے لڑکے گرو کے غلام کی مانند ہوتے تھے اور تحصیل علم کے بعد گرو کو ان سے دکشنا کے نام سے کچھ بھی بڑے سے بڑا معاضہ طلب کر سکتا تھا.

کلیسا میں پیوست مغربی طرز تعلیم میں تعلیم انسان کا حق نہیں بلکہ ایک جنس بازار ہے جسے بیچا اور خریدا جاتا ہے. اس کی ایک نفسیاتی وجہ ہے. عیسائی عقیدہ کے مطابق حضرت آدم کو جنت میں جس درخت کے قریب جانے سے روکا گیا تھا وہ علم کا درخت تھا اور اسی کا پھل کھانے کو بائبل میں نسل انسانی کے لئے دائمی گناہ عظیم قرار دیا گیا ہے. چنانچہ بائبلی دین کا تقاضا ہے کہ انسان کو ممکن حد تک علم سے بچایا جائے، البتہ مادی ضروریات زندگی کی خاطر اس کے حصول کی تجارت کی گنجائش نکال لی گئی. اسی لئے مغربی مما لک میں بھی اور تعلیم کے میدان میں مغربی طرز کی نقل کرنے والے ملکوں میں بھی سکول، کالج اور یونیورسٹیاں قیمت لے کر تعلیم فروخت کرنے کے ادارے ہیں. یہ تعلیم صرف مادی ہوتی ہے.

ان قدیم نظاموں کے برعکس حصول علم ہر فرد مسلم پر فرض ہے اور اسی لئے ان کا معاشرہ یہ سہولت مہیا کرنے کا پابند ہے. استاذ بلا معاوضہ اپنا علم منتقل کرتا ہے. ماضی میں

ہندستان کے مسلم حکمراں اہل علم کو کئی کئی دیہات پر مشتمل زرعی زمینیں بطور ہدیہ دے دیتے تھے جن کی آمدنی سے نہ صرف ان اہل علم کے خاندان پلتے تھے بلکہ ان کے پاس آ کر پڑھنے والے طلبہ کے جملہ اخراجات اور اس مقصد کے لئے قائم مکاتب اور مدارس کے انتظامی اخراجات پورے ہوتے تھے اور طلبہ پر حصول علم کا ادنی بوجھ بھی نہیں پڑتا تھا.

انبہٹہ میں پیر ہرات کی اولاد میں دوسری شاخ کے جد اعلی امام ناصر الدین جالندھری غالباً عہد التمش میں ہرات سے ہندستان آئے اور جالندھر میں سکونت اختیار کی جہاں ان کا مزار آج بھی موجود ہے. ان کی پانچویں نسل میں خواجہ شمس الدین جالندھر سے سہارنپور منتقل ہوئے اور انبہٹہ میں سکونت اختیار کی. شیخ الاسلام عبداللہ انصاری ہروی کی نسبت سے قصبہ میں ان کی اولاد شیخ زادگان کے عرف سے جانی گئی.

انصاریان انبہٹہ کی ان دونوں شاخوں میں ممتاز علماء دین اور ارباب طریقت متواتر پیدا ہوتے رہے ہیں جن کے علمی، روحانی اور ادبی فیوض سے ایک عالم آج تک مستفید ہو رہا ہے. ان مشہور زمانہ ہستیوں میں نمایاں ہیں خواجہ فرید الدین ہروی سہارنپوری، قاضی سالار، قاضی امن الدین، قاضی شمس الدین، شاہ قطب علی، ،مولانا انصار علی، مولانا مفتی صدیق احمد مالیر کوٹلوی، مولانا مشتاق احمد انبہٹوی، مولانا شاہ مجید علی، مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوری، مولانا پروفیسر رشید احمد سالم انصاری، مولانا مفتی شفیق احمد مالیر کوٹلوی، مولانا مفتی فاروق احمد بہاولپوری، مولانا احمد میاں انصاری انبہٹوی، وقار عظیم، اقبال عظیم، مولانا محمد الیاس انصاری صادق آبادی، مولانا محمد ادریس انصاری، مولانا محمد احمد بہاولپوری، خواجہ شمس الدین عظیمی وغیرہ.

شاہ غلام محمد کی اولاد میں ایک جید عالم دین مولانا انصار علی تھے. وہ استاذ الاساتذہ مولانا مملوک العلی صدیقی نانوتوی کے شاگرد رشید اور داماد تھے. مولانا مملوک العلی کی دوسری صاحبزادی نجیب النساء ان سے منسوب تھیں. وہ مولانا محمد یعقوب نانوتوی اور مولانا محمد

قاسدم نانوتوی کے ہم عصر اور دوست تھے. مولانا یعقوب نانوتوی کے بہنوئی تھے. یہی رشتہ مولانا محمد قاسم نانوتوی سے بھی تھا. مولانا انصار علی کے صاحبزادے علی گڑھ کالج کے اولین ناظم دینیات اور ڈین شیخ الاسلام مولانا عبداللہ انصاری تھے، ان کے فرزند مجاہد جلیل مولانا محمد میاں منصور انصاری، ان کے فرزند نامور صحافی مولانا حامد الانصاری غازیؒ اور پھر ان کے فرزند ڈاکٹر عابداللہ غازی جیسے اہل علم سے دنیا بھر میں ملکوں ملکوں علم وہدایت کا فیض پہنچا اور آج تک پہنچ رہا ہے. اس نسل کی ایک شاخ پھر افغانستان میں آباد ہے جس کا تفصیلی تذکرہ آئندہ صفحات میں آئے گا.

نسب اور خاندان

مولانا محمد میاں منصور انصاری کا نسبی قبیلہ بنوخزرج اصل میں یمن سے شمالی حجاز کے شہر یثرب میں آباد ہوا تھا. یہ قبیلہ اور برادر قبیلہ بنی اوس یمن کی سلطنت سبا کے آخری بادشاہ، تبع حارثہ ابن ثعلبہ کی اولاد میں تھا. تبع کا توصیفی ذکر قرآن حکیم میں اور احادیث نبوی میں آیا ہے.

تذکار الانصار میں محمد طارق الانصاری غازی نے مولانا محمد میاں منصور انصاری کا یہ شجرہ نسب دیا ہے جو مدینہ طیبہ میں ۳۵ پشت اوپر میزبان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوایوب خالد ابن زید انصاری رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے:

ان کے القاب مجاہد جلیل اور لواء الاسلام تھے، کنیت ابو حامد اور عرف مہاجر کابل تھا. نام محمد میاں تھا. کابل میں جلاوطنی کے زمانہ میں انہوں نے منصور انصاری کا عرفی نام اختیار کرلیا تھا، اب ان دونوں ناموں کے مرکب سے معروف ہیں.

نام ونسب تھا مولانا محمد (رابع) میاں عرف منصور انصاری انبہٹوی جلال آبادی ابن شیخ الاسلام مولانا عبداللہ (ثانی) انبہٹوی ابن مولانا خواجہ انصار علی دہلوی ابن شاہ احمد علی ابن شاہ قطب علی ابن خواجہ غلام محمد سہارنپوری انبہٹوی ابن خواجہ شرف الدین خان (ثالث) سہارنپوری ابن خواجہ غلام محی الدین ابن خواجہ عبدالرشید ابن خواجہ فضیل محمد ابن خواجہ نظام الدین ابن قاضی امن الدین (یا امین الدین) عرف قاضی امّن ابن خواجہ فریدالدین ہروی سہارنپوری ابن خواجہ محمد فاضل ابن خواجہ ہاشم (ثانی) ابن خواجہ علاء الدین ابن خواجہ رکن الدین (ثانی) ابن خواجہ نجم الدین ابن خواجہ شرف الدین (ثانی) ابن خواجہ عبدالحمید ابن خواجہ کبیر الدین ابن خواجہ رکن الدین (اول)

ابن خواجہ شرف الدین (اول) ابن خواجہ تاج الدین ابن خواجہ منہاج الدین ابن خواجہ ہاشم (اول) بزرگ ابن شیخ الاسلام پیر ہرات خواجہ عبداللہ انصاری (اول) ہروی ابن خواجہ ابوالمنصور محمد (ثالث) بلخی ابن ابو معاذ علی (ثانی) ابن ابوعاصم محمد (ثانی) ابن احمد الہروی العبادی ابن علی (اول) ابن جعفر ابن ابوالمنصور محمد (اول) عرف منصورمت مدنی الہروی ابن صحابی و میزبان رسولؐ سیدنا حضرت ابو ایوب خالدالانصاری رضی اللہ عنہ مدنی استنبولی ابن زیدنجاری خزرجی یثربی.

مولانا محمد میاں منصور انصاری حضرت ابوایوب کی ۳۵ ویں پشت میں تھے. (محمد طارق الانصاری غازی.تذکارالانصار.ممبئی)

مولانا محمد میاں منصور انصاری کے جد خامس خواجہ غلام محمد سہارنپور (موجودہ شمالی اترپردیش) میں رہتے تھے. ان کی شادی نواحی قصبہ انبہٹہ میں صابری چشتی سلسلہ کے بزرگ شاہ ابوالمعالی کے خاندان میں محفوظاً بی سے ہوئی اور وہ سہارنپور کا قیام ترک کر کے انبہٹہ چلے آئے.شاہ ابوالمعالی سے نسبت کی وجہ سے انبہٹہ میں خاندان کے بعض حلقوں کو اپنے سادات ہونے کا گمان ہوا.لیکن مولانا عبداللہ انصاری انبہٹوی نے اپنے ماہر انساب دوست مولانا مشتاق احمد انبہٹوی کو اس امر کی تحقیق پر متوجہ کیا جس کے نتیجہ میں اس خاندان کی انصاری نسبت کا احیاء ہوا.تاہم خاندان کا ایک حصہ اب تک سادات سے نسبت پر قایم ہے.ان کے ناموں میں عام طور سے شاہ یا عظیم کا لقب استعمال ہوتا ہے.اس شاخ کے شاہ عابد اور ڈاکٹر شاہ شاہد انبہٹہ کے عمائدین میں ہیں.انبہٹہ میں مسعود عظیم ممتاز ہیں اور پاکستان میں ادیب، نقاد و صحافی وقار عظیم پاکستان کے سرکاری ماہنامہ ماہ نو کے پہلے مدیر تھے، اور نعت گو شاعر اقبال عظیم خاندان کی اس شاخ میں ممتاز افراد ہوئے ہیں.سید اقبال احمد عظیم کے والد سید مقبول عظیم عرش انبہٹوی بھی شاعر تھے.

مولانا محمد میاں منصور انصاری کے دادا مولانا انصار علی گوالیار کے راجہ سندھیا کی

ریاست گوالیار کے دیوان اور صدر الصدور تھے. بطور صدر الصدور وہ ان بزرگوں میں شامل تھے جنہوں نے انگریزوں کے خلاف جہاد کے علماء ہند کے اس فتوے پر تائیدی دستخط کئے تھے جو بہادر شاہ ظفر نے تیار کرایا تھا.

> ان کا تعلق علماء حق کے اس خصوصی زمرہ سے تھا جسے شاہ ولی اللہ دہلوی کی تحریک کے ماتحت ملک کی ہزار سالہ اسلامی تہذیب، تمدن، ثقافت، روایات اور علوم کے تحفظ کے لئے منتخب کیا گیا تھا اور جس کے اراکین ہندستان کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی رجواڑہ ریاستوں میں اعلی انتظامی عہدوں پر پہنچ کر نہ صرف امن و انصاف کا تیقن پیدا کر رہے تھے بلکہ حکمرانوں کو بھی راہ راست پر رکھنے اور ان میں جذبہ حریت کو زندہ رکھنے کا فریضہ انجام دے رہے تھے.

محمد طارق الانصاری غازی. **تذکار الانصار** (ممبئی ۲۰۱۸) ۲۸۶.

مولانا انصار علی کے ایک بھتیجے مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوری ابن شاہ مجید علی شریعت و طریقت کے امام تھے. وہ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلوی کے استاد اور پیر و مرشد تھے. علم حدیث میں ان کی یگانۂ روزگار تالیف **بذل المجھود فی شرح سنن ابی داؤد** کو عالمگیر شہرت حاصل ہے. ہند اور بیرون ہند سے اس کتاب کے لاتعداد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں. مصر، سودان، عراق، شام، یمن اور سعودی مملکت کی یونیورسٹیوں کے نصاب میں داخل ہے.

شاہ مجید علی کے ایک اور ذی علم صاحب زادہ مولانا رشید احمد سالم انصاری تھے جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اور بعد میں جامعہ ملیہ اسلامیہ میں فارسی کے پروفیسر تھے. فارسی ادبیات و علوم پر ان کی تحقیقات کا پایہ نہایت بلند مانا جاتا ہے. مولانا سید سلیمان ندوی ان کی علمیت کے بڑے مداح تھے. مولانا انصار علی کے تیسرے بھائی حبیب محمد کے صاحبزادے مولانا مفتی صدیق احمد مفتی اعظم ریاست مالیرکوٹلہ تھے جنہوں نے فتویٰ نویسی میں نیک

نامی کی مثال قائم کی۔انہی کی صاحبزادی حفصہ خاتون سے مولانا محمد میاں کی پہلی شادی ہوئی تھی۔مولانا مفتی صدیق احمد اپنے علمی کاموں اور عالمانہ مشاغل کی بنا پر ہفت اقسام کہلاتے تھے۔ان کے فتاویٰ پر مشتمل دو کتابیں منظر عام پر آئیں۔مسیح الملک حکیم اجمل خاں ان کے شاگردوں میں تھے۔

مولانا محمد میاں منصور انصاری کے والد ماجد شیخ الاسلام مولانا عبداللہ انصاری ۱۲۶۷ھ/۱۸۵۲ میں انبہٹہ میں پیدا ہوئے تھے۔ابتدائی تعلیم والد محترم اور مولانا سخاوت علی سہارنپوری سے حاصل کی۔بعد میں مولانا محمد یعقوب نانوتوی سے شرفِ تلمذ حاصل ہوا اور ۱۲۸۵ھ میں دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا۔مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے ارشد تلامذہ میں شمار ہوئے۔مدرسہ دیوبند سے ۱۲۸۷ھ میں فارغ ہوئے (نورالحسن راشد کاندھلوی. مرج البحرین [۲۰۱۸ء]۶۴-۶۵)۔علاوہ ازیں بطور خاص مولانا احمد علی سہارنپوریؒ کی خدمت میں رہ کر اجازت حدیث حاصل کی۔امام طریقت حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے بیعت ہوئے اوران سے خلافت کا اعزاز بھی عطا ہوا۔بہ سلسلۂ تدریس مدرسہ منبع العلوم گلاؤٹھی ضلع بلند شہر سے عرصۂ دراز تک وابستہ رہے اس کے بعد کچھ عرصہ کے لیے تھانہ بھون آگئے اور وہاں آکر ایک مدرسہ تعمیر کیا اس درمیان مولانا عبداللہ انصاری کی علمی شہرت دور دور تک جا پہنچی تھی۔

علی گڑھ کالج کے قیام کے بعد اس کے شعبہ دینیات کے لئے سرسید احمد خاں ایک ایسی شخصیت کی تلاش میں تھے جو علم وتقویٰ اور فضل وکمال میں اپنی مثال آپ ہو اور دین دار مسلم عوام میں کالج کو اسلامی اعتبار سے قابل قبول بنا سکے۔منشی محمد سعید تھانوی ناظم شعبۂ تبلیغ محمڈن اورینٹل کالج کے ذریعہ سرسید سے ان کا تعارف اور خط کتابت ہوئی۔مولانا عبداللہ انصاریؒ ۱۸۹۴ء میں علی گڑھ آئے اور کالج علی گڑھ کے پہلے ناظم دینیات اور ڈین مقرر ہوئے اور تحریک دیوبند اور تحریک علی گڑھ کے مابین رابطے کی کڑی بن گئے۔(نورالحسن راشد کاندھلوی. مرج البحرین)۔

مولانا عبد اللہ انصاری کی شادی مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی صاحبزادی اکرام النساءعرف بی بی اکراماً سے ہوئی جن سے تین صاحبزادے محمد میاں (منصور انصاری) احمد میاں انصاری، عبدالرحمٰن انصاری اور تین بیٹیاں امت السلام، امت الرحمٰن اور ام کلثوم ہوئیں۔ پسری اور دختری سلسلۂ اولاد ہند، پاکستان، افغانستان، جرمنی، کینڈا، امریکہ، برطانیہ کے مختلف شہروں میں پھیلا ہوا ہے اور تمام خاندان اعلیٰ تعلیم سے مزین ہے۔ مولانا عبد اللہ انصاریؒ کا انتقال ۱۳۴۴ھ/ ۱۹۲۵ میں انبہٹہ ضلع سہارنپور میں ہوا۔ وہیں خاندانی قبرستان میں آرام فرما ہیں۔

مولانا عبد اللہ انصاریؒ کے فرزند رشید لواء الاسلام مجاہد جلیل بطلِ حریت ریشمی رومال تحریک کے ہیرو مولانا محمد میاں منصور انصاری نہ صرف انصاریان سہارنپور بلکہ خاندان قاسمی، علماء دیوبند اور ملتِ اسلامیہ ہند کے لئے باعث فخار اور ہندستان کے لیے وجہ عزووقار ہوئے۔

بچپن اور جوانی

مولانا محمد میاں انصاریؒ کی پیدائش ان کی خودنوشت غیر مطبوعہ تحریری یادداشت کے بموجب ۲۱ رمضان المبارک ۱۲۹۹ھ/ ۶ اگست ۱۸۸۲ شب جمعہ میں انبہٹہ میں ہوئی. تاریخی نام چراغ الدین تھا جس سے سن پیدائش ۱۲۹۹ ھ کی تخریج ہوتی ہے. اصل نام محمد میاں تھا. ہجرت وطن کے بعد سیاسی مصلحت کی بنا پر منصور انصاری کے نام سے عالمی طور پر متعارف ہوئے. افغانستان میں عموماً مولانا صاحب کے عرف سے مشہور تھے.

ابتدائی تعلیم وتربیت

محمد میاں کی پیدائش کے وقت ان کے والد مولانا عبداللہ انصاری مدرسہ منبع العلوم گلاؤٹھی ضلع بلندشہر میں برسرکار تھے. ان کی والدہ انبہٹہ میں مقیم تھیں اس لیے انہوں نے آغوشِ مادر میں انبہٹہ میں خاندان کے علمی اور روحانی ماحول میں تربیت پائی. چھ سال کی عمر ہوئی تو مولانا عبداللہ انصاری انہیں اپنے پاس گلاؤٹھی لے گئے. قرآن پاک کی تکمیل اور ابتدائی عربی کتب گلاؤٹھی میں والدِ محترم سے پڑھیں.

والدہ محترمہ کا انتقال

محمد میاں ابھی نو سال کے تھے کہ رمضان ۱۳۰۸ھ/ مئی ۱۸۹۱ میں ان کے والد اہل وعیال کے ساتھ سفر حج کے لیے روانہ ہوئے. شوال کے پہلے عشرہ میں جدہ پہنچ کر محمد میاں کی والدہ اکرام النسا بنت مولانا محمد قاسم نانوتوی بیمار ہوگئیں اور اسی بیماری میں حج سے پہلے ہی ان کا انتقال ہوگیا. حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کی خصوصی توجہات کے سبب مکہ مکرمہ میں ام المومنین حضرت خدیجہ صدیقہؓ کے پہلو میں دفن ہوئیں.

والدہ کے انتقال کے بعد مولانا محمد میاں کی تربیت کی ذمہ داری ان کی نانی یعنی مولانا قاسم نانوتوی کی اہلیہ کے کاندھوں پر آ گئی. کچھ دنوں بعد ان کا سایہ بھی سر سے اٹھ گیا تو اپنی خالہ، مولانا محمد قاسم نانوتوی کی دوسری صاحبزادی رقیہ کی کفالت میں آ گئے، یوں ان کا بچپن انبہٹہ، گلاؤٹھی، دیوبند وغیرہ میں گذرا.

دارالعلوم دیوبند میں داخلہ

دیوبند پہنچ کر دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا اور شیخ الہند مولانا محمود الحسن اور اپنے ماموں مہتمم دارالعلوم دیوبند مولانا حافظ محمد احمد سے علوم دینیہ کی تحصیل کی قرآن وحدیث اور فقہ وتفسیر کا بغور مطالعہ کیا. حافظ محمد احمد سے مشکوٰۃ شریف کا باب جہاد پڑھا جس نے ان کی طبیعت میں انقلابی جولانی پیدا کی. دارالعلوم دیوبند سے ۱۳۲۱ھ/ ۱۹۰۳ میں سے فراغت حاصل کی. شیخ الہند انھیں اپنے مایۂ ناز شاگردوں میں شمار کرتے تھے

تعلیم سے فراغت کے بعد مولانا حافظ محمد احمد نے مولانا محمد میاں کو مدرسہ عربیہ نگینہ ضلع بجنور میں مدرس کے عہدے پر بھیج دیا. مدرسہ عربیہ نگینہ میں شایانِ شان پذیرائی ہوئی اور قاضی اور مفتی خاندان کے بزرگوں نے ان کا اعزاز واکرام کیا. سوء اتفاق اسی عرصہ میں نگینہ میں طاعون کی وبا پھوٹ پڑی. قصبہ میں افراتفری کا عالم تھا. لوگ دوسری بستیوں کا رخ کرنے لگے تھے لیکن مولانا محمد میاں نے وبا سے متاثرہ بستی کو نہ چھوڑا اور آبادی کی خدمت میں مصروف رہے. اللہ نے انہیں وبا سے محفوظ و مامون رکھا، مگر اس قدرتی آفت سے مدرسہ خالی ہو چکا تھا. وہاں کے حالات بکھر چکے تھے. وبا کا زور تھا تو مجبوراً نگینہ کو خیر باد کہہ کر مینڈھو ضلع علی گڑھ آ گئے.

مدرسہ معینیہ اجمیر میں

کچھ عرصہ بعد مولانا معین الدین اجمیری کی ایماء پر مولانا محمد میاں انصاری اجمیر تشریف لے گئے جہاں مدرسہ معینیہ میں استاذ حدیث کے فرائض انجام دیئے. وہ مدرسہ

حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ کی درگاہ شریف میں قائم تھا.

انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں شیخ الہند کی انقلابی تحریک کے مرکز جگہ جگہ قائم ہو رہے تھے. ان میں ایک مرکز اجمیر تھا جہاں تحریک آزادی کے لیے جوانوں کو تلوار، بلم، اور لاٹھی چلانا سکھایا جاتا تھا. مولانا محمد میاں نے خود بھی ان ہتھیاروں کا استعمال سیکھا اور دوسرے جوانوں کو بھی مشق کراتے تھے جن میں ہندو اور سکھ بھی شریک ہوتے تھے. جب تحریک کو عملاً برپا کرنے کا مرحلہ آیا تو شیخ الہند نے مولانا محمد میاں کو دیوبند طلب کیا اور سفر حج پر چلنے کا اشارہ دیا جہاں سلطنت عثمانیہ کے رہنماؤں سے مذاکرات کرنے تھے.

جمعیۃ الانصار

شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندیؒ کو اللہ تعالیٰ نے جہاں بے پناہ سیاسی و علمی صلاحیتوں سے نوازا تھا وہیں ان پر یہ فضل بھی کیا تھا کہ شاگردوں کی ایک جماعت اشارۂ چشم پر سرفروشی کے لیے تیار رہتی تھی. ان کے شاگردوں میں ہر شخص اپنی نظیر آپ تھا. علم و فضل کے میدان میں محدثِ عصر علامہ انور شاہ کشمیریؒ، فقیہ دوراں مولانا اشرف علی تھانوی، شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ ان کے دست و بازو تھے تو میدان حرب وضرب میں مولانا عبید اللہ سندھی، لواء الاسلام مولانا محمد میاں منصور انصاری، مولانا عزیر گل، مولانا عبدالرحیم پوپلزئی اور حاجی فضل وحید ترنگ زئی جیسے جاں نثار وابستگان ان کے سیاسی خاکوں میں رنگ سازی کے لیے مصروفِ کار تھے. جب شیخ الہند ۱۹۰۵ میں دارالعلوم دیوبند کے سرپرست بنے تو انہیں یہ خیال آیا کہ درسگاہ دیوبند اور دانش گاہ علی گڑھ کے فکری فاصلہ کو دور نہ کیا گیا تو یہ ملت کے لیے مسائل پیدا کرے گا، اور آزادی کے حصول میں رکاوٹ بنے گا. چنانچہ چار سال کے غور وخوض کے بعد انہوں نے جمعیۃ الانصار کے نام سے ایک ہندستان گیر نظام کا خاکہ مرتب کیا.

جمعیۃ الانصار کا مقصد مذہبی و مادی علوم کی خلیج پاٹنا تھا اور عوام کو بیدار کرنا تھا مولانا عبیداللہ سندھی اور مولانا محمد میاں منصور انصاری کو اس جمعیۃ کا ناظم اور نائب ناظم مقرر کیا گیا. اس تنظیم کا ایک مقصد علی گڑھ کالج کے طلباء کے لئے دینی علوم کی تحصیل کی خاطر دارالعلوم دیوبند کے دروازے کھولنا تھا اور دیوبند کے طلباء کی انگریزی اور مادی تعلیم کے لئے علی گڑھ میں سہولیات مہیا کرنا تھا علی گڑھ میں مولانا محمد میاں منصور انصاری کے والد مولانا عبداللہ انصاری اس کام میں معاونت کررہے تھے.

جمعیۃ الانصار اس زمانے کے طلباء کی ہی نہیں بلکہ علماء اور دانشوروں کی مقبول جماعت تصور کی جانے لگی تھی. اس کا دائرۂ کار اور حلقۂ اثر دونوں ہی بڑھتے رہے، یہاں تک کہ اس تنظیم کے زیر اہتمام ۱۹۱۰ میں سرزمین دیوبند پر دارالعلوم کے فارغ التحصیل طلباء کی دستار بندی کا اجلاس منعقد ہوا جس میں تیس ہزار سے زیادہ علماء، نیز عوام وخواص نے شرکت کی. دیوبند جیسے ایک چھوٹے سے قصبہ میں اتنا بڑا اجتماع ایک اہم کامیابی تھی. اس اجتماع میں ہر طبقۂ فکر کے افراد شریک تھے. اس میں دیوبند و علی گڑھ کی ذہنی وفکری دوری کو ختم کرنے کی شیخ الہند کی تجویز بھی منظور ہوئی.

بظاہر یہ دستار بندی کا خصوصی اجلاس تھا لیکن اس سے شیخ الہند اور ان کے رفقاء کو یہ اندازہ لگانا مقصود تھا کہ کسی انقلابی تحریک کے لئے فضا کتنی سازگار ہے. اس طرح جمعیۃ الانصار صرف مذہبی یا علمی پلیٹ فارم ہی ثابت نہیں ہوا بلکہ آئندہ کے سیاسی حالات کے لیے مقدمۃ الجیش بھی ثابت ہوئی.

جمعیۃ الانصار کے اس اجتماع نے مسلمانوں کو ایک نیا حوصلہ اور جوش دیا. اس نے ایک نئی سیاسی فکر کو جنم دیا. انہوں نے نہ صرف ملی اتحاد بلکہ ہندوستان میں رہنے والی دوسری اقوام کو بھی اپنا ہم نوا بنانے کے لیے متحدہ کوششیں شروع کیں. یہ مساعی جنوبی ایشیا کو بیرونی طاقتوں سے نجات دلانے کی غرض سے کی جارہی تھیں. ان بزرگوں کی شبانہ روز جدجہد کے

باعث انڈین نیشنل کانگریس کے ایوانوں میں ملک کی آزادی ایک مقصد کے طور پر متعارف ہوئی اور جنگ آزادی مل جل کرلڑی گئی.

اسی جدوجہد کے ذیل میں ۱۹۱۹ میں جمعیۃ علماء ہند قائم ہوئی جس کا پہلا اجلاس دسمبر ۱۹۱۹ میں امرتسر میں اور دوسرا اجلاس ۱۹۲۰ میں دہلی میں منعقد ہوا.

مولانا حامد الانصاری غازی کی ذاتی ڈائری سے معلوم ہوتا ہے کہ اس اثناء میں مولانا محمد میاں انصاری کا حلقہ وسیع تر ہوتا گیا. بہت سے حضرات ان کے پاس آتے تھے جن میں سے بیشتر وہ ہوتے تھے جنہیں شیخ الہند کی طرف سے آپ کے پاس پیغام رسانی کے لیے بھیجا جاتا. وہ ان لوگوں سے گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر گھنٹوں گفتگو کرتے. یہ شیخ الہند کی تحریک کے ابتدائی خدو خال تھے جن میں مولانا انصاری اجمیر میں بیٹھ کر رنگ سازی کر رہے تھے. اسی زمانہ میں ان کا تعلق ڈاکٹر مختار انصاری اور حکیم محمد اجمل خاں اور دوسرے مجاہدین آزادی نیز انڈین نیشنل کانگریس کے سرکردہ افراد سے ہوا اور وہ تحریک آزادی کے لیڈروں کے رابطے میں آ گئے.

بیعت وارادت

مولانا محمد میاں اپنے وقت کے مشہور بزرگ مولانا عبدالرحیم رائے پوریؒ سے بیعت تھے. مولانا رائے پوری تحریک ریشمی رومال میں شیخ الہند کے معتمد دوست اور مشیر تھے. مصلحت کی بنا پر وہ سامنے نہیں آئے لیکن پوری تحریک میں وہ معاون رہے. شیخ الہند نے جب حجاز کا سفر کیا تو اہم امور میں انھیں اپنا قائم مقام بنایا تھا، کارکنوں کو ہدایت تھی کہ ان کے مشورے کے بغیر کوئی قدم نہ اٹھائیں. مولانا محمد میاں انصاری فرماتے تھے کہ ''حضرت شیخ الہند انقلابی اقدام کے لیے مولانا رائے پوریؒ کی رائے کو قول فیصل مانتے تھے''.

مولانا غازی کی ذاتی ڈائری کے اقتباسات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مولانا محمد میاں فرماتے تھے

شیخ الہند نے مجھے تین مرتبہ رائے پور بھیجا.حضرت رائے پوری تین سال تک یہی فرماتے رہے کہ انقلابی اقدام کا مناسب وقت نہیں آیا جب چوتھی مرتبہ میں نے انہیں منصوبہ کی تفصیلات سے آگاہ کیا تو انہوں نے منظوری دے دی اور فرمایا اب شرح صدر ہو گیا ہے.

مولانا محمد میاں قیام اجمیر کے درمیان ہر سال اجمیر سے دیوبند، دہلی اور رائے پور جاتے تھے.ان جگہوں سے بھی غیر مشہور اور غیر سیاسی افراد مولانا انصاری کی خدمت میں آتے رہتے جن سے راز دارانہ باتیں ہوتیں اور جدوجہد کے لئے مشورے ہوتے.

شیخ الہندؒ کو مولانا عبدالرحیم رائے پوریؒ سے جو مشورے خفیہ طور پر درکار ہوتے تھے ان کے لیے وہ مولانا محمد میاں ہی کو بھیجتے تھے کیونکہ ان کی زندگی مکمل راز دارانہ تھی.اس عظیم انقلابی تحریک کے لئے ایسے ہی شخص کی ضرورت تھی جو مقاصد کے حصول کے لئے نام ونمود دولت وشہرت سے کوئی غرض نہ رکھے.وہ اپنے کو شہرت سے بہت دور رکھتے تھے.یہی وجہ ہے کہ تحریک شیخ الہند میں ان کی خدمات کا وہ اعتراف نہ ہو سکا جس کے وہ مستحق تھے.

جب مولانا عبدالرحیم رائے پوریؒ سے تحریک کو عملی جامہ پہنانے کی اجازت مل گئی اور شیخ الہند نے اس کی تیاریاں مکمل کر لیں تو مولانا عبیداللہ سندھی کو انقلابی مقاصد کے لئے مناسب وقت پر افغانستان پہنچنے کی ہدایت کی اور مولانا محمد میاں کو سفر حجاز میں اپنے خصوصی مشیر کی حیثیت سے اپنے ساتھ رکھا.اس سفر حجاز کا مقصد حج کے مقدس فریضہ کی بجا آوری کے ساتھ ترک رہنماؤں کے تعاون سے ملک میں انقلاب برپا کرنا تھا.

اس سفر حج کا تذکرہ تحریک ریشمی رومال کے ضمن میں تفصیل سے آئے گا.سفرِ حجاز نے ان کی زندگی کا دھارا ہندستان سے حجاز وافغانستان منتقل کر دیا اور ان کی شخصیت اہل ہند کی نظروں سے اوجھل ہو گئی.برسوں ان کے اہل خاندان کو پتہ نہ چلا کہ وہ کہاں ہیں.کئی بار یہ افواہیں سننے میں آتی تھیں کہ وہ قید فرنگ میں ہیں یا جام شہادت نوش کر چکے ہیں.

عائلی زندگی

وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ مولانا محمد میاں انصاری کی پہلی شادی کب ہوئی تاہم اندازہ ہے کہ زمانہ طالبعلمی میں یا دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہونے کے فوراً بعد ۱۹۰۳ کے اواخر ۱۹۰۴ کے اوائل میں ہوگئی تھی. دارالعلوم دیوبند سے فراغت شعبان ۱۳۲۱ھ/ نومبر ۱۹۰۳ میں ہوئی تھی. شعبان ۱۳۲۴ھ/ستمبر ۱۹۰۶ میں مولانا کے منجھلے صاحبزادے مولانا حامد الانصاری غازی کی ولادت ہوئی جن کے تاریخی نام شاہ غازی کے اعداد ۱۳۲۴ھ ہوتے ہیں. اس وقت ان کی والدہ حفصہ خاتون کی عمر ۲۴ سال تھی (ولادت ۱۸۸۲). اس سے قبل مولانا کے بڑے صاحبزادے محمود میاں کی ولادت ہو چکی تھی. محمود میاں کا زمانۂ ولادت ۱۹۰۴ کے آخر یا ۱۹۰۵ کے ابتدائی مہینوں کو مان لیا جائے تو اس حساب سے مولانا محمد میاں کی پہلی شادی ۱۹۰۳ء کے اواخر یا ۱۹۰۴ کے اوائل میں ہونا قرین قیاس ہے. یہ وہ زمانہ ہے جب وہ دارالعلوم دیوبند میں زیر تعلیم تھے.

مولانا محمد میاں کی یہ شادی ان کے والد مولانا عبداللہ انصاری کے چچازاد بھائی مولانا مفتی صدیق احمد، مفتی اعظم ریاست مالیر کوٹلہ پنجاب کی دختر حفصہ خاتون (۱۸۸۲-۱۹۴۰) سے ہوئی تھی. یہ خاتون نہایت متقی، خدا ترس، پرہیزگار، صوم وصلوٰۃ کی پابند اور ایثار وقربانی کا پیکر تھیں. ان کے ایثار کی مثال اس سے بڑھ کر کیا ہوگی کہ ایک عظیم ملی مقصد کی خاطر اپنے شوہر کو تحریک شیخ الہند میں شمولیت اور ملک سے ہجرت پر رضامندی ظاہر کی اور تاحیات فرقت وجدائی کی تکلیف گوارہ کر کے صبر وثابت قدمی کا بے مثال نمونہ پیش کیا اور شکایت کا ایک لفظ زبان سے نہیں نکالا.

حفصہ خاتون سے اولاد واحفاد

محمود میاں کم سنی میں انتقال کر گئے تھے. تعلیم کے لئے اپنے ماموں مولانا فاروق احمد بہاولپوری کے پاس بہاولپور (موجودہ پاکستان) میں مقیم تھے کہ اچانک طبیعت خراب ہوئی اور اللہ کو پیارے ہو گئے.

مولانا محمد میاں کے دوسرے صاحبزادے مولانا حامد الانصاری غازی چھ سال کے تھے اور ان کی تعلیم ابتدائی مراحل میں ہی تھی کہ تحریک حیرت کے آغاز میں مولانا محمد میاں نے اپنے خاندان کو اپنے خسر مولانا مفتی صدیق احمد مفتی اعظم مالیر کوٹلہ کے یہاں منتقل کر دیا. مولانا غازی نے قرآن کریم کی تعلیم مالیر کوٹلہ میں حاصل کی. بعد میں والدہ کے ہمراہ اپنے آبائی وطن انبہٹہ آئے اور سات سال کی عمر میں والدین کے ساتھ دیوبند آ گئے جہاں سے ان کے والد اہل وعیال سے یکسو ہو کر اول حجاز مقدس اور پھر کابل منتقل ہو گئے.

اقرا ایجوکیشن فاؤنڈیشن، ممبئی نے مولانا حامد الانصاری غازیؒ کی سوانح حیات چار جلدوں میں ذکر غازی، فکر غازی، خطبات غازی اور شعری انتخاب نوید فاراں کے عنوانات سے شائع کی ہے جس میں اس عبقری شخصیت کے افکار پر سیر حاصل تحقیق کی گئی ہے.

مولانا محمد میاں کے تیسرے صاحبزادے قاری حمید میاں نے دیوبند میں قرآن حکیم حفظ کیا اور فن قرأت پر عبور حاصل کیا. اعلی تعلیم شروع ہوئی تھی کہ والد نے اپنے پاس افغانستان بلا لیا. وہاں تعلیم کا معقول انتظام نہیں تھا اس لئے مزید باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کر سکے، مگر اپنے والد سے تحصیل علم کی. وہ ۱۹۹۰ میں عمر کے آخری دنوں میں ہندستان تشریف لائے تھے. یادداشت اور حافظہ خداداد تھا. انتہائی خوش اخلاق، بذلہ سنج تھے. ہندستان میں قیام کے دوران اپنی بھتیجی محترمہ شہناز غازی کے پاس علی گڑھ میں تقریباً ایک ماہ رہے. اس عرصہ میں انہوں نے مولانا محمد میاں منصور انصاری اور ریشمی رومال تحریک کے متعلق بہت

سی یادداشتیں تحریر کرائیں۔ان کے ہمراہ ایک بڑا سا بیگ بھی تھا جس میں مولانا منصور انصاری کے قیام افغانستان کی کئی اہم دستاویزات تھیں۔ان کے ہندستان کے قیام کے دوران کوشش کی گئی کہ وہ تمام دستاویزات اور وہ تحریریں جوانہوں نے اپنی یادداشت کی بنیاد پر محترمہ شہناز غازی سے مرتب کرائیں تھیں ہندستان میں چھوڑ دیں تا کہ تاریخ کے اس باب پر تحقیق کا حق ادا کیا جاسکے،مگر انھوں نے اسے نامنظور کیا اور وعدہ کیا کہ آئندہ جب ہندستان آئیں گے تو تحریک شیخ الہند پر ساتھ مل کر کچھ کام کریں گے۔کچھ عرصے بعد وہ واپس چلے گئے۔اگست ۱۹۹۱ میں پشاور (پاکستان) میں ان کی وفات ہوگئی اور ان کی وفات کے ساتھ ہی تاریخ کی وہ اہم یادداشتیں بھی معدوم ہوگئیں جو ان کے سینے یا بیگ میں محفوظ تھیں۔اس بیگ اور اس تحریر کا بھی کچھ پتا نہ چل سکا جو انہوں نے محترمہ شہناز غازی سے مرتب کرائی تھیں۔ یوں تاریخ آزادی ہند کے بے شمار راز ہمیشہ کے لئے مورخ کی دسترس سے دور ہو گئے۔اناللہ وانا الیہ راجعون۔

پہلی بیوی حفصہ خاتون سے مولانا محمد میاں کی ایک ہی بیٹی قدسیہ خاتون ہوئی تھیں۔چاروں بھائی بہن میں سب سے چھوٹی تھیں۔والد کی ایما پر دہلی میں حکیم اجمل خان کے طبیہ کالج میں چار سال کی تعلیم کے بعد طب کی سند اور کالج میں اول آنے پر سونے کا تمغہ حاصل کیا۔وہ نہایت ذی علم اور ادب شناس خاتون تھیں۔ان کی تحریر وتقریر انتہائی مرصع اور ادبی ہوتی تھی۔ان کی شادی خاندان ہی میں جمیل احمد صاحب سے ہوئی تھی جو سکول میں پڑھاتے تھے۔خاندان کے بہت سے افراد سے ساتھ جمیل احمد صاحب بھی کوئٹہ بلوچستان کے ایک سکول میں تدریسی عہدوں پر چلے گئے تھے۔وہاں مئی ۱۹۳۵ کے مہیب زلزلہ میں ان میں اکثر افراد خاندان شہید ہو گئے جن میں جمیل احمد صاحب بھی تھے۔قدسیہ خاتون ملبہ میں دب گئی تھیں اور دو تین دن بعد ان کو باہر نکالا جاسکا تھا۔ماحول کی دہشت، تاریکی اور تنہائی کا ان کے دماغ پر شدید اثر پڑا اور ساری زندگی ذہنی طور پر معذور رہیں۔

قدسیہ خاتون کی دوسری شادی دیوبند کے ممتاز زمیندار مشیر الزماں صدیقی سے ہوئی جو شیخ الہند کی تحریک سے وابستہ تھے. ان سے کے ایک ہی بیٹے حافظ وسیع الزماں صدیقی ہوئے. ان کی شادی ضلع مظفر نگر میں پور قاضی کی علم دوست خاتون انور جہاں سے ہوئی تھی. انور جہاں نے دیوبند میں اماں حفصہ گرلز سکول قائم کیا تھا. وسیع الزماں صدیقی قانونی موشگافیوں کے ماہر تھے اور وقف دارالعلوم کے عدالتی امور وہی دیکھتے تھے. ان کا انتقال ہو چکا ہے. وہ لاولدر ہے.

سیدہ زہرہ بیگم سے اولاد و احفاد

افغانستان میں قیام کے دوران احباب اور شاگردوں کے اصرار پر مولانا منصور انصاری نے دوسری شادی باجوڑ کے سادات خاندان میں زہرہ بیگم سے کی. ان سے مولانا منصور انصاری کے دولڑکے عبیداللہ انصاری اور مولانا قاری سیف اللہ انصاری اور تین لڑکیاں فردوسیہ، امۃ اللہ اور امیت اللہ ہوئیں. امت اللہ کا انتقال کمسنی میں ہو گیا تھا.

عبیداللہ انصاری اپنی اولاد کے ساتھ جرمنی میں شہر کاسل میں مقیم ہیں. ان کی زوجہ شیریں کا وہیں انتقال ہو گیا. ان کی اولاد نے جرمنی کی شہریت اختیار کر لی. ان کے دو بیٹے ہدایت اللہ انصاری اور عنایت اللہ انصاری ہیں، نیز تین بیٹیاں مہ جبین، سارہ اور زہرہ ہیں.

سیف اللہ انصاری جلال آباد میں مقیم ہیں. ان کی اہلیہ مریم بی بی بھی فوت ہو چکی ہیں. مولانا سیف اللہ انصاری نے کابل میں علامہ منصور انصاری فاؤنڈیشن قائم کی ہے. جس کے وہ صدر عام ہیں. یہ فاؤنڈیشن مولانا منصور انصاری کی تصنیفات کے علاوہ ان کی شخصیت اور خدمات پر تحقیقات شائع کرتی ہے. ان کی اولاد و احفاد کابل اور جلال آباد میں ہے. ان کے چار بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں. صدیق منصور انصاری، عمر منصور انصاری، عثمان منصور انصاری اور غالب منصور انصاری اور بیٹیاں قدسیہ، جمیلہ اور ہاجرہ ہیں. ہاجرہ ٹیکسس

امریکہ میں مقیم ہے.

فردوسیہ بنت منصور انصاری کے تین بیٹے اسد اللہ، عزیز اللہ، عصمت اللہ، اور تین بیٹیاں شہناز عرف گل غٹوئی، فرح ناز اور طیبہ ہیں. ان کے بیٹے کابل میں ہیں اور ان کی لڑکیاں جرمنی، لندن اور امریکہ میں رہتے ہیں.

امیت اللہ بنت منصور انصاری کی اولاد افغانستان، پاکستان اور امریکہ میں ہے. دو بیٹیاں ریحانہ اور سلیمہ ہیں اور تین بیٹے احمد سلیم، بشیر قریشی اور زبیر قریشی ہیں.

ان کی اولادوں کی تفصیل مولانا عبداللہ انصاری کی سوانح مرج البحرین، مولانا حامد الانصاری غازی کی سوانح ذکر غازی اور تذکار الانصار میں بیان کی گئی ہے. تینوں کتابیں اقرا ایجوکیشن فاؤنڈیشن ممبئی نے شائع کی ہیں.

واپسی کی مساعی

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

وہ خاکستان ہند کو اپنا گلستان آرزو بنائے ہوئے خاکستان افغانیہ میں قیامت تک کے لئے جزوخاک ہو گئے. اسی کو کہتے ہیں آرزو کا خاک ہو جانا.

یہ واقعات مولانا محمد میاں منصور انصاری کی زندگی کے بعد کے دور سے متعلق ہیں مگر یہاں ان کا ذکر اس لئے کیا جا رہا ہے کہ ان مساعی سے پہلے وہ سیاسی اور سفارتی سیاحت کے نتیجہ میں عالم اسلام کے بارے میں بڑی واضح رائے قائم کرتے نظر آتے ہیں جن کا تعلق ان کی ذاتی تاریخ سے زیادہ ملی تاریخ سے ہے.

ایک طرف مولانا منصور انصاری افغانستان میں امن و امان اور بقا و استحکام کی کوششیں کر رہے تھے، دوسرے ان کے اعزہ و احباب انہیں ہندستان واپس بلانے کے لئے اعلیٰ سطحی کوششیں کر رہے تھے. ان کے ماموں زاد بھائی مولانا محمد طاہر قاسمی، رکن انتظامیہ دارالعلوم دیوبند، نے ۷ فروری ۱۹۲۷ء کو انہیں خط لکھا جس میں ان کوششوں کے اشارے دیتے ہوئے ان کی ہندستان واپسی کی راہیں ہموار ہونے کی خوش خبری دی تھی. لیکن چونکہ مولانا منصور انصاری نے ایک عظیم مقصد کی خاطر ہندستان سے ہجرت کی تھی تو وہ اپنی شرائط پر واپس آنا چاہتے تھے. اسی لئے مولانا منصور انصاری نے بھی وطن لوٹنے کا خیال دل سے نکال دیا تھا. اسی وجہ سے وہ اپنے نام کے ساتھ آوارۂ ہند، آوارہ یا آوارۂ بیکار جیسے الفاظ استعمال کر کے وطن کی حسرت کا اظہار کرتے رہتے تھے.

اس وقت وہ واپس آ جاتے تو ان کی حیثیت معمولی نہ ہوتی. ظاہر ہے ان کی قائدانہ صلاحیت سے ملک اور ملت دونوں ہی کو استفادہ کا موقعہ ملتا. ان کی شخصیت

ملک میں موجود مسلم قیادت سے بہت مختلف تھی.

مسلمان ۱۸۵۷ کے بعد دین اور دنیا کی تعلیم پر جدا جدا اصرار کے نتیجہ میں بٹ گئے تھے.علما کا عالم اسلام کے بارے میں علم اخباری تھا اور یورپی سیاست و معاشرت کا فہم بالواسطہ اور غیر معروضی تھا.مغربی تعلیم یافتہ افراد کا یورپی طرز معاشرت اور فکر و فلسفہ سے تو بے شک وسیع تدریسی تعارف تھا مگر عالم اسلام کے حالات سے وہ فی الجملہ بے خبر تھے.

ان جماعتوں کے مقابل مولانا منصور انصاری نے آدھی مسلم دنیا کو بار ہا پیادہ پامسافرت میں بہ چشم سر دیکھا تھا.ہندستان میں مختلف علاقوں کے علاوہ حجاز، افغانستان، ازبکستان، ترکمانیہ، تاجکستان، اناطولیہ میں قیام کیا اور ان مسلم ملکوں اور قوموں کے حالات کا مشاہدہ اور تجزیہ کیا تھا.مسلم افریقہ کے بارے میں ان کا علم اس درجہ کا تھا کہ قیام ترکی کے دوران لیبیا کے مجاہد آزادی شیخ احمد السنوسی (۱۸۷۳-۱۹۳۳) اور مصری اسلامی تحریک حریت کے رہنما شیخ عبدالعزیز شاویش (۱۸۷۶-۱۹۲۹) کو بلا کر ان سے افریقہ و عرب دنیا کے حالات اور ملی تحریکات پر طویل سلسلہ مذاکرات قائم کیا،شیخ شاویش کو سلطنت عثمانیہ کے قائدین سے متعارف کروایا یہاں تک کہ انہیں عالم عرب میں اسلامی اتحاد و جہاد کا وکیل مقرر کر دیا گیا.

مولانا منصور انصاری کئی بار روس بھی گئے اور خصوصا خود روس اور اس کے پڑوسی ملکوں پر انقلاب روس کے اسباب، نتائج کے انقلاب کے اچھے برے اثرات پر ان کی معلومات خود ہندستانی مارکسیوں کی اعتقادی معلومات سے زیادہ وقیع اور وسیع تھیں.افغانستان اور ترکی میں ان کی ملاقاتیں جرمن قائدین اور سیاسی و سفارتی وفود کے اراکین سے بھی ہوتی تھیں.ان ملاقاتوں میں صرف باہمی سیاسی دلچسپی کے امور ہی زیر بحث نہیں آتے تھے بلکہ مولانا منصور انصاری ان موقعوں پر یورپی ذہن اور معاشرت کو سمجھنے کی کوشش بھی کرتے تھے.یہ مذاکرات چونکہ ترجمان کی وساطت سے ہوتے تھے اس لئے ان میں بہت گہرائی نہیں ہوتی تھی لیکن ایک تجربہ کار مجاہد

آزادی، اور وسیع مطالعہ اور بسیط عمرانی مشاہدہ رکھنے والے عالم سیاست داں اور سفارت کار کو اجمالی گفتگو سے مفید نتائج اخذ کرنا دشوار نہیں تھا.

ایسی ہی دوسری شخصیت مولانا عبید اللہ سندھی کی تھی جو ہندستان واپس آئے تو جماعت کے بوریوں پر ان کی جگہ نہ نکلی. انہیں بھی ساتھی ملے نہ ہم نوا اور ہم فکر میسر آئے نہ ہمدرد تو وہ اپنی ذات میں محدود ہو گئے اور تحریک ریشمی رومال کے اساسی فلسفۂ ولی اللہی کی تبلیغ کے لئے خود کو وقف کر دیا. اس سمت میں انہوں نے گراں قدر کام کیا. مولانا منصور انصاری ۱۹۲۰ میں واپس آ گئے ہوتے تو جہاں مولانا سندھی کو مساہمت و تقویت حاصل ہوتی وہاں وہ اس نظام کو متحرک اور انقلابی فکر کو متاثر کرتے جو شیخ الہند کے بعد بے روح ہو گیا تھا. اس میں شک نہیں کہ اہل فکر حضرات سے ہندستان خالی نہیں ہو گیا تھا اور خود سلسلہ دیو بند میں انقلابی روح دبی دبی سہی موجود تھی. انہی میں ایک مولانا محمد طاہر قاسمی تھے. ان کا سیاسی مشاہدہ وسیع اور فکر بلیغ تھا اگر چہ عملی سیاست سے ان کا واسطہ نہیں تھا. وہ مولانا منصور انصاری کے ماموں زاد بھائی تھے اور چاہتے تھے مولانا منصور انصاری کسی طرح ملک واپس آ جائیں. اس خواہش کے پیچھے کوئی بڑا مقصد ضرور تھا.

مولانا منصور انصاری ہماری ملی اور قومی تاریخ کا ایک گمشدہ باب ہیں. آج کی بات نہیں. انہیں تو اس وقت یاد نہ رکھا گیا جب ابھی وہ زندہ تھے. مگر یہ بھی نہیں کہ انہیں ہندستان بلانے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی. وقت اور بخت کی بات ہے کہ ان میں سے کسی بھی کوشش کو تقدیر کی تائید حاصل نہ ہوئی. یہی اس داستان درد کا عجیب پہلو ہے.

مولانا محمد میاں انصاری اکیلے تو شیخ الہند کی ریشمی رومال تحریک نہیں تھے. تنہا تو افغانستان نہیں گئے تھے. جنود ربانیہ ان کی اکیلی ذات کا نام تو نہیں تھا. آزادی ہند کی وہ مہم ایک شخص پر تو تمام و کمال مرتکز نہیں تھی. سیکڑوں ہزاروں افراد ہندستان سے باہر اس سے وابستہ تھے. ان میں جو سر برآوردہ تھے یا جن کو برتر و ممتاز سمجھا گیا تھا وہ سب اپنے اپنے مستقر پر لوٹ آئے تھے. اور جن کو آسانی سے نظر انداز کیا جا سکتا تھا انہیں

اس طرح بھلا دیا گیا کہ جیسے ان کا وجود انسانی عزت ومکرمت کا مستحق نہیں تھا. کابل کی تحریک عملی نتیجہ نہ دے سکی تو برکت اللہ بھوپالی امریکہ واپس چلے گئے. راجہ مہندر پرتاپ ہندستان واپس آ گئے. مولانا عبیداللہ سندھی برسوں دنیا بھر میں بھٹکتے پھرے اور آخر اس طرح واپس ہندستان آئے کہ سیاست سے کنارہ کشی ان کی خدمت وطن یا عشق مقصد کا صلہ قرار پائی. شیخ الہند کو تشدد کا شکار بنا کر اور قریب المرگ پہنچا کر مالٹا سے رہا کیا گیا اور ان کے ساتھ مولانا حسین احمد مدنیؒ اور مولانا عزیر گلؒ بھی واپس آ گئے اور مولانا مدنیؒ باقی زندگی ملک کی عملی سیاست میں حصہ لیتے رہے.

اس کی وجہ تھی. ان سب کی مہمات صرف سیاسی تھیں. مولانا محمد میاں منصور انصاری کی مہم بنیادی طور پر انقلابی حربی تھی. مولانا عبیداللہ سندھی بھی انقلابی حربی لیڈر تھے کیونکہ کابل کی فوج کے سالار وہی تھے. لیکن قبائل آزاد، اتراک وافغان اور خود افغانستان میں جمع ہو جانے والے ہندستانیوں کو ایک فوج کی شکل میں منظّم کرنے کا کام اس تحریک میں صرف مولانا منصور انصاری نے کیا تھا اسی لئے تحریک ریشمی رومال میں تنہا انہی کے سر پر ۲۵،۰۰۰ روپئے کا انعام تھا اور انہی کی ہندستان واپسی اتنی مشکل تھی کہ ناممکن بن گئی.

بے شک مولانا منصور انصاری کو ہندستان بلانے کی ایک سے زیادہ کوششیں ہوئیں، اور یہ بھی درست ہے کہ ان میں سے ایک بھی کامیاب نہ ہو سکی. اس وجہ سے کچھ غلط فہمی بھی پیدا ہوئی. اس راز پر سے مولانا محمد میاں منصور انصاری کا وہ خط پردہ اٹھا دیتا ہے جو انہوں نے اپنے ماموں زاد بھائی مولانا محمد طاہر قاسمی کے خط کے جواب میں تحریر کیا تھا.

مولانا محمد طاہر قاسمی کے نام خط

پیارے بھائی جناب مولانا حافظ قاری صاحب سلمہم اللہ تعالے

السلام علیکم ورحمۃ اللہ.عرصہ سے آپ کا محبت سے لبریز نامہ آیا رکھا ہے.اول موسمی مرض کی وجہ سے بعد میں ضعف اور کاہلی کے باعث عرض جواب میں تاخیر ہوئی.معافی چاہتا ہوں.

نامہ محبت سے آپ پر عنایات برادرانہ کا افسوسناک حال معلوم کر کے انتہا تکلیف محسوس کی بلکہ ہندستان سے دل سرد ہو گیا.اناللہ!

بھائی جب حالات یہ ہیں تو آپ کس لئے اس آوارہ کو دعوت دیتے ہیں.اس میں شک نہیں کہ میں یہاں اپنوں سے دور ہوں مگر ہندستان میں آنے کے لئے اپنوں کی محبت و شفقت درکار ہے.جب وہی سفیدی خون کے نذر ہو چکی ہو تو پھر آگے کیا توقع کی جائے.

تاہم میں نے آپ کی دعوت پر غور کیا جس کے بعد اپنا عندیہ عرض کرتا ہوں تاکہ مزید انتظار کی کلفت سے آپ بچیں.

عزیزم،اس مبارک آوارگی میں میری جو حالت بھی رہی ہو اور عسر و یسر کے جو اد وار بھی گذرے ہوں سب کو الحمدللہ میں نے ایک سپوت کی طرح برداشت کیا اور اپنی طرف کہیں بھی واپسی کا خیال نہیں کیا.ہند سے میری آوارگی ایک احتجاجی صورت رکھتی ہے.اس صورت کی تبدیلی کے لئے میرے خیال میں ایک تبدیلی کی ضرورت ہے جو ابھی تک عمل میں نہیں آئی.اگرچہ مجھے اس کا بھی پورا احساس ہے.پر اس احتجاج سے استفادہ کا خیال ہند میں کسی کو بھی نہیں،بالخصوص ہماری مست قوم کو تو قطعاً نہیں.مگر مجھے کسی سے کیا.مجھے اپنے کام سے کام.میں منتظر ہوں کہ **رب العلمین، رب المشرقین والمغربین وما بینھما** میرے گمنام کام میں کب اور کتنی برکت عطا فرماتا ہے.اگر وہ اس کے نتیجہ میں میری ناکامی پر شاباش صادر رہے تو اس بےنوا کے لئے وہی کافی ہوگی اور اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی

طرح صدیوں کے بعد میری خدمات کی قدر افزائی ہوتی ہے تو فھوالمراد اور اگر مثل یوسف علیہ السلام بنا کر آخر میں کامگار بنانا چاہتے ہیں تو خوش نصیب

راضی ہیں ہم اُسی میں جس میں رضا ہو اُس کی
مگر مجھے علم ہوتا رہا ہے کہ یہ ہے اس عزم کے خلاف.

اول: حضرت قبلہ والد صاحب [مولانا عبداللہ انصاری] قدس سرہ نے میرے بلانے کی مساعی فرمائیں اور جب ان کو معلوم ہوا کہ یہ میرا معاملہ قابل طمانیت طریقہ پر صرف لندن میں وزارت ہند سے ہی ہوسکتا ہے تو انہوں نے عالی جناب ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب کو جو علی گڑھ سے لندن جارہے تھے آمادہ کیا کہ وزیر ہند سے میرا معاملہ طے کریں. مگر اس عرصہ میں حضرت قبلہ والد صاحب کا وصال [۱۹۲۵] ہوگیا.

دوم: حضرت قبلہ چچا مولانا خلیل احمد صاحب (محدث سہارنپوری) نے سعی شروع کی اور غالباً حاجی وجیہہ الدین صاحب سے صلاح کی تھی مجھے معلوم نہیں کہ یہ سلسلہ کہاں تک پہنچا. اسی عرصہ میں آپ (مولانا خلیل احمد) کی رحلت کا سانحہ سننے میں آیا.

سوم: حضرت قبلہ ماموں صاحب (مولانا حافظ محمد احمد ابن مولانا محمد قاسم نانوتوی) نے اطلاع فرمائی تھی کہ میں کسی بڑے عہدے دار سے تیرے متعلق ملنے والا ہوں. مگر حضرت موصوف کی علالت نے طول کھینچا اور داعی اجل کو آپ بھی لبیک فرما گئے. اناللہ وانا الیہ راجعون.

میں نے ان بزرگوں کی خدمت میں کسی قسم کی عرض معروض کی جرأت نہیں کی کیونکہ میرا فرض تھا کہ ان کی ہر حال میں اطاعت کروں مگر اب اس درجہ کا مطاع کوئی نہیں رہا تو اپنے فکر کو عرض کردینے کا موقع ہے.

بھائی

۱- میرے بلانے کا اولین موقع وہ تھا جبکہ ملک نے متحدہ طریقہ پر اور اصرار کے ساتھ حضرت مولانا شیخ الہند قدس سرہ کا معاملہ طے کیا تھا. معلوم نہیں بزرگوں اور ملک نے

کن علل کی بنا پر ہم چھوٹوں کو بھلایا. بہر حال یہ مناسب ترین موقع اب ہاتھ نہیں آ سکتا.

۲-اس کے بعد میرے نزدیک صورت ہونی چاہیے تھی کہ ملک ہمیں بلائے. ملک کی ہماری نسبت بے حسی سے یہ صورت دور کی ہے.

۳-اب رہ جاتی ہیں انفرادی مساعی. مگر سوال یہ ہے کہ اس کمزور آلہ پر کہاں تک اعتبار کیا جائے علی الخصوص جبکہ وہ ہندستان کے بے اہمیت حکام سے متعلق ہوں جن کو بلند سیاست میں کوئی قوت حاصل نہیں اور ان کا فیصلہ ہو سکتا ہے کہ فریب ہو.

بہر حال اس تیسری صورت کو بھی محض آپ کی پاس خاطر سے منظور کر سکتا ہوں مگر شرائط ذیل کے ساتھ.

اول: حضرت مولانا حسین احمد صاحب، حضرت مولانا سید انور شاہ (کاشمیری) صاحب، حضرت مولانا (مفتی) کفایت اللہ صاحب، عالی جناب ڈاکٹر (مختار احمد) انصاری صاحب کی جماعت کو آج میں اپنے مطاع بزرگوں کی روایات کے لئے برابر سمجھتا ہوں. میرے ہندستان آنے کی رائے میں ان کا اتفاق لازم ہے.

دوم: معاملہ حکومت ہند، لندن (وزیر ہند) سے قطعی طریقہ پر طے کیا جائے.

سوم: میرا کام اہل اسلام ہند کی علمی اور تعلیمی خدمات ادا کرنا اور سیاست میں گاندھی جی سے پیچھے نہ رہنا ہوگا. فقط والسلام

آوارۂ ہند منصور عفا عنہ

دم وداع

مولانا منصور انصاریؒ نہ واپس آئے. نہ بلائے گئے. نہ کسی کو یاد آئے کہ دنیا میں ان کا تھوڑا سا اکرام ہو جاتا. وہ اکرام دربار رب میں مقدر تھا جس نے بنی آدم کو خود مکرم کیا ہے(**الاسراء۱۷:۷۰**).سو وہ اللہ رب العزت کے دربار ابد میں واپس چلے گئے

جان ہی دے دی جگر نے آج پائے ناز پر
عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا

زندگی ایک نعمت ہے بشرطیکہ کسی عظیم انسانی مقصد کی خاطر بسر ہو جائے. موت آخرت اور ابدی زندگی کا باب الداخلہ ہے

نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

زندگی کے جتنے نشیب و فراز مولانا محمد میاں منصور انصاری نے اپنی کچھ کم ۷۰ سالہ زندگی میں دیکھے تھے کم لوگوں نے دیکھے ہوں گے. بارہا موت ان سے کترا کر گزر گئی وہ وہ خود پوری دلجمعی سے اپنے مقصد حیات کے اگلے پڑاؤ کی طرف گامزن ہو گئے. موت بھی حکم رب ہے اور رب العالمین کے حق کی خاطر جانیں لڑانے والوں کا احترام کرتی ہے. ایک صدی پیچھے برطانوی راج نے مولانا محمد میاں منصور انصاری کے سر پر ۲۵،۰۰۰ روپے کا انعام رکھا تھا. دنیا قیامت سے ابھی مزید کئی سو سال پیچھے تھی. ابھی انسانی اور اسلامی غیرت زندہ تھی. تو ہندستان، افغانستان، ترکستان، روس، ترکی میں کسی نے وہ انعام لینے کی خواہش نہ کی. پھانسی کا پھندہ، جلاد کی تلوار، دشمن کے جال مولانا منصور انصاری کے سر پر لٹکتے رہے مگر فراست ایمانی، اللہ پر یقین کامل، خود اعتمادی، حوصلہ، جرأت اور بہادری کی بشری

خوبیوں کے ساتھ اللہ کی نصرت ان پر سایہ فگن رہی اور وہ موت کے ہر موڑ پر زندگی کا راستہ ڈھونڈ نکال لیتے تھے.

خاردار پہاڑیوں، سنگلاخ وادیوں،چٹیل رہگزاروں کے دائمی مسافر کو جان صرف اس لئے پیاری تھی کہ بدن میں روح اللہ کے عرفان کا راستہ ہے اور زندگی عبادت کا عنوان؛ اور ربانی مقاصد کی تکمیل کا انحصار جن امور پر تھا وہ صرف رب السماوات والارض کے احاطہ اقتدار میں تھے. ان کا زادِ سفر کچھ خواب، کچھ تمنائیں اور کچھ ارادے تھے اور وہ بھی اسی ملیک مقتدر کی دین تھے.

وہی ہے دل کی تمنا، وہی دماغ کی مانگ
ارادے دیتا ہے، آنکھوں کو خواب دیتا ہے

خداشناسی کا تقاضا تھا کہ وہ وسائل ونتائج سے بے پرواہ اپنا فرض ادا کرتے رہیں. وہ یہ کرتے رہے. ان کا آرام بے ارامی میں تھا، کئی کئی دن بے آب وگیاہ میدانوں اور خشک و سیاہ کوہساروں میں بھوک کی سنت کا تجربہ کرتے گزر جاتے. وہ اس راہ میں نکلے تو جانتے تھے کہ اللہ کی راہ امتحانوں اور آزمائشوں کی گزرگاہ ہے. ان ناہموار راہوں میں انہیں مقصد حیات عزیز تھا. وہ جانتے تھے کہ جدوجہد کا نتیجہ اور کامیابی کا فیصلہ فقط اللہ رب العزت کا حق ہے.

اور ایک دن وہ جانگسل سفر تمام ہو گیا اور ایک عبد ضعیف رب قوی وعزیز کے دربار میں دست بستہ حاضر ہو گیا.

جمعہ کا دن ڈھلا اور شب وصال کی چاندنی چھٹکی تو ۹ صفر المظفر ۱۳۶۵ (۱۲ جنوری ۱۹۴۶) کو رات ۲ بجے اللہ کے اس برگزیدہ بندے نے اپنی جان کی امانت معبود برحق کی نذر کر دی.

سفر زیست کا حاصل نہیں کچھ ان کے سوا
آبلے پیروں کے لایا ہوں تری محفل میں

مولانا منصور انصاری کا انتقال جلال آباد میں ہوا اور لغمان میں حضرت نوح علیہ السلام کے والد حضرت لمک کے قبرستان میں سرکاری اعزاز کے ساتھ تدفین ہوئی.

مولانا منصور انصاری نے اپنے وطن کی اور دنیا کے مسلمانوں کی مکمل آزادی کی خاطر جو صعوبتیں انگیز کی تھیں وہی ان کی جان کا صلہ تھیں غیر یقینی حالات میں ہندستان اس منزل کی سمت آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا جہاں پہنچنے کی آرزو میں لاکھوں انسان راکھ اور پیوند خاک اور اس کلفت انتظار کے رنج وراحت سے بے نیاز ہو گئے تھے. ان میں ایک اور فرد کا اضافہ ہو گیا. مولانا منصور انصاری اپنی حسرتوں کو دامن میں چھپائے جنوبی افغانستان کے مردم خیز شہر جلال آباد کی خاک ارجمند میں جا سوئے. وہ فقط ہندستان کا آخری مغل فرماں روا ابوالظفر سراج الدین محمد ظفر ابن میرزا اکبر ثانی نہیں تھا جسے محبوب وطن کی مٹی میں ملنے کی آرزو تھی اور وہ آرزو انگریزوں کے اقتصادی تمرد اور سیاسی وحشت کی چٹان پر پاش پاش ہو گئی تھی. مولانا منصور انصاری بھی دائمی ہجرت کی ردائے سنت اوڑھ کر اس ملک کی زمین کا حصہ بن گئے جسے حالات نے ان کا نیا وطن بنا دیا تھا.

مگر وہ سرزمین ان کے اجنبی اور غیر نہیں تھی. مدینۃ النبی ان کا اسلامی وطن تھا. ان کے جد امجد سیدنا ابوایوب خالد ابن زید الانصاری نے اپنی آنے والی نسلوں کے لئے جہاد فی سبیل للہ کی میراث چھوڑی اور قسطنطنیہ/ استنبول کی مٹی کو مبارک کیا. حضرت ابوایوبؓ کے صاحبزادے حضرت ابو المنصو ر محمد ابن خالد ابن زید انصاری تابعیؒ عرف منصور مت (ت: ۶۵۰ھ) خلافت سیدنا عثمان ابن عفان کے دوران قاضی ہرات مقرر ہوئے اور ہرات ہی میں آسودہ باغ جناں ہیں. ان کی اولاد میں ابدال وقت خواجہ ابوالمنصو ر محمد ثانی بلخی (م: ۴۳۰ھ/ ۱۰۳۹) تھے جن کے صاحبزادے امام وقت پیر ہرات خواجہ عبداللہ انصاری محدث ہروی اسی ہرات کی سرزمین پر آسودۂ فردوس ہیں جسے حضرت منصور مت مدنی نے اپنا وطن بنالیا تھا. یہ وہ بے شمار وجوہات ہیں کہ مدینہ منورہ کے بعد افغانستان

درحقیقت مولانا محمد میاں منصور انصاری کا دوسرا آبائی وطن تھا.

آج جب ان کے انتقال کو ستر سال سے زائد کا عرصہ گذر چکا ہے تو وقت کی گرد نے ان کی تاریخ وسوانح کی بہت سی باتوں، حیرت انگیز قربانیوں اور مجاہدانہ کارناموں کو چھپا دیا جو باوجود کوشش بسیار کے حاصل نہیں ہوسکیں.جن دستاویزوں کی بنیاد پر اس سدا مہاجر مجاہد جلیل کی یہ سوانح مرتب کی گئی ہے انہیں اب سے ۵۷ سال پہلے ۱۹۶۳ میں انڈیا آفس لندن اور برٹش میوزیم لندن کی الماریوں اور فائلوں سے ڈاکٹر عابداللہ غازی نبیرۂ مولانا منصور انصاری نے لندن کے قیام طالبعلمی میں دن رات کی محنت شاقہ کے بعد جمع کیا تھا. تاریخ کے یہ حقائق ایک بار پھر سچے مورخ کی نگاہ باریک بین سے روپوش ہوگئے تھے.اقرا ایجوکیشن فاؤنڈیشن کے ڈائریکٹر محترم سلمان غازی نے ڈاکٹر عابداللہ غازی کی ہدایت پر دوبارہ تاریخ ہند کی ان قیمتی دستاویزوں کی گرد جھاڑی اور ان پر کام کرنے کا حوصلہ دیا.

اک زمانہ کہیں امروز کی تمہید میں ہے
سحر تازہ نہاں گوشہ خورشید میں ہے

اسی مظلوم انسان کو فرضی اور غرضی خداؤں سے آزادی دلانے اور اس کے قرآنی مقام عزت کی ضمانت دینے کے لئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مستمر ومتواتر عالمی مہم کا آغاز کیا تھا جو اسلام کے نام سے دنیا میں معروف ہے.زندگی کے مہاجروں اور مجاہدوں کے اس دائمی سفر میں جہاں صدیق اکبر اور فاروق اعظم، خالد ابن الولید اور عقبہ ابن نافع، سعد ابن ہشام انصاری، طارق ابن زیاد، قتیبہ ابن مسلم، محمد ابن قاسم کے نام نظر آتے ہیں وہیں شیخ الاکبر ابن العربی، شیخ العز عبدالسلام، شیخ الاسلام آق شمس الدین، شیخ عثمان فودیو، سلطان عبدالحمید خاں ثانی، شیخ عمر المختار لیبی، شیخ احمد سنوسی، شیخ عبدالعزیز شاویش، کاظم قرہ بکر پاشا، علی شکری بے، شیخ محمد سعید کردی، اور برصغیر جنوبی ایشیا میں شمس الدین التمش، غیاث الدین بلبن، مخدوم علاءالدین برناوی، شیخ احمد مجدد الف ثانی، شہاب

الدین محمد شاہجہاں بھی نمایاں مقام رکھتے ہیں.اسی تسلسل میں ایک تجدیدی تحریک کا آغاز شاہ ولی اللہ دہلوی نے کیا تھا جس مہم نے آٹھ نسلوں کے ذہن بنائے.شاہ ولی اللہ کے چاروں بیٹے: شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی،شاہ عبدالقادر مترجم قرآن،شاہ رفیع الدین،شاہ عبدالغنی کے سلسلہ میں آگے شاہ اسمٰعیل شہید اور سید احمد شہید،شاہ عبدالغنی مجددی،مولانا مملوک العلی نانوتوی،مولانا انصار علی انبہٹوی،مولانا محمد قاسم نانوتوی،مولانا رشید احمد گنگوہی اوران کے جانشین شیخ الہند مولانا محمود الحسن سے یہ سلسلہ مولانا منصور انصاری اور مولانا عبید اللہ سندھی ،مولانا عزیر گل پشاوری،حمید اللہ پانی پتی،ظہور احمد مڈکی،مولانا عبد المنان امرتسری،مولا بخش نگینوی،مولانا عبدالحق اکوڑہ خٹک تک پہنچا.اوراب

ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد

ادار یہ مدینہ بجنور

دوشنبہ ۱۶ صفر ۱۳۶۵ھ / ۲۱ جنوری ۱۹۴۶ - نمبر ۴ - جلد ۲۵

ہندوستان کے شیر دل مجاہد

علامہ منصور انصاریؒ کا انتقال

شیخ الہند کی انقلابی پارٹی کا ستون اور ریشمی خطوط کی سازش کا ہیرو!

۳۰ سال کی جلاوطنی کے بعد آزادی اور انقلاب کے آسمان کا ستارہ ڈوب گیا

۱۴ جنوری کو سر شب جلال آباد (افغانستان) ایک تار مدیر مدینہ کے نام
برادر عزیز حمید منصور ایوبی کی طرف سے وصول ہوا.
''علامہ منصور انصاری ۱۳ جنوری کو انتقال فرما گئے''

انا للہ وانا الیہ راجعون

ایک ہزار میل پر ایک بجلی گری جس کی دھمک تمام دنیائے اسلام میں سنی جائے گی اور اس کا اثر ہندوستان، افغانستان، ترکی اور حجاز میں صدہا قلوب پر پڑے گا.

مولانا مرحوم شیخ الہند کی انقلابی پارٹی کے ایک طاقتور ستون تھے. ریشمی خطوط کی سازش کے ہیرو تھے. مولانا عبید اللہ سندھی کے ساتھی تھے. ایک بہت بڑے مجاہد زبردست انقلابی اور اسلام و آزادی کے بے جگر اور نڈر سپاہی تھے جو مرتے دم تک انگریزی شہنشاہیت کے سامنے نہ جھکے. ۳۰ سال تک جلاوطنی کے مصائب برداشت کیے. دل ودماغ کا خون کیا. گھر بار کی بربادی کو قبول کیا. ترکی، افغانستان، چینی ترکستان اور اس کے پہاڑوں کی خاک چھانی. جنگلوں میں صدہا میل پیدل چل کر خون تھوکا. بیک وقت کئی کئی سلطنتوں کا

مقابلہ کیا مگر شیخ الہندؒ کے سیاسی راز کو اپنے سینہ سے جدا نہ ہونے دیا.

علامہ مرحوم کے حالات زندگی

۱- آپ کی پیدائش قصبہ انبہٹہ پیرزادگان میں اس وقت ہوئی جب کہ تیرھویں صدی کے پورا ہونے میں دو سال باقی تھے (۱۲۹۸/ ۱۸۷۹). نام محمد تجویز ہوا. خاندان کے بزرگ محمد میاں کہتے تھے. جب تک ہندوستان قیام رہا محمد میاں ہی نام رہا. آپ اپنی تصانیف میں پورا نام اس طرح تحریر فرماتے تھے - ابوالحامد محمد ابن عبداللہ انصاری.

منصور انصاری ہندی (افغانی)

۲- آپ کا تعلق عہد عالمگیر کے مشہور روحانی خاندان شاہ ابو المعالیؒ سے تھا. سید میران بھیک اور سنہری مسجد دہلی و لاہور کے موسس روشن الدولہ اسی خاندان سے بیعت تھے. آپ علی گڑھ یونیورسٹی کے مشہور ناظم دینیات حضرت مولانا عبداللہ انصاری مرحوم کے فرزند اکبر، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ بانی دار العلوم دیوبند کے حقیقی نواسے، مولانا خلیل احمد صاحبؒ سہارنپوری کے بھتیجے تھے. والدہ مرحومہ (اکرام النسا بنت مولانا محمد قاسم نانوتوی) کے انتقال کے بعد آپ کی تربیت (ماموں) حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ کے زیر سایہ ہوئی اور تعلیم اسلامی دنیا کے شہرۂ آفاق استاد اکبر حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کی سرپرستی میں درجۂ تکمیل تک پہنچی. جب آپ کو سند فضیلت دی گئی تو اس پر اس عہد کے بڑے بڑے علماء نے دستخط ثبت فرمائے.

۳- مولانا مرحوم ہندوستان کی سیاسی زندگی کے ان بحرانی کوائف سے بہت متاثر تھے جن کا اثر مسلمانوں کی اجتماعی زندگی، ہندوستان کی سیاسی آزادی اور دنیائے اسلام کی آزاد قوتوں کی تباہی پر پڑ رہا تھا. آپ کو دار العلوم دیوبند کے شہرۂ آفاق بانی ۱۳۷۲ھ / ۱۸۵۷ء کے سخت کوش قائد اعظم اسلامی ہند کے مجاہد کبیر مولانا محمد قاسمؒ کا نواسہ ہونے کی وجہ

سے علم وسیاست کا جوبھر پور خزانہ ملا تھا وہ سینہ میں محفوظ تھا.سید حسن عسکری جو آپ کے ننھیالی رشتہ کے قریبی بزرگ تھے اور قلعہ معلیٰ (دہلی) کی حقیقت کا مرکز تھے.انگریزوں کی گولی سے شہید ہو چکے تھے اور ان کا خون آپ کی رگوں میں دوڑتا رہتا تھا.قاسمی فلسفۂ سیاست اور جہاد کے امین عام حضرت شیخ الہندؒ کی درسگاہ علم وسیاست میں اعتماد حاصل تھا.جنگ عظیم (۱۹۱۴-۱۹۱۸) کے زمانہ میں آخری سفر حج میں اپنے شیخ اور استاذ کی رفاقت نصیبِ شاگرد ہوئی.شریف حسین کا عہد تھا.شیخ الہند کو حرم امن میں بھی امن میسر نہ ہوا.استاذ سے پہلے شاگرد محمد منصورؒ (انصاری) ہندوستان پہنچا.ہندوستان سے سرحد،سرحد سے آزاد یاغستان اور یاغستان سے افغانستان میں داخل ہو گیا.استاذ نے کلمۂ حق کے اعلان اور شک وشبہ کی پاداش میں اس کی جزا پائی: قید اور نظر بندی.

۱۹۰۳ء اور ۱۹۱۳ء میں حضرت شیخ الہندؒ کی انقلابی کونسل کے رکن تھے: عبید اللہ سندھیؒ، محمد میاں انصاریؒ، عزیز گل سرحدیؒ، حمید اللہ پانی پتیؒ، ظہور احمد مڈکیؒ.

حضرت شیخ الہند فرماتے تھے ''میرے دو ہاتھ ہیں جن سے میں کام کرتا ہوں اور دو پاؤں ہیں جن سے میں چلتا ہوں''.۱۹۱۵ میں یہ دونوں افغانستان پہنچ چکے تھے.

۵- ریشمی خطوں کی سازش ہندوستانی سازشوں کی تحقیقاتی کمیٹی (رولٹ کمیٹی) کے ججوں نے مولانا محمد میاں کو ریشمی خطوں کی سازش کا ہیرو قرار دیا ہے.مولانا پر الزام یہ تھا کہ آپ سلطنت ترکی کی طرف سے حکومت افغانستان اور قبائلی سرداروں کے نام ریشمی دستاویزیں اور خفیہ خطوط لے کر سرحد پار ہو گئے. یہ خط ریشمی رومالوں پر اس طرح لکھے ہوئے تھے کہ ان کو ہر شخص نہیں پڑھ سکتا تھا.

بیان کیا جاتا ہے کہ مولانا نے یاغستان پہنچ کر جنگ وزیرستان کی کمان کی. افغانستان پہنچ کر قلعہ شاہی کو سلطانی فرمان پہنچایا اور ہندوستان کی حکومت میں انقلاب لانے کی کوشش کی.

۶- امیر حبیب اللہ کا قتل: یہ بات ایک تاریخی راز کے طور پر بیان کی جا سکتی ہے. کابل کے انگریز سفارت خانہ نے سرگرم کوشش کے بعد آپ کی گرفتاری کا فرمان امیر حبیب اللہ سے حاصل کر لیا. اس وقت امیر کے بھائی نصر اللہ خاں نائب السلطنت وزیر اعظم تھے. انہوں نے اس فرمان کو روک لیا اور اپنی موٹر کے ذریعہ آپ کو شاہی محل مہمان خانے کے سمت شمالی کے پہاڑوں میں پہنچا دیا. آپ نے ۲۳ روز پیدل سفر کیا اور سرحدی پہرہ داروں سے بچ کر آپ بخارا کی حدود میں داخل ہو گئے. اس کے نتیجہ میں انقلابی تحریک شدید ہو گئی اور امیر حبیب اللہ کو قتل کر دیا گیا اور اس کے بعد آپ کو افغانستان میں بلا لیا گیا.

۷- سیاسی کارنامے: ۱۹۲۰ء میں افغانستان کی جنگ آزادی کے بعد وہ پہلی افغانی سفارت متعینہ انگورہ (انقرہ-ترکی) کے وزیر مختار منتخب کیے گئے. جرنیل محمد گل خاں (موجودہ وزیر داخلہ افغانستان) اس سفارت کے ایک رکن تھے. یہ سفارت روس کے جنگلوں میں گرفتار کر لی گئی. اور آپ تین ماہ تک تاشقند جیل خانے میں رہے. سزائے موت کا حکم ہو چکا تھا مگر حکومت روس نے معاف کر دیا. آخر آپ سردار عبدالرسل جنرل تاشقند کی سفارش پر رہا ہوئے. اس کے بعد آپ کو پہلے افغان سیاسی ڈیپوٹیشن (سفارت افغانستان متعینہ ماسکو) کا رکن بنایا گیا اور آپ نے لینن اور سوویت روس کے لیڈروں سے تبادلہ خیال کیا. ۱۹۲۱ میں آپ افغان سفارت متعینہ انگورہ کے رکن اول بنائے گئے. اور کچھ عرصہ بعد سردار سلطان احمد خاں کی جگہ انگورہ میں قائم مقام وزیر مختار کی حیثیت سے چارج لیا اور فتح سمرنا (موجودہ ازمیر) کی تقریب (فتح) پر افغانی سفیر کی حیثیت سے تقریر فرمائی.

۸- افغانی وزیر کی حیثیت سے آپ نے کاظم قرہ بکر پاشا، جمال پاشا ثانی، امیر البحر رؤف بے، علی شکری بے صدر ہلال خضر پارٹی سے اپنا تعلق استوار رکھا. اس بنا پر آپ کو غازی مصطفے کمال پاشا کی سرپرستی سے محروم ہونا پڑا.

آخر حکومت ترکی کی درخواست پر افغانستان اور ترکی کے درمیان شاہی قاصد

کے منصب پر سرفراز کیے گئے اور آپ نے اس حیثیت سے دوبار کابل سے براہ باکو بالعموم انگورہ کا سفر کیا.

۹- اس کے بعد آپ کو وزارت خارجہ افغانستان کے ماتحت پولٹکل ڈپارٹمنٹ میں منتقل کر دیا گیا..کچھ عرصہ تک وزارت تعلیم کے ماتحت صوبہ مشرقی میں ڈائرکٹر تعلیمات رہے.

۱۰- بچہ سقہ نے اپنے عہد میں آپ کو صدر پارلیمنٹ بنایا مگر آپ نے انکار کر دیا. پھانسی کا حکم دیا گیا مگر آپ بچ کر ہندوستان کے راستے سے سرحد آزاد باجوڑ پہنچ گئے.

۱۱- آپ افغانستان جدید کے سیاسی استاذ تھے. بہت سادہ مزاج، شہرت سے دور اور زبردست کام کرنے والے انسان تھے. فرماتے تھے میں جہاد فی سبیل اللہ کو شہرت کے لیے تباہ نہیں کرنا چاہتا. عرض کیا گیا اپنی سوانح زندگی مرتب فرما دیجئے. ارشاد ہوا

> جب انگریزی حکومت ہندوستان میں موجود ہے اور دنیائے اسلام کی گردن پر سوار ہے، اس دن تک شیخ الہند کے کسی شخص کے حالات زندگی قلمبند نہیں کیے جا سکتے.

۱۲- جلاوطنی کے ۳۰ سال: علامہ مرحوم نے ۶۷ سال کی عمر میں (۱۳ جنوری ۱۹۴۶/ ۹ صفر الظفر ۱۳۶۵ھ) انتقال فرمایا. ۳۰ سال تک جلا وطن رہے. انگریزی حکومت نے اجازت نہ دی، اور خود درخواست دینا گوارہ نہ کیا. مرحوم اپنی ۳۰ سال کی جلاوطنی میں بہت سے انقلابات دیکھ چکے تھے. ۱۹۰۵ میں جب کہ شریف حسین سلطنت عثمانیہ کے خلاف انقلاب بپا کر رہا تھا آپ حجاز میں تھے. افغانستان کے سیاسی انقلاب کی بنیاد آپ کے سامنے رکھی گئی۔ نجا شا اور غیوا کے شفع (جڑواں) انقلاب کے وقت آپ روسی ترکستان میں موجود تھے. روس کے انقلاب میں اور اس کے بعد آپ تاشقند اور ماسکو، باکو، اور طفلس میں گھوم رہے تھے. ۱۹۲۱-۱۹۲۳ میں ترکی کا انقلاب، خلافت کا سقوط، سمرنا کی فتح، جدید ترکی کا قیام آپ کے سامنے ہوا. انگورہ میں چھ ماہ تک طرابلس (لبیا) کے انقلابی رہنما شیخ

احمد سنوسی کبیر، مصر کے انقلابی لیڈر علامہ عبدالعزیز چاویش، کردستان کے انقلاب پسند شیخ محمد سعید کردی، ہندوستان کے انقلابی مولانا عبدالمنان امرتسری اور مولا بخش نگینوی افغانی سفارت میں آپ کے مہمان رہے. آپ ہندوستان، اسلامی دنیا اور ایشیا کی آزادی کے پروگرام ان کے ساتھ مل کر بناتے رہے.

آپ کو افغانستان میں حکومت اور عوام کے حلقوں میں بڑی عظمت حاصل ہے. افغانستان کے مشہور وزیر خارجہ اور معاہدہ سعد آباد کے مصنف آقائی فیض محمد خاں آج بھی مولانا کا سیاسی شاگرد ہونے پر فخر کرتے ہیں.

آہ! انقلاب آزادی اور زندگی کا یہ خاموش سیلاب اپنی منزل پر پہنچ کر رک گیا. حق تعالیٰ مغفرت فرمائے اور اپنے عرش عظیم کے سایے میں جگہ دے. آمین.

مولانا کے چھوٹے صاحبزادے کا پتہ یہ ہے: حافظ حمید میاں. قلعہ مولانا منصور. باغ غربا جلال آباد. افغانستان

خلاصہ

۱- ہندوستان کے شیر دل مجاہد.

۲- علامہ منصور انصاری کا انتقال.

۳- شیخ الہند کی انقلابی پارٹی کا ستون اور ریشمی خطوط کی سازش کا ہیرو!

۴- ۳۰ سال کی جلاوطنی کے بعد آزادی اور انقلاب کے آسمان کا ستارہ ڈوب گیا.

۵- ۱۹۰۳ اور ۱۹۱۳ء میں حضرت شیخ الہند کی انقلابی کونسل کے رکن تھے.

۶- آپ افغانستان جدید کے سیاسی استاذ تھے.

۷- آہ انقلاب آزادی اور زندگی کا یہ خاموش سیلاب اپنی منزل پر پہنچ کر رک گیا.

خبر تدفین

مدینہ بجنور

صفحہ اول. یوم سہ شنبہ ۲ ربیع الاول ۱۳۶۵ھ مطابق ۵ فروری ۱۹۴۶ء. جلد ۳۵ نمبر ۱۰

ہندوستان کے انقلابی مجاہد علامہ منصور انصاری کی

تجہیز و تکفین شاہی اور فوجی اعزاز کے ساتھ ادا کی گئی
نماز جنازہ میں علماء، صلحاء، وزراء، گورنر اور فوجی حکام کی شرکت

کابل کی ایک اطلاع مظہر ہے کہ ہندستان کے انقلابی مجاہد علامہ منصور انصاری کی تجہیز و تکفین اور نماز جنازہ شاہی مراسم اور فوجی اعزاز کے ساتھ ادا کی گئی. حضرت سردار معظم محمد ہاشم خان صدر اعظم افغانستان نے مولانا (منصور انصاری) کی علالت کی خبر پاتے ہی شاہی ڈاکٹروں کو علاج کے متعلق حکم دیا اور وفات کی اطلاع پر سمت مشرقی کے گورنر کو ایک گھنٹہ تک ہدایات دیں اور حکم دیا کہ مولانا کے مراسم جنازہ سرکاری طور پر شاہی اور فوجی اعزاز کے ساتھ ادا کئے جائیں. والا حضرت نے حمید منصور ایوبی صاحب سے بذریعہ ٹیلیفون فرمایا: تمہاری آرزو مقدم ہے مگر ہماری خواہش یہ ہے کہ حضرت مرحوم کو ہمارے قدیم شاہی قبرستان اور حضرت مہتر لمک کی زیارت گاہ (لغمان) میں سپرد خاک کیا جائے. چنانچہ حضرت صدر اعظم صاحب کے ایمائے گرامی کی تعمیل کی گئی.

مراسم جنازہ کے موقعہ پر مسلح فوجی دستے قلعہ منصور کے سامنے دورویہ بندوقیں الٹی کئے اور سر جھکائے کھڑے تھے. سب سے پہلے گورنر صوبہ، قلعہ منصور پہنچے. ان کے علاوہ حضرت محترم فضل احمد خان مجددی، وزیر انصاف، عالی قدر محترم ہندوستانی مہاجر عالیجناب

شاہ جی صاحب، اور حربی دفتر جنگ. . .(یہاں عبارت صاف نہیں ہے) خان صاحب کے علاوہ متعدد علماء، صلحاء اور حکام نے نماز جنازہ میں شرکت کی. اسلامی ہند حکومت افغانستان اور والاحضرت صدر اعظم افغانستان، والاحضرت وزیر صاحب حربیہ کا ممنون ہے کہ انہوں نے اسلام کے ایک خادم اور ہندوستانی مجاہد کو اس شان اعزاز اور احترام سے سپرد خاک کیا. (تفصیل آئندہ)

۵ فروری سے ۱۷ فروری کی درمیانی مدت کے شمارے مدینہ بجنور کے فائلوں میں موجود نہیں ہیں. ممکن ہے انہی میں سے کسی شمارہ میں علامہ منصور انصاری کے سفر آخرت کی موعودہ تفصیلات شائع ہوئی ہوں.

یوم تعزیت

ناظم جمعیۃ علماء ضلع بجنور کی طرف سے ہدایات

۱۳ جنوری ۱۹۴۶ء بروز یکشنبہ حضرت مولانا حامدالانصاری صاحب غازی صدر جمعیۃ علمائے ضلع بجنور کے حضرت محترم والد صاحب، جن کا اسم گرامی حضرت مولانا مجاہد جلیل بطل حریت محمد میاں صاحب منصور انصاری رحمۃ اللہ علیہ، جو ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد کے سلسلہ میں ۲۲ سال سے جلاوطن تھے اور کابل میں مقیم تھے، حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ کے خاص رازداروں میں تھے، اس دارافانی سے رحلت فرما گئے ہیں.

اس سلسلہ میں دفتر ضلع جمعیۃ علما نے یوم تعزیت منانے کا حسب ذیل پروگرام بروز جمعہ ۱۸ جنوری کو تجویز کیا ہے.

نماز جمعہ سے قبل قرآن خوانی کرا کر ایصال ثواب کیا جائے. اور بعد نماز جمعہ حضرت مولانا مرحوم کی تعزیت کے سلسلہ میں ایک جلسہ شہر میں منادی کرا کر کیا جائے. جلسہ میں حضرت مولانا کے متعلق ریزولوشن اوران کی زندگی کے مختصر حالات پبلک میں پیش کیے جائیں کل کاروائی اخباروں کو برائے اشاعت بھیجی جائے.

بشیر احمد

ناظم جمعیۃ علماء ضلع، بجنور

وقف حرماں

شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ نے ملک وملت کی آزادی کے لئے اکابر کے منصوبہ کے مطابق تحریک کو دوبارہ وہیں سے شروع کرنے کا فیصلہ کیا جہاں وہ ۱۸۵۷ میں رک گئی تھی. ملک سے انگریز حکومت کے خاتمہ کے لئے بوریہ نشینوں کی تربیت سازی کے بعد انہوں نے ایک ایسی جماعت تیار کی جس میں شامل افراد فہم وفراست اور تدبر وہوشمندی کے ساتھ اس انقلابی تحریک کے لئے اپنی زندگیاں وقف کر سکتے تھے. شاہ ولی اللہ کے طریق پر شیخ الہند نے پہلے تمام مسلم نوابین اور دانشوروں کو خطوط لکھے اور انہیں آگاہ کیا کہ بغیر مسلح جدوجہد کے ملک کو آزاد کرانا ممکن نہیں تھا. ساتھ ہی بعض افراد کو ملک بھر میں اہل طریقت کے سلسلوں کے ذریعے دفاعی حلقے بنانے کا کام سونپا تا کہ جب بیرون ہند سے انقلابی فوجیں ملک میں داخل ہوں تو اندرونی شورش اسے معاونت فراہم کرے. یہ انقلابی تحریک اپنی جگہ بہت مکمل اور جامع تھی. اس کام کو انتہائی رازداری سے انجام دینے کے لئے شیخ الہند کی نگہ ِانتخاب جن افراد پر جاکر مرکوز ہوئی ان میں سرفہرست مولانا عبیداللہ سندھی اور مولانا محمد میاں منصور انصاری تھے. یہ دونوں اکابر انقلاب کی بنیاد کا پتھر تھے.

مولانا محمد میاں ان دنوں جامعہ معینیہ اجمیر میں مدرس تھے، شیخ الہند نے اپنے منصوبہ کے لئے انہیں دیوبند طلب فرمایا اور انقلابی تحریک کے لائحۂ عمل سے آگاہ کیا. مولانا محمد میاںؒ کو شیخ الہند کے ساتھ اکبری جہاز سے حجاز مقدس کے لئے روانہ ہونا تھا. مولانا عبید اللہ سندھی کو پروگرام کے مطابق بعد میں کابل جانا تھا.

تحریک کے ابتدائی دور میں شیخ الہند کے سب سے زیادہ معتمد اور رازدار مولانا محمد

میاں ہی تھے. شیخ الہند اپنی نشست گاہ کے سامنے والے کمرے میں ان کے ساتھ تنہا کئی کئی دن خفیہ مشورے کرتے تھے. اس کے علاوہ مشیر الزماں صدیقی کے آبائی مکان واقع محلّہ کوٹلہ میں بھی عموماً رات گئے اساطین تحریک کی ملاقاتیں ہوتی تھیں. مولانا محمد میاں تحریک کے رازوں کے سب سے بڑے امین تھے. شیخ الہند کے مشیر بھی اور خاموش مدبر اور مفکر بھی. یعنی شیخ الہند نے اپنے بعد بھی تحریک کے لئے ایک مدبر کا انتخاب کیا تھا.

مولانا محمد میاں نے ساری زندگی اپنی شخصیت کو مخفی رکھا تحریک شیخ الہند کے اصل ہیرو اگر چہ وہی تھے لیکن وہ نامور ہونے کے باوجود گمنام رہے جسے ان کی نیک نفسی اور للّٰہیت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے. ایک بے نفس سر فروش مجاہد کی ناقابل فراموش باتوں کا ذکر بھی تاریخ میں نہ آیا. اس غفلت کا نتیجہ ہے کہ آج ہماری قومی تاریخ ان شخصیات کے ذکر سے خالی ہوگئی جن سے تحریک آزادی کی داغ بیل پڑی تھی.

اپنی شخصیت پر ردائے گمنامی ڈالنے کی دو بنیادی وجہیں تھیں. دائمی ہجرت کے سفر پر نکلتے ہوئے انہوں نے اپنی اہلیہ سے وعدہ کیا تھا کہ اس راہ میں دنیا طلبی ان کی مہم کا حصہ نہیں ہوگی. اس بارے میں ان کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ ادنی ناموری کو بھی انہوں نے دنیا طلبی ہی سمجھا اور اس سے اتنا گریز کیا کہ تحریک ریشمی رومال ہی سے غائب ہو گئے.

دوسری وجہ یہ تھی کہ شیخ الہند کی تحریک آزادی انتہائی درجہ میں خفیہ تھی. ابتدا میں یہ تحریک کی ضرورت تھی، لیکن راز طشت از بام ہونے کے بعد اوروں نے آزادی اور متعلقہ یا دیگر اساسی موضوعات پر کھل کر بات کی، جبکہ مولانا منصور انصاری اپنی ذات کے اخفا کی خاطر ریشمی رومال تحریک کے دوران اپنے کاموں کی تفصیلات بتانے کے روادار نہ ہوئے. تو جو کچھ رولٹ رپورٹ میں آیا اسے دنیا کی چکا چوندھ میں اہل غرض کی آنکھیں نہیں دیکھ سکتی تھیں. یوں مولانا محمد میاں منصور انصاری کی شخصیت اور بھی غیر اہم ہوگئی اور ان کے کاموں کا سہرا اوروں کے سر باندھ دیا گیا.

باب/غم تنہا

اہلیہ کا ایثار

انصار کی سب سے بڑی سنت ایثار ہے.

منصوبہ بڑا ہوتو بڑی قربانیاں مانگتا ہے. اور تقدیر الٰہی جن افراد کو وہ قربانیاں دینے کے لئے منتخب کرتی ہے وہ بہت عظیم انسان ہوتے ہیں.

حفصہ خاتون (۱۲۹۹-۱۳۵۹ھ/۱۸۸۲-۱۹۴۰) انسانی تاریخ کی بہت عظیم عورتوں میں سے ایک ممتاز ہستی تھیں. اپنے عظیم شوہر کی طرح وہ بھی گمنام رہیں. پتا نہیں ملک اور ملت کے لئے ان کا ایثار مثالی ثابت ہوا کہ نہیں، مگر ان کا جذبۂ ایثار بڑا عجیب اور غیر معمولی تھا. اپنے شوہر کی طرح وہ بھی گمنام رہیں.

جب جدو جہد آزادی کے منصوبے کے لئے مولانا محمد میاں کا انتخاب ہوا تو شیخ الہند کے حکم پر انھوں نے سب سے پہلے اپنی اہلیہ حفصہ خاتون کو اعتماد میں لیا. مولانا محمد میاں انصاری کے پوتے محمد طارق غازی نے یہ واقعہ بڑی تفصیل سے لکھا ہے (تذکار الانصار ص ۳۸۷)

> مولانا محمد میاں انصاری دارالعلوم دیوبند سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد ان دنوں اجمیر کے جامعہ معینیہ میں صدر مدرس تھے اور حدیث پڑھاتے تھے. شیخ الہند نے انہیں دیوبند طلب کیا. ملاقات ہوئی تو شیخ الہند نے کہا انہیں اپنے ایک اہم کام کے لئے ایک انتہائی معتمد شخص کی ضرورت ہے. مولانا محمد میاں انصاری نے عرض کیا کہ وہ ہر خدمت کے لئے حاضر ہیں. شیخ الہند نے کہا کام بہت سخت ہے.
>
> ''میں سے تم سے تمہاری جان مانگتا ہوں''.

مولانا محمد میاں نے اس پر پھر عرض کیا کہ جان بھی حاضر ہے.

تو فرمایا:

''نہیں، یوں نہیں. اس پر غور کرو. تین دن بعد پھر آنا. اگر اس کے بعد بھی قلب کا عندیہ یہی ہوا تو آگے بات کریں گے.''

تین دن بعد مولانا محمد میاں پھر شیخ الہند کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ ان کے فیصلہ میں کوئی تزلزل نہیں آیا.

اس پر شیخ الہند نے فرمایا کہ تمہاری جان پر سب سے زیادہ حق تمہاری اہلیہ کا ہے. ان سے اجازت لے کر آؤ. اہلیہ پر دباؤ مت ڈالنا. وہ راضی نہ ہوں تو تمہارے لئے کوئی نسبتاً آسان کام دیکھیں گے.

مولانا محمد میاں گھر پر آئے. وہ خود اس وقت نوجوان تھے. بیوی حفصہ خاتون بنت مولانا صدیق احمد انصاری کو شیخ الہند سے اپنی بات چیت کی ساری تفصیل بتائی اور ان کی رائے پوچھی. بیوی نے کہا اگر اللہ کے راستہ میں نکل رہے ہیں تو ان کی طرف سے کوئی رکاوٹ نہیں. لیکن اگر اس دوران مقصد بدل کر دنیا کی طلب ہو گیا تو ''میں اپنا حق معاف نہیں کروں گی''.

حقیقت یہ ہے کہ سو سال پہلے بھی یہ جوڑا معاشرہ میں بڑا منفرد تھا. مولانا محمد میاں انصاری نے اہلیہ سے کہا تھا:

''اللہ تعالیٰ مجھ سے کوئی کام لینا چاہتا ہے. میں اس کی راہ میں نکلنے والا ہوں مگر نہیں جانتا کہ واپس لوٹوں گا یا نہیں. شیخ الہند نے کسی خاص کام کے لیے میرا انتخاب کیا ہے. میں اسلام اور عالم اسلام کی آزادی کے لیے اللہ کی راہ میں نکل رہا ہوں. اس راہ میں جان بھی جا سکتی ہے. تم رفیقۂ حیات ہو اور جوان ہو تمہارا مجھ پر حق ہے. لیکن اس سے اوپر ایک اور حق ہے. اس لیے میں تم سے تمہاری جوانی مانگتا ہوں.''

اس کے بعد اہلیہ کو کچھ تفصیل افغانستان اور قبائل کے سفر کے منصوبہ کی بتائیں.
حفصہ خاتون ایک ممتاز عالم دین مفتی اعظم مالیر کوٹلہ مولانا مفتی صدیق احمد کی بیٹی، ایک ممتاز عالم دین شیخ الاسلام مولانا عبداللہ انصاری انبہٹوی کی بہو تھیں. ان کے اور مولانا محمد میاں انصاری دونوں کے پڑدادا شاہ احمد علی تھے اور ان کا خاندان گزشتہ تین پشتوں سے جد وجہد حریت اور لواء اسلام کی عظمت کے لئے سینہ سپر تھا. ان کا دل بھی دین وملت کی محبت سے لبریز تھا. آخر وہ بلند حوصلہ خاتون مردم خیز بستی انبہٹہ کی رہنے والی تھیں اور خاندان انصار کی فرد تھیں جن کی قربانیاں اسلامی تاریخ کا عظیم حصہ ہیں.

کرتا ہے کون اس طرح ایثار صاحبو
دنیا میں نام کر گئے انصار صاحبو

اماں جی حفصہ خاتون نے کہا:

''اگر آپ کا سفر اللہ کی راہ میں ملک وملت کے لیے ہے تو میں اپنی جوانی اس مقصد کے لیے قربان کرتی ہوں. اگر یہ محض دنیا کے لیے ہوا، تو قیامت کے دن اپنا حق معاف نہیں کروں گی''.

یہ اس عظیم عورت کا جواب تھا جس کے بچے ابھی عالم طفولیت میں تھے. بڑے بیٹے کی عمر ابھی محض سات سال تھی. وہ نہیں پوچھتی کہ ان بچوں کا کیا ہوگا؟ کون ان بچوں کی نگہداشت کرے گا؟ گھر کیسے چلے گا؟ وہ دوپٹے سے اوٹ کر کے بیٹھ جاتی ہیں اور کہتی ہیں:

''اللہ نگہبان! جایئے اب لواء الحمد کے سایہ میں ملاقات ہوگی.''

حقیقت یہ ہے کہ اس نیک دل بنت انصار نے تاحیات اپنے قول کا پاس رکھا. اپنی جوانی کیا پوری زندگی قربان کردی، مصائب اور غربت کی نذر کردی. اَن گنت بیماریوں کی شکار، وہ بے نوا انصارزادی خود اپنے وطن میں مہاجر بن کر زندگی گزار گئی. طویل صعوبتیں اُٹھا کر دیوبند میں انتقال ہوا اور قبرستانِ قاسمی کے ایک گوشہ میں مدفون ہوئیں.

ایک خاندانی روایت کے مطابق گھر کا خرچ دس روپیہ ماہانہ عرصے تک ڈاکٹر مختار انصاری کے یہاں سے انھیں ملتا رہا. ڈاکٹر انصاری اور ان کا خاندان، ان کے بڑے بھائی حکیم عبدالرزاق، نیز حکیم اجمل خاں وغیرہ مدتوں تحریک شیخ الہند کے جیالوں کے خاندانوں کی کفالت کرتے رہے اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی.

حفصہ خاتون

عورت گمنام

شہناز کنول غازی

ہمارے پاس ایک ایسی شخصیت ہے جن کا ہر عمل امّت محمدی کو خیر کا احساس دیتا ہے. اس وقت ساری دنیا عمرانیات کے اعتبار سے ان ہی کی امت ہے.

وہ ذات اقدس ہے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی.

عرب کے ریگزار سے جو آواز خیر کی بلند ہوئی اس نے تہذیبی اعتبار سے فکر کو وہ وسعت دی کہ پہاڑوں کے دل پانی کر دیئے. غور وفکر کرنے والوں نے اس آواز کو دل کی آواز جانا اور عمل کے میدان میں اس پر قدم رکھنے والوں کو کامیابیوں سے ہم کنار کر دیا. مگر اس کے لئے ضروری ہوا جذبات واحساسات کا خالص ہونا، ذہن و دماغ کا مخلص ہونا اور عملی طور پر زمین پر نقش قدم چھوڑنا. اسی آواز نے عورت کی صدیوں کی دبی کچلی ذات کو عزت وحرمت کے ساتھ سربلندی بھی دی اور علم کے ذریعہ وقار عطا فرمایا.

زندگی کے کسی بھی شعبہ کو لے لیجئے محمد رسول اللہ کا فرمان مشعل راہ بن جاتا ہے. اور اس سے روگردانی زوال کو دعوت دیتی ہے.

دراصل یہ فرمان، فرمانِ حق ہے اور اللہ تعالیٰ اس فرمان کی حفاظت خود فرماتے ہیں. جب قومیں یا افراد اس سے دور ہوتے ہیں تو مشکلات، مصائب، ذلت وخواری، احساس بے بسی، کسمپرسی سے دو چار ہو جاتے ہیں. پھر ہوش آتا ہے اہل حق کو اور وہ الٹے

قدموں نقوش قدم کی تلاش میں نکلتے ہیں. ایسے میں خدائے برتر ان کی مدد فرماتا ہے، کوتاہی معاف ہوتی ہے اور زوال کے حصار سے نکل کر راہ مستقیم پر آجاتے ہیں. یہی تاریخ انسانی ہے، یہی انبیاء کا مقصد حیات رہا ہے. خاتم الرُسل محمد صلی اللہ علیہ وسلم اسی راہ حق کے آخری رہنما ہیں یعنی تکمیل انسانیت کے داعی اور عملی فکر کے رہبر.

اب بات کروں گی اس خاتون کی جو زندگی کے سفر میں راہ حق کی مسافر بن کر زندہ رہی اور قربانی کی چادر اوڑھ کر چپ چاپ اپنے رب سے جا ملی.

یہ ہیں حفصہ خاتون بنت مولانا مفتی صدیق احمد. بچپن جس باپ کی نگہداشت میں گذرا ان کا زمانہ اگر چہ باقاعدہ تعلیم کا نہیں تھا مگر باقاعدہ تربیت کا ضرور تھا. ایسے گھرانوں میں دینی فکر اور عمل صالح کا دور دورہ تھا. دینی کتابیں، مجلّے، اخبارات روزمرہ کی زندگی کا حصہ تھے. خواتین کو مدرسوں میں پڑھنے کی اجازت نہیں تھی مگر گھر میں کتابیں اور مجلّات پڑھے جاتے، اس بارے میں بات چیت ہوتی. اس گفتگو میں بھی اسلامی مفکرین اور قرآن وحدیث کے حوالے بار بار آتے جو گھر کے بچوں کے کانوں میں پڑتے رہتے اور غیر شعوری طور پر وہ ان ناموں سے مانوس ہوتے بلکہ ان افکار پر عمل بھی کرتے.

حفصہ خاتون بھی ایسے باپ کے علم وفضل سے اکتساب کرتی رہیں. خاموش تربیت نے ان کے اندر دینی شعور پیدا کیا. ذہانت نے ان کو خواتین اسلام کی اس صف میں کھڑا کر دیا جو سراپا حضرت خدیجہؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت فاطمہؓ، حضرت امّ عمارہؓ، حضرت اسماءؓ کی مقلّد ہوتی ہیں، جو جاں نثاری، قربانی اور قدرشناسی کی اعلیٰ مثال پیش کر کے خود ایک مثال بن جاتی ہیں. ایسی خواتین پر سلام ورحمت.

حصہ خاتون کی پیدائش ۱۸۸۲ میں مالیر کوٹلہ، پنجاب، میں ہوئی. ان کے والد مولانا مفتی صدیق احمد وریاست مالیر کوٹلہ کے مفتی اعظم تھے.

یہ وہ دور تھا جب بارہ تیرہ سال کی عمر میں بچیوں کی شادی کر دی جاتی اور ان کو عملی

زندگی کا راہی بنا دیا جاتا. یہاں ان کی تربیت کا امتحان ہوتا. آج یہ عمر بچپن میں گردانی جاتی ہے. اُس زمانے میں یہ عمر شوہر کی رفاقت کا حق ادا کرنے کے ساتھ نئے خاندان کو اپنا تعارف دینے کی عمر مان لی گئی تھی.

دراصل سفر حیات میں شوہر کی سچی رفیق بن کر قربانی ایثار اور جانفشانی ضروری تھی. اس سے گریز نہیں تھا. حفصہ خاتون ایسے ہی اصول وضوابط کے ساتھ لگ بھگ پندرہ سال کی عمر میں ۱۸۹۷ کے آس پاس محمد میاں منصور انصاریؒ ابن مولانا عبد اللہ انصاری انبہٹویؒ کی بیگم بن گئیں. شوہر کی محبت، تعلق اور دل شناسی نے ان کو اعتماد ذات دیا اور ثابت قدمی سے ہم قدم ہم نوا بن گئیں.

شوہر محمد میاں منصور انصاریؒ ملک کی آزادی کے لئے میدان عمل میں مصروف تھے اور حفصہ خاتون رضا مندی کی تصویر. شوہر مجازی خدا ہوتے اور وہ بحیثیت بیوی ان کی زندگی کا ایسا حصہ جہاں کسی بھی بات سے انکار یا تردید کا کوئی تصور نہیں تھا. یہ ہے ایثار کی پہلی منزل. شوہر کی ہر بات اور ہر کام کو بصدق دل قبول کرنا عورت کی تربیت کا وہ پہلو تھا جس پر اس کے میکہ والوں کو فخر ہوتا کہ ان کی بیٹی مثالی بیوی بن کر عمل کے میدان میں اپنے شوہر کی ہم قدم اور ہم سفر بنی ہے.

حفصہ خاتون نے شوہر کو اپنا ایسا ساتھی مان لیا تھا جہاں ان کی زندگی کا اپنا کوئی مقصد نہیں تھا. دس سال کے عرصے میں وہ چار بچوں کی ماں بن گئیں. تین بیٹے اور ایک بیٹی. ان کی خاموش محبت کو شوہر کی پذیرائی ملتی رہی اور یہی ان کا اعزاز تھا یہی افتخار.

ملک کی آزادی کے لئے جن ملّی اور قومی لیڈروں نے خواب دیکھے تھے اس کی تعبیر کے لئے ان کو ایسے پیرووں کی ضرورت تھی جو تن من دھن سے ان کی تائید کریں اور عملی طور پر ہر قسم کی قربانی کے لئے تیار رہیں. محمد میاں ایسے ہی افراد میں تھے جو اپنے قول پر قربان ہو جاتے ہیں.

شیخ الہند مولانا محمود الحسن نے ان کے مزاج شناس بن کر ایک ایسے کام کے لئے ان کا انتخاب کیا جس میں گھر، بیوی، بچے اور سب سے مفارقت تھی، جدائی تھی اور بڑی لمبی جدائی تھی.

محمد میاں انصاریؒ نے اپنے رہنما سے وعدہ کیا کہ وہ اس کام میں ان کے ہم نوا بن کر قدم اٹھائیں گے. ان کی اولاد میں ان کے سب سے بڑے بیٹے محمود میاں کمسنی میں اللہ کو پیارے ہو گئے تھے. دوسرے بیٹے حامد میاں سات سال کے تھے. باقی بھائی بہن سب چھوٹے تھے. مگر مولانا محمد میاں کے نزدیک حکم سردار سب سے اہم تھا. اس بات کی خبر جب ان کی بیوی حفصہ خاتون کو ہوئی تو انہوں نے اپنے بچوں اور اپنے حقوق سے متعلق سوال کیا. وہ ان سب کو چھوڑ کر جا رہے ہیں. ایک پردہ دار، ناخواندہ، گھریلو خاتون جس نے کبھی گھر کی ڈیوڑھی سے باہر کی دنیا نہ دیکھی ہو اس کا یہ سوال بالکل بجا تھا.

دارالعلوم دیوبند سے تعلیمی لیاقت کی سند شوہر کے پاس تھی. علماء کی سرپرستی تھی. میرے خیال میں ان کے پاس بیوی کے اس سوال کا جواب نہیں تھا. بجز اس کے کہ وہ بیوی بچوں کو اللہ کے سہارے چھوڑ کر جا رہے ہیں. سہارا تو اللہ ہی کا ہوتا ہے، لیکن مادی وسائل کے تحت ایک عورت کے لئے باپ کا گھر سے شوہر کے گھر آ کر شوہر اس کا شریک سفر بن کر جملہ ذمہ داریوں کے سلسلے میں کفیل ہوتا ہے. یہ کفالت حفصہ خاتون کے لئے بھی اسی قدر ضروری تھی جیسے ایک عام آدمی کی بیوی کے لئے ہوتی ہے.

شوہر نے ان کے سوال پر غور کیا سوچا اور فرمایا'' میں دین کی راہ میں وطن کی سلامتی کا احساس لے کر گھر بار چھوڑ رہا ہوں، اس یقین کے ساتھ کہ تم وہ حقوق معاف کر دو گی جو تمہارے مجھ پر ہیں''.

حفصہ خاتون ایک عالم باپ کی بیٹی تھیں، وقت کی نبض شناس تھیں، حالات سے واقف تھیں، شوہر کی ذمہ داریوں کو سمجھ رہی تھیں، اپنے حالات کا بھی ادراک تھا. چھوٹے

چھوٹے بچے اور زندگی کی شاہراہ پر تنہا سفر. غیور باپ کی بیٹی نے اپنا فیصلہ یوں سنایا.

''اگر دین کی راہ میں وطن کی سلامتی کے لئے نکل رہے ہیں تو میں اپنے حقوق معاف کرتی ہوں، لیکن بات اگر برعکس ہوئی تو قیامت میں دامن گیر ہوں گی.''

کیسی خواتین تھیں جنہوں نے قربانی اور ایثار کو اپنا شعار بنا کر جفاکشی کی زندگی پر صاد کیا اور راہ پرخار کا انتخاب کر کے ملک وملت کے لئے اپنی جانِ ناتواں پیش کر دی.

شوہر محمد میاں انصاری شیخ الہند مولانا محمود الحسن عثمانی کی ہدایت پر ملک کی آزادی کے لئے گھر سے نکل پڑے.

حفصہ خاتون نے بچوں کی تربیت اس طرح شروع کر دی کہ اپنے بچوں کو دینے کے لئے ان کے پاس کچھ نہیں تھا. دو بیٹے اور ایک بیٹی ان کا اثاثہ تھے.

شیخ الہند نے حفصہ خاتون کے لئے ایک وظیفہ مقرر کروا دیا. دس روپے ماہانہ ان کو ڈاکٹر مختار احمد انصاری سے مل جاتے. مگر خاندان کو یہ پتا نہ تھا کہ ماہانہ رقم کہاں سے آ رہی ہے، کون بھیج رہا ہے. وہ سادگی اور متانت کے ساتھ زندگی گذارنے لگیں. ان کی جفاکشی کا زمانہ طویل تھا اور عزیز واقارب دور. شوہر سے کئے وعدے نے ان کو شکوہ شکایت یا دست طلب دراز کرنے سے روک دیا تھا.

کچھ عرصہ بعد ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے پاس سے آنے والی رقم بند ہو گئی. ظاہری بات ہے کہ اب ان کے پاس خرچ کے لئے کچھ نہیں تھا. انہوں نے ادھر ادھر نظر ڈالی تو سوائے اپنی اولاد کے کوئی نہیں تھا. اولاد میں بھی بڑے بیٹے بھی دس سال کے تھے. بہادر ماں نے اپنے بیٹے سے اپنا اور گھر کا احوال سنایا. جری بیٹے نے اپنی ماں کی ہمت اور حوصلہ کو دیکھا اور فرمایا کہ وہ دہلی جا کر مولانا مفتی کفایت اللہ سے ملیں اور انہیں احوال سے باخبر کریں.

غرض ماں نے جو چند روپے تھے وہ بیٹے کو دیئے اور حامد میاں براہ ریل دہلی کے لئے روانہ ہو گئے. تصور کیجئے دس سال کی عمر کا بچہ تن تنہا سفر پر روانہ ہوا. وہ عمر جو ماں باپ کے

سایے میں ان کی حفاظت میں بچے گذارتے ہیں حفصہ خاتون کے بیٹے کے لئے جہد مسلسل کا پہلا قدم بن گئی. وہ دہلی پہنچے اور رکشہ کر کے مفتی کفایت اللہ کے واسطے سے ڈاکٹر مختار انصاری کے مطب تک پہنچ گئے. یہاں میں وہ الفاظ دہراؤں گی جو میں نے اپنی والدہ ہاجرہ نازلی سے سُنے.

ڈاکٹر انصاری صاحب کو اس دس سالہ مجاہد بچے نے اپنا تعارف دیا تو وہ حیران رہ گئے. آنکھیں نم ہو گئیں. اپنی جگہ سے اٹھے اور کم سِن بچے کو گلے لگالیا. اپنی نشست پر اسے بیٹھایا اور فرمایا میں بیمار تھا اس لئے پیسے نہیں بھجوا سکا. یقیناً تم ایک عظیم باپ کے بیٹے ہو. اس ماں کو میرا سلام عقیدت جو تم جیسے بچوں کو درس بقا دے رہی ہے. بچے کو روپے دیئے اور اپنے ملازم کے ساتھ اسٹیشن بھیج کر گاڑی میں سوار کروا دیا.

حفصہ خاتون کا درس وفا درس بقا بن گیا اور حامد میاں نے پھر اس اصول کو اپنی زندگی میں اس طرح بسایا کہ اگلے ستّر پچھتّر سال اس پر عمل پیرا رہے.

ایسی ماؤں کو ہم کیوں فراموش کئے رہے؟ اسے بھول کہیں، کوتاہی کہیں، یا شعوری طور پر بے خبری.

ہمارے یہاں سوانحی اعتبار سے خواتین کے سلسلے میں بے خبری شعوری ہے. ہم نے آنکھ کھول کر جب تاریخ اسلام سنی اور پھر مطالعہ کیا تو ایسی بے مثال خواتین کے نام سنے جو حقیقتاً اسلام کے لئے باعث افتخار رہیں. حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ سے لے کر حضرت فاطمہ اور حضرت عائشہؓ جنہوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی انقلابی تحریک کے تحت علمی کام اس طرح کئے کہ تقریباً ۲۲۰۰ حدیثیں حضرت عائشہؓ سے مروی ہیں. پھر یہ کہ ان کا نام نامی اسم گرامی علمی حلقوں میں اس طرح پہنچا کہ سر عقیدت و محبت سے خم ہو گئے اور تاریخ میں ہر تاریخ داں نے ان کا ذکر کیا اور خالص علمی فکر کو ان سے منسوب کیا.

ہمارے معاشرے میں جب تعلیم نسواں سے دوری ہوئی تو عورت کا وجود اس بے خبری کی نذر ہو گیا. بڑے بڑے اصحاب علم وفضل کی ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کو گوشہ گمنامی ملا .کتابیں اٹھائیے .اولا د واحفاد میں صرف مردوں کا ذکر ملے گا.خواتین کی ذات، ان کا علم، ان کا عمل، اور زندگی میں ایثار کا کہیں کوئی ذکر نہیں ملتا، اس کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ خود خواتین اپنے سلسلے میں اس طرز فکر کو درست سمجھنے لگیں، وہ اولاد کو چاند سورج بنا دیتی تھیں مگر خود اپنی تربیت کو ثانوی درجہ بھی نہیں دیتی تھیں .وہ گود جو پہلا مدرسہ تھی اپنی شناخت سے محروم رہا.

علامہ اقبال نے اپنی ماں کو خراج تحسین پیش کیا مگر ان کی رحلت کے بعد مرثیہ لکھ کر جس ماں نے اقبال کو شاعر مشرق بنایا اس کا ذکر کسی ورق پر نہیں ہے.

میرے سامنے اپنی دادی حفصہ خاتون کا کردار رہا ہے جنہوں نے عظیم قربانی دے کر اپنے شوہر کے لئے عمل کی راہ ہموار کی.

حامد الانصاری غازیؒ کی ماں کوئی عام عورت نہیں ہو سکتی تھیں جنہوں نے علم وعمل کے ساتھ قربانی اور درگذر کا درس بھی ان کو دیا، مگر اس عورت کو کسی نے یہ اعزاز دینا ضروری نہیں سمجھا، اسے صنف نازک کہہ کر اس کے مرتبہ کو کمزور کر دیا.

ایک ماں بن کر وہ جس طرح جد جہد اور لگا تار محنت کرتی ہے اس کا ذکر تو ضروری ہے. مگر کیوں ضروری ہے؟ یہ ایک سوال ہے.

یہ چند صفحات حفصہ خاتون کی سوانح ہے. مگر اس میں ان کی روداد مختصر سی ہے .سو سال قبل کی یہ خاتون اپنے حصے کی زندگی جی کر چلی گئی. آج ان کی حیات وخدمات پر کسی کے پاس کوئی مواد نہیں ہے .شوہر کے جانے کے بعد وہ کن مشکلات اور پریشانیوں سے گذری، کس طرح کی صعوبتوں سے نبرد آزما رہی، اور کسمپرسی کے وہ دن رات کیسے گذارے، یہ کوئی نہیں جانتا اس لئے کہ کسی نے جاننے کی کوشش نہیں کی.

آج سلمان غازی سلمہٗ نے دادی اماں حفصہ خاتون کے پاسپورٹ کی فوٹو کاپی

دی جو جولائی ۱۹۳۹ میں لکھنؤ سے جاری کیا گیا ہے، اس پر کچھ معلومات ملیں۔ان کا سن پیدائش، جائے پیدائش وغیرہ۔بس یہی ایک فوٹو کاپی حفصہ خاتون کی کل سوانح ہے۔

بڑے بڑے ذیشان علماء، دانش ور، مصلح، قانون زندگی کے پاسداران، مستقبل شناس، ماضی وحال کے رمزداں سب جولان گاہ حیات میں مصروف عمل رہے، مگر عورت کے سلسلے میں بے خبری کا جو رویّہ تھا اس نے آنے والی اگلی نسلوں کو متأثر کیا عورت از کار رفتہ گردانی گئی۔وہ گود جو مدرسۂ اول تھی بے فیض بن گئی۔اور اس گود میں پلنے والے مرد افکار و عمل کی دنیا میں سو گئے۔

پھر زوال نے در پر دستک دی، مگر دیر ہو چکی تھی۔تحقیق و جستجو کا مزاج آرام طلبی اور ذہنی کابوسیت میں بدل گیا۔اس کا اثر براہِ راست مسلمانوں پر پڑا۔ایک منتشر اور بکھرا ہوا جم غفیر جس کے پاس نہ حال تھا نہ مستقبل۔تو اس نے ماضی کی عمدہ روایات میں پناہ لی اور پدرم سلطان بود کو اپنا نعرۂ مستانہ بنا لیا منزل اور راہ منزل کی نشاندہی کون کرتا۔''ماں'' تو بے خبری، لاعلمی اور ''گوشہ نشینی'' کے محمل میں محصور تھی۔

حفصہ خاتون نے بڑے بیٹے حامد میاں کو دارالعلوم دیوبند میں داخل کر دیا۔مولانا حامدالانصاری غازی نے دارالعلوم دیوبند، مدرسہ معینیہ اجمیر شریف سے فضیلت کی سند حاصل کی۔اور پنجاب یونیورسٹی سے انگریزی ادب کی ڈگری لی۔اور اخبار مدینہ بجنور میں ملازم ہو گئے

رزم گاہ خیر وشر میں مصروف شوہر مولانا محمد میاں منصور انصاری کبھی کبھی خط کے ذریعہ بیوی اور بچوں سے رابطہ کر لیتے اور ضرورت کے مطابق مشورے دے کر اپنی ذمہ داریوں میں پھر ڈوب جاتے۔جہاں وہ مصروف عمل تھے وہاں اتنی یافت نہیں تھی کہ وہ بیوی بچوں کی کفالت کر سکتے۔حفصہ خاتون نے حامد میاں کی شادی اپنے وطن انبہٹہ کے پیر جی محمد میاں کی بیٹی میمونہ خاتون سے کر دی۔چھوٹے بیٹے حمید میاں کو ان کے والد نے قیام

افغانستان میں اپنے پاس بلا لیا. ان کو ایک خدمت گذار بیٹے کی ضرورت تھی. لگا تار محنت و مشقت نے ان کو بھی جسمانی طور پر کمزور کر دیا تھا.

حامد میاں کے ہاں ۱۹۳۴ میں پہلے بیٹے کی ولادت ہوئی نام عابداللہ غازی تجویز ہوا. حامد میاں اب مولانا حامدالانصاری غازی تھے اور مختلف اخباروں میں بحیثیت مدیر کام کر کے مستقل مدینہ بجنور میں مدیر اعلیٰ کے طور پر کام کر رہے تھے. زندگی میں حفصہ خاتون اب کسی قدر آرام سے تھیں. اگر چہ زندگی کی صعوبتوں اور لگا تار پریشانیوں نے ان کی صحت کمزور کر دی تھی. طویل دن رات میں بے یار و مددگار شکستہ دل خاتون مختلف امراض کے ساتھ جی رہی تھیں.

حفصہ خاتون کی اکلوتی بیٹی قدسیہ بی ذہین تھیں. حالات نے ان کو بے حد حساس بنا دیا تھا. انہوں نے ماں سے کہہ کر تعلیم حاصل کرنے کی خواہش ظاہر کی اور ماں کی اجازت سے کچھ نہ کچھ تعلیمی سلسلہ شروع ہو گیا. باقاعدہ تو کچھ نہیں تھا مگر ادب، تاریخ اور حکمت کو قدسیہ بی نے گہرائی سے جانا. وہ بہت اچھی ادیبہ اور شاعرہ بن گئیں. باپ کو بیٹی کے علمی ذوق کی خبر ملی تو انہیں قرول باغ دہلی میں حکیم اجمل خان کے طبیہ کالج میں داخل کرا دیا جہاں ہوسٹل میں رہ کر انہوں نے طب کے چار سالہ نصاب کی تکمیل کی اور اول آنے پر سنہری تمغہ حاصل کیا.

حفصہ خاتون کے شوہر نے اپنے حالات کے تحت افغانستان میں دوسری شادی کر کے اپنی جدو جہد میں علاقہ آزاد باجوڑ کی زہرہ بیگم کو شامل کر لیا.

لیکن پھر وہی مسئلہ آ گیا کہ وہ دور عورت کی شناخت کے سلسلے میں مخلص نہیں تھا. علم اور اسے بروئے کار لانے کا راستہ بند تھا. دل کے نہاں خانوں میں وہ بہت کچھ تھی، ظاہری طور پر کچھ نہیں. سن شعور کو پہنچی تو حفصہ خاتون نے اپنی بیٹی قدسیہ کی شادی کر دی. اولاد کے سلسلے میں ان کی ایک ذمہ داری یہ بھی تھی. قدسیہ بی ۱۹۳۲ کے لگ بھگ اپنی سسرالی خاندان اور شوہر کے ساتھ کوئٹہ (حال پاکستان) چلی گئیں. وہاں ۱۹۳۵ میں ایک شدید زلزلہ آیا. پورا

شہر دفن ہوگیا. قدسیہ بی، ان کے شوہر اور خاندان کے بہت سے افراد اس کی زد میں آ گئے. بڑے بھائی حامد میاں فوراً کوئٹہ کے لیے روانہ ہو گئے. دفن شدہ افراد میں قدسیہ بی نیم مردہ حالت میں ملی. خاندان کے کئی افراد جاں بحق ہو چکے تھے ان میں قدسیہ بی کے شوہر جمیل احمد بھی شامل تھے. بھائی اپنی بہن کو لے کر آ گئے. تین دن تک ملبہ میں دفن قدسیہ بی کو نکالا گیا. اب وہ ذہنی طور پر پراگندہ تھیں. زلزلے کی مہیب یادوں کے ساتھ مختلف کیفیات میں زندہ تھیں. ایک ایسا سانحہ تھا جس نے سب کی حالت دگرگوں کر دی.

ابھی اس صدمہ سے باہر نہیں نکلے تھے کہ حامد میاں کی بیگم میمونہ خاتون کا بعارضۂ سِل انتقال ہو گیا. ان کے بیٹے عابداللہ ابھی صرف ڈھائی سال کے تھے. حامد میاں کی زندگی پھر تنہائی کی نذر ہو گئی. ڈھائی سالہ بچّے کی ذمہ داری بھی اب ان ہی پر تھی. بوڑھی کمزور بیمار ماں کے لئے تو خود ہی کسی تیماردار کی ضرورت تھی. حامد میاں نے ماں کو دیو بند پہنچا دیا جہاں ایک بچہ ان کی خدمت کے لئے رکھ دیا گیا.

میں ۱۹۹۳-۱۹۹۴ کے لگ بھگ برادر بزرگ ڈاکٹر عابد اللہ غازی اور عزیزم سلمان منصور غازی اور ارشد منصور غازی کے ساتھ وطن مالوف انبہٹہ گئی جہاں وہ بچہ جو دادی اماں کی خدمت میں تھا اب بعمر ۸۲ سال انبہٹہ میں زندگی گزار رہا تھا. میرا مقصد انہی سے ملنا تھا. ان کے شکستہ حال گھر پہنچے تو ایک چار پائی پر رضائی اوڑھے ضعیفی کی تصویر بنے بیٹھے تھے.

تعارف ہوا تو ہم سب کے سروں پر شفقت سے ہاتھ پھیرا دعائیں دیں اور ماضی میں گم ہو گئے. میرے سوال پر جھکا ہوا سر اٹھایا اور بولے

> میری عمر اس وقت تیرہ سال کے قریب تھی. آپ کے والد نے اپنی ماں کی دیکھ بھال تیمارداری اور خدمت کے لئے مجھے مقرر کیا تھا. اماں (حفصہ خاتون) بہت کمزور لاغر اور شکستہ حال تھیں. اکثر دواؤں کے لئے بھی پیسے نہیں ہوتے تھے. شدید سردی تھی. میں ان کو گود میں اٹھا کر کمرے سے باہر صحن میں دھوپ

میں لٹا دیتا. دوپہر میں جو دال دلیہ مجھ سے بنتا وہ پکا کر ان کو کھلاتا اور خود بھی کھا لیتا. کبھی کبھار آنے والی رقم میں یہی ہو سکتا تھا. آپ کے والد خود بھی پریشان تھے. مدینہ اخبار میں معمولی سی تنخواہ اور دو گھروں کا خرچ. کوئٹہ کے زلزلے نے ان کی بہن کی ذمہ داری بھی ان ہی پر ڈال دی.

بات ختم کی تو ان بزرگ کی آنکھوں میں آنسو تھے جو میرے دل پر ٹپک رہے تھے

ان ہی دنوں عزیزوں میں سے ایک مشیر الزماں صدیقی صاحب تھے جن کی بیوی کا انتقال ہو گیا تھا اور دو بچے تھے. انہوں نے قدسیہ بی کا رشتہ دیا جسے منظور کر لیا گیا اور یوں قدسیہ بی کا گھر پھر آباد ہو گیا

کوئٹہ کے زلزلے نے جس ذہنی اختلال کا شکار بنایا تھا وہ اکثر دورے کی شکل میں ابھرتا. اور وہ ماضی میں پہنچ کر باتیں کرتیں جو عام طور پر لوگوں کے لئے لا یعنی اور مہمل ہوتیں.

دوسرے شوہر مشیر الزماں صدیقی کے دو بیٹے پہلی بیوی سے تھے مطیع الزماں اور فصیح الزماں. پھر دوسرے نکاح سے قدسیہ بی کے بھی ایک بیٹے تولد ہوئے نام وسیع الزماں رکھا گیا. ویسے وہ وصی الزماں کے نام سے معروف ہوئے. قدسیہ بی کو اپنے تینوں بیٹوں سے بے حد محبت اور تعلق تھا. بڑے دونوں بیٹے پاکستان چلے گئے تھے مگر دونوں نے اپنی ماں کی محبت کا حق ادا کیا. اور ان کی خدمت کرتے رہے. خود قدسیہ بی بھی ان کو اس طرح یاد کرتیں کہ وصی لزماں مسکرا کر فرماتے کہ اماں کو ان سے زیادۃ محبت ہے. ان بھائیوں نے وصی بھائی کو ان کی بیگم انور جہاں سمیت ایک بار پاکستان بھی بلایا. ماں کا انتقال ہو چکا تھا لیکن دونوں بھائیوں نے چھوٹے بھائی یعنی قدسیہ بی کے بیٹے اور بہو کی خاطر مدارت کی اور حق بزرگی نبھایا. حفصہ خاتون کا آخری زمانہ اپنی بیٹی قدسیہ بی کے ساتھ گزرا جو دوسری شادی کے بعد دیوبند میں مقیم تھیں.

حفصہ خاتون اپنے بڑے بیٹے حامد میاں کی پریشانیوں کی دیکھ رہی تھیں. اپنے عہد وفا کے مطابق کبھی لب کشائی نہیں کی مگر ان کہ بیٹی قدسیہ بی اکثر باپ کی خاموشی پر شکوہ کناں ہو جاتیں. ماں کی بے بسی بیماری تنہائی ان کو شاق گزرتی.

حفصہ خاتون کے لئے ۱۹۳۹ کا سال اہم تھا. انہوں نے اپنے بیٹے حامد میاں کی دوسری شادی کا ارادہ کیا اور شوہر سے رائے لے کر دیوبند کے باوقار مدرسہ دارالعلوم کے مہتمم مولانا قاری محمد طیبؒ کی منجھلی بیٹی ہاجرہ سے رشتہ دیا جسے بصد خلوص قبول کر لیا گیا اور حامد میاں کی شادی ہاجرہ بیگم سے ہوگئی جو مستقبل میں معروف ناول نگار ادیبہ مصنفہ ہاجرہ نازلی کے نام سے جانی گئیں. والد صاحب مولانا حامد انصاری غازی دہلی میں مقیم تھے اور ندوۃ المصنفین کی زیر سرپرستی اسلام کا نظام حکومت تصنیف کر رہے تھے. ہاجرہ نازلی ان کے ساتھ تھیں. اب حامد میاں نے اپنی ماں حفصہ خاتون اور بیٹے عابد اللہ کو دہلی بلا لیا تھا.

یہاں سے ان واقعات کا ذکر کروں جو میری والدہ ہاجرہ نازلی نے ہمیں سنائے.

حفصہ خاتون بہت کمزور ہوگئی تھیں. غذا کی کمی اور مستقل بیماری نے ان کی جسمانی طاقت کو تقریباً ختم کر دیا تھا. البتہ اب ان کو بیٹے کی قربت نے زندگی بخش توانائی کا احساس دے دیا تھا. جب ان کے بیٹے باہر جاتے وہ آواز دے کے بلاتی اور کہتی تھیں.

شام کو آؤ گے تو گھر کے لئے کباب لیتے آنا.

ہاں آجکل موسم کا پھل امرود ہے وہ بھی لانا.

کسی دن بلا کر کہتیں

حامد میاں پرانی دہلی کے خستہ بسکٹ مجھے پسند ہیں وہ لاؤ.

حامد میاں ان کی زیادہ تر خواہش پوری کر دیتے. برسوں کی ترسی ہوئی حس ذائقہ اب ذائقے مانگ رہی تھی. اگرچہ اب پیٹ ایسا نہیں تھا، نہ معدہ کو سہار تھی. لیکن ان کی فرمائشیں جاری رہتیں.

گھر کے نام پر ایک چار پائی ان کے زیر استعمال رہتی تھی .شوہر کے جانے کے بعد گھر کا تصور بکھر چکا تھا. جہاں آسرا ملا وہیں قیام کرلیا.اس لئے اپنا ضرورت کا سامان اپنی چار پائی پر رکھنے کا مزاج بن گیا. وہ اپنے دو جوڑے کپڑے، کنگھی، تیل، سرمہ دانی نماز کا دوپٹہ،سردی ہوئی تو سوئٹر،موزے،شال،سب اپنے سرہانے رکھتی تھیں.

عورت اپنی زندگی کو کس طرح قربان کردیتی ہے اس کی مثالیں ہمیں نظر آتی ہیں مگر معاشرے نے عورت کو وہ روائتی خربوزہ بنا دیا کہ وہ چھری پر گرے یا چھرے اس پر نقصان اسی کا ہوتا ہے.

ان کے بیٹے حامد میاں ان کا حتی المقدور خیال رکھتے تھے مگر برسوں کی صعوبتوں مشقتوں نے حفصہ خاتون کو دائم المریض بنا دیا تھا. حامد میاں کی دوسری بیگم ہاجرہ نازلی پہلی ولادت کے سلسے میں طویل مدت کے لئے دیوبند اپنے میکہ چلی گئیں.حفصہ خاتون اپنی بیٹی قدسیہ بی کے پاس پہنچا دی گئیں .اس سے قبل ان کے بیٹے بہو افغانستان بھی گئے تھے اور تین مہینے وہاں گزار کر آئے. حفصہ خاتون کے شوہر اور ان کی افغانی بیگم کے مہمان رہے.

شوہر کی ہجرت اور ہجر کی زندگی ان کے ساتھ تھی. وہ اپنا درد کس سے کہتیں اور سننے والا بھی کوئی نہیں تھا. ہر طرف صمٌ بکمٌ کا ماحول تھا.اور یوں جلد ہی ۱۹۴۰ میں وہ اپنے خالق حقیقی سے جا ملیں اور دیوبند کے قاسمی قبرستان میں شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے قدموں تلے آسودہ خواب ہوگئیں، جیسے زبان خاموش سے کہتی گئیں

کفن سرکاؤ میری بے زبانی دیکھتے جاؤ

عورتوں کے معاملہ میں ہمارے ہاں یہ افراط تفریط کا طرز فکر کیوں آیا اور کہاں سے آیا. جس سماج نے عورت کو مجبور و مقہور بنا کر اور پھر اسے عظیم کہہ کر ایک طویل اسیری دیدی، وہاں اس کا تڑپنا پھڑ پھڑانا کسی کو نظر نہیں آیا.ملک کو آزادی مردوں نے دلوائی ہے یا یہ ان عورتوں کی مسلسل قربانی و ایثار کی بدولت ملی ہے جو کل بھی پس پردہ تھیں اور آج بھی کوئی

ان سے واقف نہیں ہے.

میں نے صرف ایک حفصہ خاتون پر قلم اٹھایا ہے لیکن غور کیجیئے کہ ہزاروں خواتین اسی طرح چپ چاپ چلی گئیں. بہت کو میں جانتی ہوں. بہت سی گمنام ہی رہیں. تصور میں ان سب کو خراج عقیدت کے ساتھ سلام ورحمت پیش کر دیجئے کہ یہ ان کا حق اور ہمارا فرض ہے.

باب/ جہد ریشمی

عالم انتشار

بیوی حفصہ خاتون کی طرف سے تحریک میں شمولیت پر رضامندی ملنے کے بعد مولانا محمد میاں انصاری شیخ الہندؒ کے ساتھ اکبری جہاز سے مکہ معظّمہ روانہ ہوگئے.

ملک کے حالات دگرگوں اور انگریزوں کے مظالم مسلسل بڑھتے جا رہے تھے. بطور خاص اسلام اور مسلمانوں کی مذہبی وفکری آزادی کے لئے شیخ الہند اوران کا منصوبہ ہندستان کے ساتھ عالم اسلام کا احاطہ کرتا تھا. دراصل یہ منصوبہ ہندستان کو اس عالم اسلام کا حلیف بنانے کے لئے تھا جسے یورپی تسلط اور غلامی سے آزادی کے بعد دنیا میں معاشرتی اور معاشی عدل اور انسانی مساوات پر مبنی سیاست کا ایک تازہ نظام قائم کرنا تھا تاکہ دنیا کو دوسوسالہ دکھوں سے نجات حاصل ہو.

شیخ الہند کی تحریک کے صف اول کے رفقاء کو احساس تھا کہ خلافت اسلامیہ کی حیثیت سے سلطنت عثمانیہ ترکی بھی یورپی، خصوصا برطانوی اور روسی سازشوں اور یورشوں کا شکار تھی. سلطان اعظم عبدالحمید خاں ثانی ۲۷ اپریل ۱۹۰۹ کے دن جبری اور سازشی معزولی تک بڑی پامردی سے ان سنگین حالات کا مقابلہ کررہے تھے. شیخ الہند کی تحریک اس معاملہ میں ترکی کی مددگار تھی. اس تحریک کا نقطۂ نظر تھا کہ بطور خلافت سلطنت عثمانیہ اسلامی اتحاد کا قلعہ تھی اور اس کی بقاوتحفّظ کی خاطر تمام عالم کے مسلمانوں کو انگریزوں اور دیگر یورپی عیسائی طاقتوں کے خلاف سینہ سپر کردیا جائے تاکہ انگریز دفاعی پوزیشن میں آجائیں. اس طریقہ پر ہندستان میں بھی اس کا تسلّط کمزور ہوگا اور ترکی کی خلافت کو اس سے کمک پہنچے گی.

سلطان عبدالحمید خان ثانی کی معزولی اور یونان میں جلاوطنی کے بعد ان کے

بھائی محمد خامس رشاد ان کے جانشین ہوئے. اگرچہ سلطان عبدالحمید کے بعد سلطنت عثمانیہ یورپی اور انگریزی خواہشات کے عین مطابق نہایت کمزور ہوچکی تھی اور اسی دفاعی اور حربی کمزوری کے ساتھ پہلی جنگ عظیم کا دکھ جھیل رہی تھی مگر بہر حال امت کی امیدوں کے سورج کا مطلع وہی تھی اور شیخ الہند کی تحریک اسے حتی الامکان کمک پہنچانے کے لئے کوشاں تھی. شیخ الہند کے سیاسی شاگرد مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی جوہر کی خلافت تحریک کی غایت وجود اور مقصد ومنشا بھی یہی حکمت تھی.

اس مقصد کے لئے شیخ الہند کا منصوبہ تھا کہ خلافت عثمانیہ کے والی حجاز غالب پاشا کے واسطے سے سلطان ترکی محمد خامس رشاد کا ایک فرمان شاہ افغانستان امیر حبیب اللہ خان نیز افغان اور آزاد سرحدی قبائلی اور ترکستانی سرداروں کے نام حاصل کیا جائے کہ افغان قوم وقبائل، ترکستانی عوام انگریزوں کے خلاف متحد ہوکر شیخ الہند کی تحریک آزادی کا حصہ بنیں.

شیخ الہند کے سفر حج میں ہم رکاب راز دار شاگردوں میں مولانا محمد میاں بھی تھے. حجاز میں قیام کے دوران غالب پاشا کے علاوہ سلطنت عثمانیہ کے وزیر جنگ انور پاشا سے بھی ملاقاتیں ہوئیں اور پایۂ تخت استنبول سے خلیفۃ المسلمین کی منظوری آنے کے بعد ان کا فرمان غالب پاشا نے تحریر کیا جو دستاویزوں میں غالب نامہ اور ریشمی رومال کے نام سے معروف ہے. آگے منصوبہ یہ تھا کہ غالب نامہ کی نقلیں عام مسلمانوں اور افغانستان اور ترکستان کے عوام تک پہنچا کر افغانستان میں جہاد کا مرکز قائم کیا جائے جو بیرونی طور پر محاذ آرا ہوکر انگریزوں کو کمزور کرنے کی کوشش کرے اور اندورنِ ہندتحریک آزادی میں سرگرداں جماعتیں متحد ہوکر انگریزوں کو ملک بدر کردیں. افغانستان کے آزاد قبائل میں شیخ الہند کے شاگردوں کی جماعت عوام وخواص پر اپنا اثر رکھتی تھی. اس لئے غالب نامہ کو وہاں پہنچا کر شیخ الہند کے شاگردوں کے ذریعہ انگریز مخالف ماحول تیار کرنے کی ذمہ داری مولانا محمد میاں منصور انصاری کو سونپی گئی. مولانا عبیداللہ سندھی وہاں اس کام کے لئے زمین ہموار

کر رہے تھے. یہ ۱۹۱۵ کی بات ہے. مولانا محمد میاں نے حج کے بعد چند ماہ شیخ الہند کے ساتھ حجازِ مقدس میں گزارے اور آخر غالب نامہ لے کر افغانستان جانے کے ارادہ سے ہندستان واپس آئے. برطانیہ کی دیسی پولس ان کے تعاقب میں تھی مگر وہ دل جمعی کے ساتھ اپنی راہ پر گامزن رہے. بمبئی سے وہ دیوبند اور انبہٹہ آئے. دہلی میں تحریک شیخ الہند سے متعلق ایک مسلمان فوٹوگرافر سے غالب نامہ کے تصویری نقلیں بنوائیں اور انہیں تقسیم کرتے ہوئے بالآخر پنجاب، سندھ اور سرحد کے صبر آزما سفر کے بعد قبائل آزاد یاغستان پہنچ گئے.

غالب نامہ

غالب نامہ ریشمی رومال پر کشید کیا گیا وہ خط تھا جو اس تحریک آزادی کا عنوان بنا. یہ خط دستاویزوں میں موجود ہے.

قائم مقام (نمائندہ) اعلیٰ حضرت خلیفۂ رسول رب العالمین، امیر المومنین دام اقبالہ

یہ بات کسی پر مخفی نہیں ہے کہ جنگِ عمومی (پہلی عالمی جنگ) گزشتہ ایک سال سے ترکی کی اسلامی حکومت کا رخ کئے ہوئے ہے. روس، فرانس اور انگریز (دشمنانِ اسلام) ممالک عثمانیہ پر بری و بحری حملے کر رہے ہیں. اس صورتِ حال کے پیش نظر حضرت امیر المومنین وخلیفۃ المسلمین نے محض اللہ کی نصرت اور خاتم الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام کی روحانی طاقت کے بھروسہ پر جہاد مقدس کا اعلان کر دیا ہے جس کے جواب میں ایشیا، یورپ اور افریقہ کے مسلمانوں نے لبیک کہا ہے، اور ہر قسم کے ہتھیاروں سے لیس ہو کر میدانِ جنگ میں کود پڑے ہیں. اللہ کا شکر ہے کہ ترک فوج اور مجاہدین کی تعداد دشمنانِ اسلام کی تعداد سے بڑھ گئی ہے اور انہوں نے دشمنوں کی قوت کو مادی اور اخلاقی طور پر کمزور کر دیا ہے.

چنانچہ روسیوں کی فوج کا ایک بڑا حصہ قفقازیہ میں تباہ کر دیا گیا ہے اور ایک لاکھ برطانوی اور فرانسیسی فوجی اور ان کے جنگی جہاز درۂ دانیال اور دوسرے مقامات پر برباد کر دیئے گئے ہیں. ترکوں، جرمنوں اور آسٹرویوں نے مشرق میں روسیوں کو اور مغرب میں فرانسیسیوں اور بلجیکیوں کو پیچھے دھکیل دیا ہے. ایک تہائی روسی اور فرانسیسی علاقے اور سارے بلجیم اور لاکھوں رائفلوں، بندوقوں اور دوسرے سامانِ جنگ پر قبضہ کر لیا ہے اور ہزاروں

فوجیوں کو قیدی بنالیا ہے. اب بلغاریہ بھی مرکزی قوتوں کے ساتھ شریک ہو کر جنگ میں شامل ہوگیا ہے ور اُس نے سربیا کے علاقہ میں اندر تک گھس کر وہاں کے لوگوں کو شکست فاش دے دی ہے. اس لیے میرا یہ پیغام میرے سلام کے ساتھ ان مسلمانوں کو پہنچا دیا جائے جو ان حکومتوں کی غلامی میں ہیں کہ اب وہ مکمل طور پر شکست کھا چکی ہیں، اور اب بالکل لاچار و بے یار و مددگار ہیں اور ان کے یعنی مسلمانوں کے سامنے جس قوت و طاقت کا مظاہرہ کیا جارہا ہے وہ محض خیالی ہے.

مسلمانو! آج تمہاری نجات کا دن ہے. اس لیے اب اپنی ذلت و خواری اور اپنی غلامی پر راضی و قانع نہ رہو. بلا شبہ آزادی، کامیابی، فتح و نصرت تمہارے ساتھ ہے. اب خواب غفلت سے بیدار ہو اور متحد ہو کر اپنے اندر تنظیم و اتحاد پیدا کرو، اپنی صفوں کو درست کرو اور اپنے آپ کو ان چیزوں سے لیس کرو جو تمہارے لیے ضروری اور کافی ہوں اور پھر اس ظالم و جابر عیسائی حکومت کے خلاف اٹھ کھڑے ہو، جس کی غلامی کا کمزور طوق تمہاری گردنوں میں پڑا ہوا ہے. اس زنجیر غلامی کو اپنے مذہب کی طاقت اور دین کی تیز دھار سے کاٹ ڈالو. اس طرح اپنے وجود اور انسانی آزادی کے حقوق حاصل کرلو. ہم انشاء اللہ عنقریب مکمل فتح اور کامیابی کے بعد معاہدے کریں گے تو تمہارے حقوق کی پوری طرح حفاظت و مدافعت کریں گے.

اس لیے اب جلدی کرو اور پختہ عزم و ارادہ کے ساتھ دشمن کا گلا گھونٹ کر اسے موت کے منہ میں پہنچادو، اور اس سے دشمنی کا مظاہرہ کرو. ہم تمہاری طرف بھروسے اور اعتماد کی نظر سے دیکھتے ہیں اس لیے یہ اچھا موقع ہاتھ سے نہ جانے دو. بد دل نہ ہو اور خداوند بزرگ و برتر سے دلی مراد پوری ہونے کی امید رکھو.

تمہیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ مولانا محمود الحسن صاحب جو پہلے دیوبند کے مدرسہ میں تھے ہمارے پاس آئے اور ہم سے مشورہ طلب کیا. ہم اس بارہ میں ان سے متفق

ہیں اور ان کو ضروری ہدایات دے دی ہیں. ان پر اعتماد کرو. اگر وہ تمہارے پاس آئیں تو روپیہ سے، آدمیوں سے اور جس چیز کی انہیں ضرورت ہو اس چیز سے ان کی مدد کرو.

(دستخط) غالب (پاشا)

والئی حجاز

یہ تاریخی دستاویز ڈاکٹر عابد اللہ غازی نے ۱۹۶۴ میں لندن میوزیم میں ریشمی خطوط پر دیکھی، پھر افغانستان جا کر مولانا محمد میاں منصور انصاری کے ذاتی کاغذات سے اس کی اصل حاصل کی. آخر میں برطانیہ کے محافظ خانہ (انڈیا آفس لائبریری) میں کئی ماہ تحریک ریشمی رومال پر تحقیق کے دوران دیگر دستاویزوں کے ساتھ اس کی اس کی نقل حاصل کی. یہ دستاویز ان کے پاس محفوظ ہے.

مہم در مہم

مولانا محمد میاں منصور انصاری غالب نامہ لے کر ہندستان واپس آئے. بمبئی، سورت، راندیر ہوتے ہوئے دہلی آئے. دہلی میں مرزا احمد علی فوٹوگرافر سے غالب نامہ کی کاپیاں خفیہ طریقہ سے کرائیں اور پھر انبہٹہ پہنچے تو معتبر ذرائع سے معلوم ہوا کہ خفیہ پولیس ان کی تلاش میں ہے. چنانچہ انبہٹہ میں چند گھنٹہ قیام کر کے رات کے آخری پہر میں دیوبند کے لیے نکل گئے، اور وہاں سے میرٹھ، بڑوت ہوتے ہوئے پنجاب میں داخل ہوگئے. دیسی خفیہ پولس ان کے تعاقب میں رہی لیکن وہ اللہ کی مدد اور نصرت پر بھروسہ کرتے ہوئے انتہائی ہوشیاری سے لاہور پہنچ گئے جہاں انقلابی منصوبہ کے مطابق مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا حسرت موہانی کو ان کے ساتھ افغانستان جانا تھا. شبہات کی بناء پر برطانوی خفیہ محکمہ بے حد متحرک ہوگیا تھا. سخت نگرانی کے باعث مولانا آزاد اور مولانا حسرت موہانی مقررہ وقت پر متعینہ مقام پر نہیں پہنچے تو مولانا محمد میاں نے انتظار کرنا مناسب نہیں سمجھا اور تنہا اس تحریک کو انجام دینے کا فیصلہ کر کے سفر کے اگلے مرحلہ پر روانہ ہوئے اور پشاور پہنچ گئے جہاں شیخ الہندؒ کے ایک شاگرد اور تحریک کے رکن مولانا عبدالرحیم پوپلزئی مدد کے لیے تیار تھے.

مولانا محمد میاں کو انگریزوں کے دیسی جاسوسوں کا اندیشہ لگا ہوا تھا. جاسوسوں کی توجہ ہٹانے کے لئے مولانا عبدالرحیم پوپلزئی نے انہیں ایک ایسی دیوار میں چھپا دیا جو اندر سے خالی تھی، اور ہوا اور کھانا پہنچانے کے لیے اوپر خفیہ سوراخ تھے. مولانا محمد میاں اس دیوار میں تین روز تک چھپے رہے، تیسرے روز ان کو قریب کے مکان میں پہنچا دیا گیا. خفیہ پولیس مستقل ان کے تعاقب میں تھی اور ان کی گرفتاری کی تدابیر کر رہی تھی لیکن اللہ تعالیٰ ان کا

محافظ تھا. چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس خوبی سے نکالا کہ کسی کو وہم وگمان بھی نہیں ہوا.

رات کی تاریکی میں افغان قبائلیوں کے بھیس میں انہیں رسّوں کے ذریعہ شہر پناہ کی دیوار پر چڑھا کر دوسری طرف اتار دیا گیا.اور وہ سرحد آزاد کی طرف روانہ ہو گئے.اس علاقہ میں پشتو بولی جاتی تھی اوراس وقت مولانا منصورانصاری پشتو نہیں جانتے تھے. چنانچہ وہ گونگے کے طور پر سفر کرتے رہے اوراشاروں کی زبان میں رہبری حاصل کرتے رہے. مولانا عبدالرحیم پوپلزئی کے آدمی جگہ جگہ ان کے ساتھ معاونت کرتے رہے انہیں اس طریقہ پر راستہ بتاتے رہے کہ کسی کو کوئی شبہ بھی نہ ہو.اس سلسلہ میں پہلے سے مولانا انصاری کی مدد کے لئے مولانا عبدالرحیم اپوپلزئی کے آدمیوں کو خفیہ کلمات سکھا دیئے گئے تھے جن کی مدد سے اور مولانا محمد میاں انصاری ان افراد کو اور وہ مولانا محمد میاں انصاری کو پہچان جاتے تھے.اس طرح وہ آزاد قبائلی علاقہ یاغستان پہنچ گئے.

مولانا محمد میاں کے صاحبزادہ مولانا حامدالانصاری غازی کی ایک مختلف تقریری روایت محمد طارق غازی کے واسطہ سے یہ ہے کہ مولانا آزاداورحسرت موہانی کو بمبئی میں ان سے ملنا تھااور وہ دونوں وہاں نہ پہنچے تو مولانا محمد میاں تنہا سورت،راندیراورسندھ کے راستہ سے صوبہ سرحد(موجودہ پختون خوا) کے لئے روانہ ہو گئے.درمیان راہ سندھ میں آچاریہ کرپلانی کے بڑے بھائی شیخ عبدالرحیم سندھی کے پاس قیام کیا جنہوں نے مولانا محمد میاں کو روپوش کرنے کے لئے کمرہ کی دیوار کے متوازی ایک نئی دیوار اٹھادی.ان دو دیواروں کے بیچ مولانا محمد میاں تین دن روپوش رہے.چھت پر خفیہ سوراخ سے رات کے پچھلے پہر کھانا اور پانی نیچے اتار دیا جاتا تھا.تین دن بعد پولس کو کسی اور سمت متوجہ کر دیا گیا اورایک رات کی تاریکی میں مولانا محمد میاں کو باہر نکالا گیا.جان ہتھیلی پر لئے وہ اپنی مہم کے آئندہ مرحلہ پر روانہ ہو گئے اور یاغستان میں مولانا عبدالرحیم پوپلزئی کے پاس پہنچ گئے.

مولانا غازی کی اس تقریری روایت کے مطابق زبان کا مسئلہ پیدا ہوا.مولانا محمد

میاں تب پشتو نہیں جانتے تھے. چنانچہ مولانا عبدالرحیم پوپلزئی نے اپنے ایک خادم کو قبائلی رئیس کا بہروپ دیا. گھوڑے پر سوار اس نقلی سردار نے ظاہر کیا کہ وہ افغانستان میں مزار شریف کی زیارت کے لئے جا رہا ہے. سارے راستہ مولانا محمد میاں گونگے خادم کے طور پر اس کے گھوڑے کے پیچھے دوڑتے رہے یہاں تک کہ افغانستان پہنچ گئے.

مولانا حسرت موہانی اور مولانا ابوالکلام آزاد کے بارے میں مولانا محمد میاں منصور انصاری کی رائے بدل گئی تھی. شیخ الہند کے نام ایک خط میں انہوں نے لکھا تھا کہ ان دونوں سے ان کی ملاقات ضرور ہوئی تھی مگر وہ دونوں ساتھ دینے پر آمادہ نہیں تھے اور اسی لئے مولانا محمد میاں انصاری نے انہیں ان کے حال پر چھوڑ کر تن تنہا اگلی مہم پر جانے کا فیصلہ کر لیا. محمد طارق غازی کا خیال ہے کہ ممکن ہے اسی وجہ سے علماء، بالخصوص مولانا معین الدین اجمیری، نے ۱۹۲۰ میں مولانا ابوالکلام آزاد کو علماء کی تحریک آزادی کا قائد اول تسلیم کرنے سے انکار کیا ہو. مزید وضاحت کرتے ہوئے اپنے دادا پر سوانحی مقالہ میں وہ لکھتے ہیں:

> میرے خیال میں اس نکتہ کا ایک پہلو اور ہے کہ ممکن ہے مولانا آزاد اور مولانا حسرت موہانی ہندستان میں رہتے ہوئے آزادی کے لئے کام کرنے کا عزم رکھتے ہوں اور بیرون ملک سے کسی مادی یا فوجی مدد کے موثر ہونے کا اطمینان انہیں نہ ہو. اگر یہی ان کا نقطۂ نظر تھا تو تاریخ نے اس کی تصدیق بھی کی کہ جب افغانستان کے امیر امان اللہ خان نے مولانا محمد میاں منصور انصاری کے اصرار پر ہندستان پر حملہ کیا اور افغان فوجیں اور جنود ربانیہ کے مجاہدین پنجاب تک پہنچ گئے تو امان اللہ خان کی نیت بدل گئی اور اس نے راولپنڈی معاہدہ (۱۹۱۹) کے تحت انگریزوں سے افغانستان کی آزادی کی منظوری تو حاصل کر لی، مگر خود ہندستان کی آزادی اور جنود ربانیہ کی عملی تائید سے حاصل ہونے والے سیاسی فائدہ کو قطعی نظر انداز کر دیا.

صبر آزما مرحلے

مولانا محمد میاں یاغستان میں رجب۱۳۳۴ھ/مئی ۱۹۱۶ میں داخل ہوئے. اپنے ایک خط میں سردار عبدالہادی خاں کو انہوں نے اپنے یاغستان میں داخل ہونے کا سبب اور زمانہ تحریر فرمایا ہے. عبدالہادی خاں ایک افغان سفارت کار تھے. ان کے بارے میں زیادہ تفصیل کا علم نہیں تاہم اندازہ کہ وہ افغانستان کے کسی قبیلہ کے سردار تھے. مولانا محمد میاں نے یہ خط غالباً ۱۳۴۰ھ (۱۹۲۲-۱۹۲۳) میں لکھا تھا. یہ خط فارسی میں ہے. اس پر کوئی تاریخ نہیں ہے. اوپر لفظ ''اللہ'' لکھا ہوا ہے جو مولانا محمد میاں کے خطوط کی شناخت ہے. خط نامکمل ہے، یا تو اس کے بقیہ صفحات نہیں پائے گئے یا مولانا محمد میاں ہی نے اسے نامکمل چھوڑ دیا تھا. تاہم یہ نامکمل خط بھی معلوماتی ہے.

''اللہ''

محمد بن عبداللہ انصاری (منصور) عفا عنہ کی طرف سے

بخدمت مبارک جناب جلال مآب محترم آقائے عبدالہادی خاں صاحب زادمجدہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ.

مکتوبِ گرامی پہنچا. خیریت معلوم ہوئی. جناب نواب صاحب کی طرف سے سرحد پر تبلیغی کام کی تفصیلی حالت معلوم نہیں ہو سکی. محترم جناب برادر ایمانی سردار عبدالرسول خاں صاحب کی جانب سے ایک عنایت نامہ آیا تھا. اس میں اخوتِ ایمانی قوانین کے انتظار کی طرف اشارہ ہے. کثرتِ کار کی بنا پر غالباً انہیں قوانین ترتیب دینے کا موقع نہیں ملا. سردار صاحب موصوف کو انتظار میں ڈال رکھا ہے.

سردار صاحب نے لکھا تھا کہ (سابق ترک عثمانی وزیر جنگ) غازی انور پاشا کی بخارا آمد کی بنا پر فرغانہ اور بخارا کے بعض واقعات کی وجہ سے اس وقت یہاں کی سیاست دگرگوں ہے. اسی باعث بندہ کو تبادلۂ خیالات کے لیے طلب کیا ہے. بندہ کا بھی ارادہ ہے کہ ایک دو روز کے لیے بخارا جاؤں اور پھر انقرہ کے لیے روانہ ہو جاؤں گا ان شاء اللہ تعالیٰ.

اس مکتوب میں ارادہ ہے کہ یاغستان کے بارے میں اپنے خیالات عرض کروں. یاغستان سے میں ۱۳۳۶ھ (۱۹۱۷ کے اواخر یا ۱۹۱۸) میں) میں آیا تھا. یقین ہے کہ بندہ کے بعض خیالات ۱۳۴۰ھ (۱۹۲۱ یا ۱۹۲۲) کے مناسب نہیں ہوں گے. یہ بھی لازمی ہے کہ افغانستان کے آزادی پسند غازیوں نے ان چند سالوں میں یاغستان کی اصلاح کی بہت سی کوششیں کی ہوں گی. تاہم قدیم خیالات کے اظہار کو بھی میں فائدہ سے خالی نہیں سمجھتا. خذ ما صفا.

میں رجب ۱۳۳۴ھ (مئی ۱۹۱۶) میں یاغستان میں داخل ہوا. یہاں سے چار مہینہ کابل میں. پھر باقی مہمند، باجوڑ، سوات میں پھرتا رہا. نواب دیر سے خط و کتابت تھی. دو مرتبہ ملاقات بھی ہوئی. یاغستان سے میری مراد یہی علاقہ (مہمند سے سوات تک) ہے.

چونکہ بندہ کو حضرت مولانا شیخ الہند قدس سرہٗ نے مدینہ سے عمومی جنگ (جنگِ عظیم اوّل) کے دوران مامور کر کے بھیجا تھا، ایک فرمان عالی (ترک عثمانی والی حجاز) غالب پاشا سے مسلمانانِ عالم کے نام تحریر کرا کے مجھے سپرد کیا تھا. اس میں خلافت اسلامیہ کی طرف نفیر عام تھی. جنگِ عظیم کے زمانہ میں سلطنت عثمانیہ نے غالب پاشا کو اختیارات کلی دے دیئے تھے کیونکہ مکہ معظّمہ مرکز اسلام ہے. امید تھی کہ غیور مسلمان یہاں جمع ہوں گے. اسی بناء پر حضرت مولانا شیخ الہند نے بندہ کے ذمہ فریضہ مقرر فرمایا کہ عالم اسلام کی قوی ترین جگہ ہماری دسترس ہونی چاہیے اور وہ افغانستان ہے.

☆

ان سطور کے ساتھ یہ خط ختم ہو گیا. اس کے بعد کچھ نہیں لکھا نہ ہی مرسل کا نام ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خط کسی وجہ سے نامکمل رہ گیا یا دانستہ ادھورا چھوڑا گیا تا کہ خفیہ پولیس کے ہاتھ لگے بھی تو کم سے کم نقصان پہنچے لیکن اس نامکمل خط سے بھی کئی امور پر روشنی پڑتی ہے.

۱- مولانا محمد میاں انصاری رجب ۱۳۳۴ھ/ مئی ۱۹۱۶ میں یاغستان گئے تھے. اس طریقہ پر یہ سفر جو مدینہ منورہ سے غالب نامہ لے کر ہندستان، یاغستان اور افغانستان کے علاقوں کے لیے ۱۹۱۵ کے اخیر میں شروع ہوا تھا بے انتہا مصائب، دقتوں، پریشانیوں اور صبر آزما مراحل طے کرنے کے بعد چھ سات ماہ بعد مئی ۱۹۱۶ میں یاغستان پہنچ کر اختتام پذیر ہوا. جس کا مقصد غالب پاشا کے فرمان کو مسلمانانِ عالم میں تقسیم کر کے انہیں خلافتِ اسلامیہ کی حمایت کے لیے آمادہ کرنا اور اس کی دشمن قوتوں بالخصوص انگریزوں کے مدمقابل اس علاقہ کے مسلمانوں کو تیار کرنا تھا.

۲- مولانا محمد میاں انصاری یاغستان میں چار مہینہ تک فضا ہموار کرتے رہے. عوام کو انگریزوں کے خلاف مہم پر آمادہ کرتے رہے. جب انہوں نے دیکھا کہ ان کی تحریک پر وہاں کے عوام آزادی ہند کے لیے تیار ہو گئے ہیں تو انہوں نے اگلی منزل کابل کی جانب کوچ کیا، اور پھر وہاں سے باجوڑ، مہمند اور سوات واپس آ گئے. اس اثناء میں انہوں نے نواب دیر سے خط و کتابت جاری رکھی. دو مرتبہ ان سے ملاقات بھی کی.

۳- شیخ الہند، مولانا محمد میاں اور ان کے بڑے رفقاء اس حقیقت سے واقف تھے کہ خلافتِ اسلامیہ کو عالم اسلام میں مسلمانوں کے کسی مضبوط اور قوی مرکز ہی سے کمک مل سکتی تھی اور سیاسی وجغرافیائی صورت حال کی بناء پر اس پرآشوب زمانہ میں افغانستان ہی وہ جگہ تھی. بیسویں صدی کے آغاز میں جاوا اور سماترا اور ملایا سے جزیرۃ العرب، مصر، سودان، طرابلس الغرب (موجودہ لبیا)، الجزائر اور مراکش تک عالم اسلام تمام

کا تمام انگریزوں اور دیگر یورپی طاقتوں کے تسلط میں تھا۔اس وقت فقط افغانستان ہی یورپی دسترس سے آزاد تھا۔دوسری اہم وجہ یہ تھی کہ عالم اسلام میں افغانستان سے ہندستان کی سرحد ملتی تھی اور وہاں سے ہندستان کی تحریک آزادی برپا کی جاسکتی تھی۔قیاس تھا کہ افغانوں کو تیار کرنے سے جہاں ایک طرف خلافت اسلامیہ کو کمک ملتی وہیں ترکوں کے سب سے شاطر حریف انگریزوں کی حربی اور سیاسی پریشانی میں اضافہ ہوتا۔مشترکہ سرحد سے ایک طرف ہندستانی اور افغان افواج برطانوی حکومت ہند پر حملہ کرتیں اور دوسری جانب اندرون ملک عام شورش برپا ہوجاتی تو انگریزوں کی پسپائی اور شکست انہیں ہندستان سے راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور کرتی اور آزادی کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوجاتا۔

یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا۔اس کے کئی اسباب تھے۔عالم اسلام برطانوی اور یورپی استعمار کا راست یا واسطہ دار شکار تھا۔برطانوی جاسوس مس گرٹروڈ بیل (Gertrude Bell) اور کیپٹن ولیم شیکسپیر (Capt. William Shakespeare) کے زیر اثر انگریزوں کی حمایت میں نجد کے ابن سعود کی ترک دشمنی، دوسری جانب حجاز میں بدنام زمانہ برطانوی جاسوس ٹی۔ای۔لارنس (T E Lawrence) کی شہ پر اپنی ولی نعمت سلطنت عثمانیہ کے خلاف مکہ کے شریف حسین کی بغاوت، تیسری جانب تحریک شیخ الہند کے اندر چند غداروں کی موجودگی، حجاز مقدس میں شیخ الہند کی گرفتاری، اور اندرون ہند تحریک کی قیادت کے فقدان کی وجہ سے عوامی بے دلی کے نتیجہ میں آزادی کا قافلہ ایک بار پھر بکھر گیا۔

گزشتہ صدی کے دوسرے اور تیسرے عشروں میں ہندستانی عوام کی بے دلی کے کئی اسباب تھے۔اول تو یہ کہ اگرچہ شیخ الہند نے ملک کے خواص کو اعتماد لے لیا تھا اور ایک درجہ میں انہیں تحریک سے وابستہ بھی کرلیا تھا مگر چونکہ تحریک انتہائی درجہ میں خفیہ رکھی گئی تھی اس لئے عام ہندستانی اس کی قیادت، مقاصد، لائحۂ عمل اور اقدامی منصوبے سے قطعی لاعلم تھے۔اس لئے عوام میں اس تحریک سے ہمدردی مفقود تھی اور جب اس قوت کی ضرورت پڑی تو وہ وہاں موجود ہی نہیں تھی۔

دوسرے یہ کہ اس وقت ظاہری قومی سیاست کی قیادتیں انگریزوں سے مفاہمت اور تعاون کو مکمل آزادی پر ترجیح دیتی تھیں. اس سیاست نے عوامی مزاج بھی ویسا ہی بنایا تھا.

تاہم آزاد قبائلی علاقوں میں مولانا محمد میاں کی ان تھک جدوجہد سے تحریک کی کامیابی کے آثار ابھی امیدیں باندھ رہے تھے. انہوں نے یاغستان میں جگہ جگہ گھوم کر مہمند اور وزیرہ قبائل کے چالیس ہزار مجاہدین کا لشکر تیار کر لیا. حاجی صاحب ترنگ زئی نے اپنے مجاہدین کے لشکر اور چمرقند کے مجاہدین کو بھی اس لشکر میں شامل کر کے انگریزوں کے مقابلے کے لئے ایک عظیم فوج تیار کر لی تھی. اس فوج نے ۱۹۱۹ میں برطانوی محروسہ ہندستانی علاقہ پر حملہ بھی کیا اور جنگ میں اسے خاصی کامیابی بھی ہوئی مگر پھر یہ مہم زیادہ دیر جاری نہ رہ سکی.

اس یورش سے پہلے مولانا عبیداللہ سندھیؒ کابل کی فضا ہموار کر رہے تھے. مولانا محمد میاں انصاری نے وہاں اس مہم کو اور تیز کر دیا. انہوں نے امیر حبیب اللہ خاں سے راہ و رسم پیدا کی. انہیں اپنی افغانستان آمد کے مقاصد سے آگاہ کیا اور غالب نامہ کی نقل پیش کی. امیر نے ان کا خیر مقدم کیا اور سلطان ترکی کے ریشمی فرامین وصول کئے لیکن وہ ۱۹۰۵ میں برطانوی حکومت ہند کے ساتھ دوستی کا معاہدہ کر چکے تھے اور ۱۹۰۷ میں دورۂ ہند کے موقعہ پر نہ صرف انگریزوں کے ساتھ مفاہمت کا رویہ اختیار کر چکے تھے (نورالحسن راشد کاندھلوی. مرج البحرین ۱۵۳) بلکہ دہلی میں مقیم اعلی انگریز افسروں کی ایما پر انہوں نے خفیہ صہیونی فری میسن لاج کی رکنیت بھی قبول کر لی تھی (ہنری میک میہن. این اکاؤنٹ آف دی انٹری آف ایچ ایم حبیب اللہ خان امیر آف افغانستان انٹو فری میسنری. فاویل پریس. لندن. ۱۹۳۹). یوں امیر حبیب اللہ پوری طرح برطانیہ کے نرغہ میں آگئے تھے. انہی اسباب سے پہلی عالمی جنگ (۱۹۱۴-۱۹۱۸) میں سلطنت عثمانیہ کی کوششوں کے باوجود امیر حبیب اللہ نے اسلامی اتحاد پر انگریزوں کے حق میں غیر جانبداری کو ترجیح دی تھی.

افغانستان کی یہ سیاسی صورت حال نہ تو ریشمی رومال تحریک آزادی کے حق میں تھی

اور نہ حربی اور سیاسی طور پر سلطنت عثمانیہ کے لئے مفید تھی. ان دونوں محاذوں پر امت کو ہزیمت اٹھانی پڑی. بے شک انگریز سیاست نہ صرف ان دومحاذوں پرموثر تھی بلکہ خود سلطنت عثمانیہ کی تباہی اور عرب علاقوں سے اس کا خاتمہ بھی یورپی، روسی، خصوصا برطانوی، سیاست ہی کا شاخسانہ تھا. مگر ان تمام محاذوں پر خود مسلمانوں کا دامن زیادہ داغدار ہے. اور مسلم دنیا آج تک اس کے اثرات بھگت رہی ہے.

اسی اثنا میں تحریک کے ایک نومسلم معتمد، عبدالحق، سابق جیون داس ولد لورندا داس، اور اس کے سابق ولی نعمت ملتان کے جاگیردار رب نواز نے تحریک آزادی کے تمام راز ملتان کے انگریز کمشنر کے حوالہ کردئے. برطانوی راج کے نزدیک سب سے بڑا خطرہ مولانا محمد میاں کا وجود تھا. جس طرح مکہ کے شریف حسین کو استعمال کر کے انگریزوں نے شیخ الہند کو گرفتار کی تھا اسی طرح ہند کی برطانوی حکومت نے امیر حبیب اللہ خاں پر دباؤ ڈالا کہ وہ مولانا محمد میاں منصور انصاری کو گرفتار کر کے انگریزوں کے حوالہ کردیں.

مکہ کے شریف حسین کی طرح افغانستان کے امیر حبیب اللہ خاں بھی انگریزوں کے دباؤ کے آگے جھک گئے اور مولانا منصور انصاری کو انگریزوں کے سپرد کرنے کے لیے تیار ہو گئے جنہوں نے ان کے سر پر ۲۵ ہزار روپے کا انعام رکھا تھا لیکن یہ بات افغانوں کی عوامی غیرت وحمیت کے خلاف تھی چنانچہ نائب امیر السلطنت صدر اعظم سردار نصر اللہ خاں نے اپنے ذرائع سے مولانا منصور انصاری کو بروقت مطلع کردیا اور افغانستان سے نکل جانے میں ان کی مدد کی اور ایک نبی کی سنت پر عمل کا ثواب حاصل کیا..

اِنَّ الْمَلَاَ یَاْتَمِرُوْنَ بِكَ لِیَقْتُلُوْكَ فَاخْرُجْ اِنِّیْ لَكَ مِنَ النّٰصِحِیْنَ

(القرآن. القصص ۲۸:۲۰)

اہل دربار کہتے ہیں کہ آپ کو قتل کردیں، سو آپ باہر چلے جائیے.

میں آپ کے خیرخواہوں میں ہوں.

افغانستان میں مہم

افغانستان کے نائب امیر السلطنت صدر اعظم سردار نصر اللہ خاں فی الحقیقت مولانا منصور انصاری سے متاثر تھے. مولانا انصاری سے ان کی خط کتابت بھی تھی اور جنوبی ایشیا نیز عالم اسلام کی آزادی کے ان کے منصوبہ سے بھی متفق تھے لیکن امیر حبیب اللہ خان کی وجہ سے حکومتی سطح پر اس تحریک میں عملی طور پر شامل ہونا خلافِ مصلحت سمجھتے تھے. اس کا اندازہ اس خط سے لگایا جاسکتا ہے جو مولانا محمد میاں نے یاغستان میں داخل ہونے کے صرف ایک ماہ بعد ہی ۱۵ شعبان ۱۳۳۴ھ/ ۱۷ جون ۱۹۱۶ کو تحریر کیا تھا. یہ خط ان کو تحریک میں شامل کرنے سے متعلق ہے. غالبًا وہ اس سے بہت متاثر تھے. یہ تحقیق نہیں کہ سردار نصر اللہ خان نے اس خط کا جواب دیا تھا یا نہیں. مولانا منصور انصاری کا خط مندرجہ ذیل ہے:

نصر اللہ خان کے نام مکتوب منصور

بجناب حضرت نائب السلطنت جعلہ اللہ نصر الاسلام

تحیات آداب مسنونہ

۱- ہندستان (جو مکر و فریب کی بنا پر، اہل اسلام کے ہاتھوں سے نکل کر انگریزوں کے ہاتھ میں چلا گیا ہے) کو آزاد کرانا ہندستان کے تمام مسلمانوں اور ملحقہ ممالک پر خاص طور پر فرض ہے.

۲- سلطان العلماء حضرت مولانا محمود حسن صاحب محدث دیوبندی (جنہوں نے بندہ کو یہاں بھیجا ہے) اس فریضہ کے سلسلہ میں درج ذیل اصولوں کے

مطابق خدمت انجام دے رہے ہیں.

(الف) ہندستان کو کفار (انگریز) سے آزاد کرانے کے لیے مملکتِ خدا داد (افغانستان) کو تیار کرنا.

(ب) یاغستان کی منتشر طاقتوں کو مملکتِ خداداد سے جوڑنا.

بزرگانِ یاغستان کے معتمدین کا وفد بندہ کے ہمراہ ہے. وہ دراصل حضرت مولانا موصوف (شیخ الہند) کی تحریک کے ذریعہ جو کام ہو رہا ہے یا ہو سکے گا اس کے بارے میں خود عرض کرے گا.

(ج) حکومت خداداد (افغانستان) کا دیگر اسلامی ممالک طاقتوں اور سربراہوں کے ساتھ اتحاد قائم کرنا. اس سلسلے میں حضرت مولانا موصوف خود عالی جناب غالب پاشا والیٔ حجاز سے درج ذیل امور طے کر چکے ہیں کہ

۱- والیٔ حجاز سے سند اعتماد و توثیق حاصل کرنا جس میں دربار خلافت کی جانب سے تصدیق ہے اور انگریزوں، روسیوں، اور فرانسیسیوں کے خلاف نفیر عام کی ترغیب ہے. سبھی اہلِ اسلام خصوصاً ہندستان اور افغانستان کی طرف سے.

۲- والیٔ حجاز نے وعدہ کیا ہے کہ حضرت انور پاشا اور حضرت سلطان کی جانب سے ایسا فرمان لائیں گے جس میں جہاد کی ترغیب کے علاوہ حکومت افغانستان کے ساتھ اتحاد کی ضرورت کا اظہار ہو. اس کے بعد حضرت مولانا دیوبندی نے بندہ کو درج ذیل فرائض کی انجام دہی کے لیے مدینہ منورہ سے روانہ فرمایا.

۱- ضروری ہدایات ارسال کرنا، والیٔ حجاز کی سند توثیق کو ہندستانیوں تک پہنچانا.

۲- یاغستان میں مامور بزرگوں کی خدمت میں ہدایات، حالات اور والیٔ حجاز (غالب پاشا) کے فرمان ترغیب جہاد کو پہنچانا.

۳- دولت عثمانیہ کے عزم اتحاد کو مملکتِ خداداد افغانستان تک پہنچانا اور اس سلسلے میں ان دونوں حکومتوں کے ارباب امور کے خیالات کو جاننا.

بندہ پہلے دو فرائض سے بعون اللہ تعالیٰ فارغ ہو گیا ہے. سب حالات افغانستان کے ارباب امور کے سامنے پیش کرنے کے بعد عرض گذار ہے کہ ان دو اسلامی حکومتوں کے درمیان اتحاد کرانا ہمارا مقصودِ نظر ہے جیسا کہ حضرت مولانا محمود حسن صاحب نے اس سلسلہ میں سلسلہ جنبانی کی ہے. اگر منظور ہے تو پھر کون طریقہ اور وقت مناسب ہے کہ اس امر کی تکمیل عمل میں لائی جائے؟

فقط منصور عفا عنہ

۱۵ شعبان المعظم ۱۳۳۴ھ (۱۷ جون ۱۹۱۶)

غالب نامہ کی تقسیم عام

سلطنت عثمانیہ اور سلطنت افغانستان کے مابین سیاسی اشتراک عمل کی سعی آرزو سے زیادہ بلند نہ ہوسکی. امیر حبیب اللہ خان کی سیاست بیان میں آچکی ہے. ان کے جانشین امیر امان اللہ خان کی سیاسی بصیرت بھی قابل ذکر ثابت نہ ہوئی. وہ بچہ سقہ کا مقابلہ کرنے کے اہل بھی ثابت نہ ہوئے اور تخت وتاج سے دستبردار ہوکر اول ہندستان میں انگریز کی پناہ میں چلے گئے اور پھر یورپ میں باقی زندگی سوئزرلینڈ میں گزار دی. امان اللہ خان کے دور حکومت ہی میں سلطنت عثمانیہ کا خاتمہ ہو گیا تھا تو وہ شاخ ہی نہ رہی جس پہ آشیانہ تھا.

ہنگامی اور انفرادی انقلابات سے قطع نظر مولانا منصور انصاری نے غالب نامہ کی نقلیں وافر مقدار یاغستان کے قبائل میں تقسیم کیں. جرأت مند قبائلی پٹھانوں کو آزادی ہند کے فوائد بتائے اور انہیں اس کے لیے ہموار کیا. یاغستان کے حالات کا جائزہ لینے اور وہاں تحریک آزادی ہند کے جذبات کو بیدار کرنے کے بعد مولانا محمد میاں منصوبہ کے مطابق کابل پہنچ گئے جہاں مولانا عبید اللہ سندھی پہلے سے کام کررہے تھے. افغانستان میں قیام کے دوران سیاسی مصلحت کی بنا پر انہوں نے اپنا نام منصور رکھ لیا تھا اور افغانستان میں وہ اسی عرف سے مشہور تھے اور ہیں.

کابل میں مولانا منصور انصاری نے ایک تو مولانا عبید اللہ سندھی کے ساتھ انقلابی کاموں میں معاونت کی اور دوسری شیخ الہند کی ایما پر ہندستان کی ایک موقتہ (provisional) حکومت ہند کے قیام میں مدد کی جس کی صدارت کے لیے راجہ مہندر پرتاپ کا نام تجویز کیا گیا تھا. برکت اللہ بھوپالی وزیر اعظم اور مولانا عبید اللہ سندھی وزیر داخلہ

مقرر ہوئے. مولانا منصور انصاری نے خود کو تمام مناصب سے دور رکھا، البتہ قرائن بتاتے ہیں کہ چونکہ ان کے ذمے تین لاکھ قبائل کو لے کر ہندستان پر حملہ کرنا تھا لہٰذا ممکن ہے عملاً وزارت دفاع کی نگرانی انہیں دی گئی ہو.

جب حالات سازگار معلوم ہوئے تو مولانا منصور انصاری نے شیخ الہند مولانا محمود الحسن کو ان حالات سے واقف کرانا ضروری سمجھا لیکن شیخ الہند تک خطوط کی رسائی آسان کام نہیں تھا. ان کے علم میں تھا کہ غالب نامہ کی اطلاع انگریز حکومت کو ہو گئی تھی اور اس نے اپنی خفیہ ایجنسیوں کا جال شیخ الہند نیز دوسرے سرگرم تحریکی حضرات کے گرد ڈال رکھا تھا. اس لیے مولانا منصور انصاری کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہتے تھے جو خفیہ محکمہ کے علم میں آ سکے.

رزم حریت

شیخ الہند تک پیغام رسانی کا ایک حل یہ تلاش کیا گیا. علماء اکثر کپڑے کا جو رومال اپنے کاندھوں پر ڈالتے ہیں اس پر پیغام لکھ کر شیخ تک پہنچا دیا جائے. اس طریقہ پر وہ انگریزوں کی نظر سے بھی محفوظ رہتا اور شیخ الہند احوال سے بھی واقف ہو جاتے.

اس سلسلہ میں مولانا محمد میاں نے جو افغانستان میں منصور انصاری کے نام سے مشہور ہو چکے تھے شیخ الہند کو ریشمی رومال پر ایک خط لکھا. یہ خط آٹھ انچ چوڑا اور دس انچ لمبا تھا. اس خط میں جدّہ سے کابل تک کے حالات کا مختصراً تذکرہ اور اپنی کارگزاری نیز موجودہ حالات شامل تھے. یہ خط برطانوی رولٹ کمیٹی (Rowlatt Committee) کی رپورٹ میں اہم درجہ رکھتا ہے اور اسی نسبت سے شیخ الہند کی انقلابی تحریک کو کمیٹی کے انگریز سربراہ جج سڈنی رولٹ نے ریشمی رومال "سازش" کا نام دیا تھا.

وہی قاتل، وہی مخبر، وہی منصف ٹھہرے

ریشمی رومال تحریک ہندستان کی تاریخ جنگِ آزادی میں اہم درجہ رکھتی ہے. اگر چہ یہ تحریک کامیاب نہیں ہو سکی لیکن اتنا اندازہ ہوتا ہے کہ اگر بوریہ نشین علماء کی تحریک کا راز قبل از وقت فاش نہ ہوتا تو ممکن تھا کہ ہندستان ۱۹۱۷ء میں آزاد ہو جاتا، اور یہ ایک عظیم تر خطہ پر مشتمل ہوتا جس کی سرحدیں ایک طرف ایران سے، دوسری طرف چین سے، اور تیسری طرف روس سے ملی ہوئی ہوتیں. اس تحریک کے قائدین کے منصوبے بروئے کار آجاتے تو نہ تقسیم کا المیہ پیش آتا جس نے ہندستان کی سرحدوں کو مختصر کر دیا اور نہ کشمیر کے موجودہ مسائل سر اٹھاتے جنھوں نے اس وقت اس خطہ کے باشندوں کی زندگی کا سکون درہم برہم کر رکھا ہے.

اس تحریک کی دستاویزوں میں چند نام سامنے آتے ہیں تحریک کے حامیوں میں مولانا محمد میاں منصور انصاری کے علاوہ شیخ الہند مولانا محمود الحسن، مولانا عبید اللہ سندھی، مولانا عبدالرحیم سندھی؛ اور تحریک کو نقصان پہنچانے والوں میں شیخ عبدالحق سابق جیون داس ولد لورنداداس اور ملتان کے جاگیردار خان بہادر رب نواز خاں کے نام منظرِ عام پر آتے ہیں.

مولانا عبید اللہ سندھیؒ، شیخ الہند کے شاگرد اور مولانا محمد میاں کے دوست تھے. وہ ایک سکھ خاندان میں پیدا ہوئے تھے. آغاز جوانی میں ہی مشرف بہ اسلام ہو کر دیوبند پہنچے اور شیخ الہند کے ایک مایۂ ناز شاگرد ثابت ہوئے. استاذ کی ہدایت پر وہ کابل میں مقیم تھے اور حربی مہم میں مولانا محمد میاں منصور انصاری کی معاونت کر رہے تھے. مولانا محمد میاں یاغستان (قبائل آزاد) میں غالب نامہ تقسیم کر کے انگریزوں کے خلاف فضا ہموار کر چکے تھے. اب ضرورت تھی کہ شیخ الہند بھی افغانستان پہنچ کر تحریک کی کمان ہاتھ میں لیں اور ان کی قیادت میں یاغستان وافغانستان کے مجاہدین ومہاجرین انگریز حکومت کے خلاف بیرونی حملہ کے لیے صف بستہ ہو جائیں اور ان افواج کو اندرون ملک عوامی حمایت حاصل ہوتا کہ انگریز بیک وقت دو حملوں کی تاب نہ لا کر انگلستان سدھارے اور ہندستان کو اس سے آزادی ملے.

اس و دوران پہلی جنگ عظیم کے سیاسی اثرات دنیا میں ابتری پھیلا رہے تھے. ترکوں کے خلاف انگریزوں کے حلیف اٹلی کی شورش نے پوری دنیا کے مسلمانوں کو انگریز سے مزید متنفر کر دیا تھا مگر یہ کیفیت مسلم عوام کی تھی. مسلم حکمرانوں کو اس صورت حال سے کوئی بے چینی نہیں تھی. ان کے لئے راوی چین ہی لکھتا تھا.

جرمنی کئی وجوہات کی بنا پر ترکی کا طرفدار تھا. افغانستان کی سرزمین اس تحریک کے لیے مناسب سمجھی جارہی تھی. وہ ایک مسلم حکومت ضرور تھی مگر جنگ عظیم میں کوئی قابل ذکر حیثیت نہیں رکھتی تھی. افغانستان کے حکمراں اس معاملہ میں خاموشی اختیار کئے ہوئے تھے. افغان عوام کی دلی ہمدردیاں ترکی کے ساتھ تھیں جہاں کا حکمراں خلیفۃ المسلمین کہلاتا تھا، اور

اسے خادم حرمین شریفین ہونے کا شرف صدیوں سے حاصل تھا. چنانچہ مذہبی طبقہ ہی نہیں عام مسلمانوں کی حمایت اور ہمدردیاں ترکی کے ساتھ تھیں. ضرورت تھی کہ ان جذبات کو منظّم اظہار کی توانائی دی جائے اور حکومت افغانستان پر اثر ڈالا جائے کہ وہ بھی انگریز حکومت کے خلاف صف آرا ہو. جرمنی کی حکومت مناسب موقع پر حمایت دینے کو تیار تھی. وہاں ہندستانی مہاجر طلبہ کی ایک جماعت حریت پسندوں کی قیادت میں موقع کی منتظر تھی.

دوسری طرف حجاز مقدس میں شیخ الہند نے سلطنت عثمانیہ کے وزیر جنگ انور پاشا اور ترک گورنر حجاز غالب پاشا سے درخواست کی کہ وہ ایران کے راستے ان کے یاغستان تک کے سفر کا محفوظ انتظام کر دیں. لیکن ترکی کے سامنے مسئلہ یہ تھا کہ شامی اور عراقی عربوں میں فرانس کے پھیلائے ہوئے قوم پرستی کے جذبات شدید ہو گئے تھے اور اس کے نتیجہ میں عراق کا عثمانی صوبہ بھی خلافت سے باغی ہو کر انگریزوں کا حامی بن چکا تھا اور حجاز سے ایران اور بلوچستان جانے کا راستہ مخدوش ہو گیا تھا.

ادھر ایران کی سرحد ایک طرف ہندستان سے متصل تھی اور دوسری جانب یورپی قوم پرستی کے بیمار عراق سے. انگریزوں کو بگڑتی ہوئی ہندستانی صورت حال کا اندازہ صدی کے سر آغاز پر ہو رہا تھا اور وہ نجد وحجاز کی طرح ایران کو بھی اپنی سیاسی نقشہ سازی میں لپیٹ چکا تھا. شاہی روس کے ساتھ مل کر برطانیہ نے ۱۹۰۶ میں ایران کو تین حصوں میں بانٹ دیا تھا: شمالی علاقہ روس کے اثر میں چلا گیا، جنوبی ایران کے ساحلی اور تیل بردار علاقہ پر برطانیہ نے قبضہ کیا اور بچے کھچے ایران کو ''غیر جانبدار'' قرار دے کر ایرانیوں کے واسطے چھوڑ دیا گیا. اس طرح یہ مسلم ملک بھی نجد وحجاز کی طرح مسلمانوں کے آزاد سیاسی اثر سے خارج ہو گیا. چنانچہ شیخ الہند کے امکانی سفر افغانستان کا یہ راستہ بند ہو گیا.

فرانسیسی مستشرقین کی زہر آفرینی اپنی جگہ، لیکن عرب قوم پروری کو ترک قوم پروری سے شہ ملی تھی. سلطنت عثمانیہ کا عرب شامی شہری ساطع الحصری مقدونیہ میں ملازمت

کے دوران یورپی قومیت کے تصور سے آشنا ہو۔وہیں اس کا رابطہ ترک قوم پرور انجمن اتحاد و ترقی (Committee for Unity and Progress) کے ہمدردوں سے ہوا اور وہ ترک قومیت کے نظریہ سے متفق ہو گیا.لیکن پھر اس نے سوچا اگر ترک اپنی ایک مستقل قومیت کا پرچار کرنے میں حق بجانب ہیں تو عثمانی سلطنت کے عربوں کو بھی ایک مستقل قومیت کی جدوجہد کرنے کا حق ہے.ان دونوں مسلم گروہوں کا یہ یورپی اندازِ فکر سلطنت عثمانیہ کے لئے زہر کا ٹیکہ تھا.اس کا مطلوبہ خاتمہ ایک طرف ترکوں کی متحدہ قوت پر کاری ضرب تھا اور دوسری جانب بطور خلافت مسلمانانِ عالم کی متحدہ قوت پر بھی مہلک گرز تھا.ان دونوں گروہوں کے عوام کو اس نظریہ سے کیا نقصان ہوا اس کا گوشوارہ سامنے ہے،لیکن اس کا مجموعی فائدہ برطانیہ اور فرانس اور روس کی سرکردگی میں کلیسائی قوتوں کو ہوا جو نوآبادیاتی نظام کے خاتمہ کے بعد بھی ان ملکوں پر بدستور بالواسطہ حکومت کر رہے ہیں.

عرب قومیت کے حق میں ساطع الحصری کی منطقی دلیل تو غلط نہ تھی لیکن عرب اور ترک قوم پرور یہ نہ پہچان سکے کہ جداگانہ قومیت کے جس تصور پر وہ قربان ہو رہے تھے وہ درحقیقت یورپی اور صنعتی انقلاب کی پیدا کی ہوئی اقتصادیات اور جنگ زرگری کی پیداوار تھا جس کا ثقافتی،تاریخی،لسانی،نسلی پس منظر نہ عرب تھا نہ ترک.اس نظریہ کے ہمنوا ترک اور عرب دونوں ہی بلقان اور فرانس کی عیسائی کلیسائی یونیورسٹیوں کے تعلیم یافتہ تھے اور آزادانہ سوچ کی صلاحیت سے عاری تھے.

اس خارزار میں شیخ الہند ہوں یا ان کی تحریک یا عثمانی وزیر جنگ انور پاشا سب الجھ کر رہ گئے تھے.افغانستان کی مقامی صورت حال اور تحریک آزادی ہند کی پیش رفت سے شیخ الہند کو مطلع کرنا زعماءِ تحریک کے لئے ضروری تھا لیکن ان تک پیغام پہنچانا آسان نہیں تھا. ڈاک کے ایک ایک پُرزہ پر انگریز جاسوسوں کی نظر تھی.

بہرحال مولانا محمد میاں منصور انصاری اور مولانا عبیداللہ سندھی نے ریشمی رومال

پر شیخ الہند کے نام تفصیلی خطوط لکھے جو عبدالحق سابق جیون داس ولد لورنداداس اور جاگیردار رب نواز خان کے واسطوں سے ملتان کے انگریز کمشنر کے ہاتھوں میں پہنچ گئے. یہی خط برطانوی خفیہ پولس کی تحریروں میں تحریک ریشمی رومال کی وجہ تسمیہ بن گئے.

مولانا انصاری کا ریشمی خط

از کابل ۹ جولائی ۱۹۱۶ مطابق ۸ رمضان المبارک ۱۳۳۴ھ بروز اتوار

وسیلۃ الیومی وغدی حضرت مولانا صاحب مدظلہ العالی. آداب و نیاز مسنونہ

جدّہ کے بعد کا حال یہ ہے: بمبئی آرام و بے خطر پہنچے. بندرگاہ پر اسباب کی تلاشی میں خدام سے دانستہ اعراض برتا گیا. فللّٰہ الحمد.

مولانا مرتضٰی صاحب کام کو ناممکن خیال کرتے ہیں. اس لیے ان کو کام میں نہیں لیا گیا. مولوی ظہور صاحب بمبئی استقبال کو پہنچے تھے اور محمد حسین راندیر سے. راندیر میں تحریک چندہ صرف سید صاحب کے خلاف سے ناکام رہی. راندیر، خطیب مکرر جانے والے تھے. نہ معلوم کیا ہوا. قاضی صاحب نے بعد ملاحظہ والا نامہ سر پرستی قبول فرمالی. جماعت پر اعتماد بحال رکھ کر کام کرنے کی اجازت دی. اس کام کو باضابطہ کرنے کے لیے ایک سالہ رخصت لینے کا قصد فرمارہے ہیں. جماعت کے سبھی ممبر سرفروشی کر رہے ہیں. مطلوب الگ ہو گئے ہیں سید نور ست. مولانا رائے والا صاحب (عبدالرحیم رائے پوری) متفق و معاون ہیں. حکیم (عبدالرزاق غازی پوری، برادر حکیم نابینا اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری) صاحب ۵۰ روپے ماہوار مکان پر خود جا کر دیتے رہتے ہیں اور درمیان میں بھی ایک یا دو بار جاتے رہتے ہیں اور گاہ گاہ ڈاکٹر (انصاری) صاحب بھی مولوی حنیف کو جماعت ۱۰ روپے خرچ دیتی ہے. وہ مکان پر ہی ہیں. مدرسہ نے اُن سے کوئی ہمدردی نہیں کی. مالکان مدرسہ سرکاری خدمت میں وقف ہیں. نمائش کے دربار میں شرکت کا فخر بھی نصیب ہونے لگا. خدام کو جاسوسی برطانیہ عوام سے منوایا جارہا ہے. حکیم جمیل اور امیر شاہ اس کے خاص منّاد ہیں.

امیر شاہ،مولانا عبدالرحیم صاحب کے دستی کام کے لیے پڑا ہے.مولانا مدرسہ سے مرعوب ہیں مگر خدّام کی صفائی فرماتے رہتے ہیں.مولوی رامپوری نے بھی تائید سے کنارہ کیا اور اپنے پاس کا روپیہ دینے سے انکار کر دیا.مسعود بھی شکار ہو گیا حتیٰ کہ مولوی شوکت علی کو اس قصور پر کہ انہوں نے مہتمم کی نسبت کچھ کہہ دیا تھا مدرسہ بلا کر مہتمم کے ہاتھ سے خوب ذلیل کرایا.شوکت نے جواب میں صرف رونے پر اکتفا کیا.بندہ حسرت (موہانی) و (ابوالکلام) آزاد سے ملا.دونوں بے کار ہو چکے ہیں. چونکہ بندہ کا وعدہ پر لوٹنا حضور تک ممکن نہ تھا اس لیے آگے بڑھا.

غالب نامہ احبابِ مہمند کو دکھا کر حضراتِ یاغستان کے پاس لایا.حاجی (ترنگزئی) بھی اب مہمند میں ہیں.(آزادی کی خاطر جمع ہونے والے ہندستانی) مہاجرین نے مہمند، باجوڑ،سوات وغیرہ علاقوں میں آگ لگا رکھی ہے.ان علاقوں میں غالب نامہ کی اشاعت کا خاص اثر ہوا.اس لیے ضروری ہے کہ حسبِ وعدہ غالب مصالحت کے وقت یاغستان کی خدمت کا خیال رکھا جائے.جماعت مہمند سے مہاجرین کو کافی امداد نہیں پہنچ سکی. بندہ یاغستان ایک ماہ قیام کر کے وفد مہاجرین کے ساتھ کابل پہنچا.مولانا سیف(الرحمٰن) جماعت سے الگ ہو کر یہاں مقیم ہیں.ان کے لیے دولت (مملکت) کی طرف سے کام کی تجویز ہو رہی ہے.اعضائے وفد فضلین (فضل ربی و فضل محمد) وعبدالعزیز و مولانا الناظم (عبیداللہ سندھی) کی توجہات و حاجی عبدالرزاق صاحب کی عنایت سے وفد نے دربار (صدر اعظم سردار) نصر اللہ میں رسائی پائی.ابتدائی کامیابی بھی ہوئی.بندہ ان سے الگ باریاب ہوا.حضور کے زیرِ اثر کام اور اس کے اصول کی تفصیل کی گئی.خاص قبولیت ہوئی.الحمدللہ انشاءاللہ تعالیٰ اس ذیل میں حاضر خدمت ہوں گا.

یہاں کا حال یہ ہے کہ یہاں سفراء ترک و جرمن پہنچے.ان کا اعزاز پورا ہوا لیکن مقصد میں ناکام رہے.وجہ یہ ہے کہ ترکی کا فرض تھا کہ ایام ناطرفداری میں ایران و افغانستان سے ان کی

ضروریات معلوم کرتا،اس کے پورا کرنے کی کوششیں کرتا اور حسبِ احوال معاہدہ دوستی کرتا.افغانستان نہ تو بڑی جنگ میں شرکت کا سامان کاری رکھتا ہےاور نہ ہی کوئی بڑی دولت اس کےنقصانات کے تلافی کی ذمہ دار ہے.اس لیےشریکِ حرب نہیں ہوسکتا.اگر ضروری افسران، اسلحہ،روپیہ دیا جائے اور بصورت غلبہ کفرامداد واعانت کا عہد نامہ کیا جائے تو شرکت کے لیے تیار ہیں. بایں ہمہ سردار نائب السلطنت (نصراللہ خان) سرحدِ وزیر(ستان)،آفرید،مہمند، باجوڑ،سوات،بنیر،چکیسر،عذر بند،کوہستان،دیر،چترال وغیرہ میں اپنا اثر منظّم کر کے اور ان سے وکلاء طلب کر کے عہد شرکت بصورتِ جنگ لے رہے ہیں.یہ کام ایک حد تک ہو چکا ہے.سفراء جرمن واپس،اورترک مقیم ہیں مگر بے کار تعجب ہے کہ سفراء خالی ہاتھ آئے.حتّٰی کہ کوئی کافی سند سفارت بھی نہ لائے.ایسی صورت میں کیا ہوسکتا ہے.

مولانا الناظم (عبیداللہ سندھی) باعافیت ہیں.دولت (مملکت افغانستان) میں ایک حد تک اعتماد ہو گیا ہے.(معاندین)ان کو یہاں جاسوس ثابت کرنے کی کوشش کراتے رہتے ہیں جن کا کچھ اثر بھی ہوتا ہے،مگر الحمد للہ کہ اب تک ان کو پوری کامیابی نہیں ہوئی،ادھر جرمن طلباء اور بعض سکھ بھی یہاں حاجی عبدالرزاق صاحب کی مدد و نائب السلطنت کی مہربانی سے آزاد ہیں اور مولانا الناظم (مولانا سندھی) کی زیرسرپرستی دئے گئے ہیں،مصارف بذمۂ دولت ہیں،کوئی سرکاری کام ان کے ذمّہ نہیں ہے،البتہ مولانا کے خاص کاموں میں بایمائے نائب السلطنت دست و بازو ہیں،جن کی تفصیل یہ ہے:

ایک جماعت ہندستان کو آزاد کرانے والی جس کا سردار ایک ہندی راجہ (مہندر پرتاپ) مقیم کابل ہے جو کہ سلطان المعظم اور قیصر جرمن کے اعتماد نامہ کے ساتھ یہاں پہنچاہے. ناظم صاحب اور مولوی برکت اللہ بھوپالی اس جماعت کے وزراء ہیں.اس جماعت نے ہندستان میں مراکز و دیگر دَوَل (ملکوں) سے معاہدات کرنے کے لیےحرکت کی ہے.جس میں ابتدائی کامیابی ہوئی ہے.اس کام میں عضو متحرک طلبا ہی ہیں ان میں سے

بعض دربارِ خلافت ہوکر حاضر خدمت ہوں گے. انشاءاللہ

دوسری جماعت الجنو دالربانیہ، یہ فوجی اصول پر مخصوص اسلامی جماعت ہے. اس کا مقصد اوّلیہ سلاطین اسلام میں اعتماد پیدا کرنا ہے. اس کا صدر جس کا نام فوجی قاعدہ سے جنرل یا القائد ہے حضور کو قرار دیا گیا ہے اور مرکز اصلی مدینہ منورہ. اس لیے خیال ہے کہ حضور مدینہ منورہ میں رہ کر خلافتِ علیاء سے افغانستان و ایران کے ساتھ معاہدہ کی سعی فرمائیں اور افغانستان کے متعلق نیز یاغستان کے متعلق تجاویز کو خدّام تک پہنچادینا کافی خیال فرمائیں.

افغانستان شرکت جنگ کے لیے امور مذکورہ بالا کا طالب ہے جسے علیائے دولت عثمانیہ تک پہنچانے کی جلد تدبیر کی جائے کیونکہ ہندستان میں کفار (انگریزوں) پر کاری ضرب لگانے کی یہی ایک صورت ہے. اہلِ مدرسہ مولوی محسن سید نور کے ذریعہ سے حضور کو ہند میں لانے کی سعی میں ہیں، کیونکہ ان کو اب یہ معلوم ہوا کہ حجاز میں بھی کام ہوسکتا ہے. ادھر انگریزوں میں پہلی سی عزت بوجہِ عدم ضرورت اب نہیں رہی.

قاضی صاحب، حکیم صاحب، ڈاکٹر صاحب، مولانا رائے والا حضور کی ہند مراجعت کے سخت مخالفت ہیں. خطرہ بوجہ قصہٗ غالب کے علم ہونے کے بذریعہ مطلوب اب پہلے سے بہت بڑھ گیا ہے. اس لیے ایسی کسی تحریک کو ہرگز ہرگز منظور نہ فرمایا جائے.

مبلغ عطاء حضور کے مکان پر اور سید نور کو ضرورت نہ ہونے کی وجہ سے. جماعت کے سپرد کر دیا گیا. بندہ حصولِ قدم بوسی کی سعی میں ہے. اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ کامیاب ہوں گا. مولانا النّاظم (عبیداللہ سندھی)، مولانا سیف (الرحمٰن)، فصلیین (فضل ربی و فضل محمد) وعبد العزیز (مولانا عبیداللہ سندھی کے بھتیجہ) و جملہ مہاجرین طلباء سلام عرض کرتے ہیں. والسلام

برادرِ عزیز وحید، مولانا حسین ان کے والد صاحب و برادران و حرمت اللہ و احمد جان صاحبان کی خدمت میں سلام مسنون. مدنی خطوط ہند کی ڈاک کے حوالے کر دیئے گئے تھے. ڈاکٹر خدا بخش و حبیب اللہ غازی کو بھی.

یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ ریشمی رومال پر یہ خط مولانا محمد میاں منصور انصاری نے خود لکھا تھا یا کسی سے لکھوایا تھا لیکن اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ یہ خط مولانا عبید اللہ سندھی نے اپنے مخصوص ذرائع سے مدینہ منورہ بھیجنے کی ذمہ داری لی تھی. دو دیگر خطوط اسی طرز پر مولانا عبید اللہ سندھیؒ نے لکھے تھے. ان میں سے ایک خط بطور سرنامہ (covering letter) شیخ عبدالرحیم سندھی کے نام تھا. اصل خط شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب کے نام. یہ خطوط بھی ریشمی رومال پر اسی انداز سے لکھے گئے تھے.

مولانا عبید اللہ سندھی نے شیخ عبدالرحیم سندھی کو جو خط تحریر کیا تھا اس میں ان دونوں متذکرہ بالا خطوط کو راز داری کے ساتھ کسی معتبر حاجی کے ذریعہ شیخ الہند تک پہنچانے کی ذمہ داری تفویض کی گئی تھی. یہ خط ۹ رمضان ۱۳۳۴ (۱۰ جولائی ۱۹۱۶) کا تحریر کردہ ہے اور چھ انچ لمبا اور پانچ انچ چوڑا ہے.

اس خط میں مولانا عبید اللہ سندھی نے شیخ عبدالرحیم سندھی کو یہ بھی تحریر کیا تھا کہ

> اگر خدانخواستہ آپ کو معتمد حاجی نہ مل سکے اور آپ خود بھی نہ جا سکیں تو مولوی صمد اللہ ساکن پانی پت سے اس معاملہ میں مدد لیں. یہ ضروری ہے کہ اس حج کے موقع پر یہ اطلاعات حضرت مولانا (شیخ الہند) کے پاس پہنچ جائیں اور وہاں سے جو اطلاع ملے وہ براہِ راست نہ ہو سکے تو مولوی احمد لاہوری کی معرفت ضرور ہمیں ملنی چاہئے.

اس کے ساتھ زبانی یہ بھی کہلانے کو تحریر کیا گیا کہ اگر مولانا منصور انصاری حج کو نہ آسکیں تو خیال فرمالیں کہ اس کا آنا ممکن نہیں. اس وضاحتی خط کے ساتھ دو تفصیلی خطوط جن میں ایک مولانا منصور انصاری کا مذکورہ بالا خط تھا اور دوسرا مولانا عبید اللہ سندھی کا. شیخ الہند تک پہنچانے کی یہ راہ نکالی گئی تھی.

مولانا سندھی کا ریشمی خط

مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے اپنے ریشمی خط میں شیخ الہند کو افغانستان کی سرزمین پر آزادی ہند کے لیے چلنے والی جدو جہد اور کارگزاریوں کی تفصیلات فراہم کی تھیں. یہ خط ۱۵/ انچ لمبا اور ۱۰/ انچ چوڑا ہے. اس پر تاریخ تحریر مذکور نہیں ہے. اس خط میں ایک عالمی فوجی تنظیم کی تمام جزئیات تحریر کردی گئی تھیں. ان تفصیلات میں شیخ الہند کو بطور خاص اس فوجی تنظیم کی اطلاع دی گئی ہے جس کا خاکہ مولانا سندھی اور مولانا منصور انصاری نے افغانستان میں رہ کر ترتیب دیا تھا.

اس تنظیم کا نام الجنود الربانیہ رکھا گیا تھا جس کا مرکز اصلی مدینہ منورہ کو قرار دیا گیا تھا اور تین ثانوی مراکز قسطنطنیہ، تہران اور کابل کو مقرر کر کے وہاں قائم مقام جنرلوں کے ماتحت کیا گیا تھا. مرکز سوئم صدر مقام لیفٹیننٹ جنرل کی حیثیت سے ان ممالک اسلامیہ کا قرار پایا جو کفر (انگریزوں) کے زیر اثر تھے.

اس کے عہدیداران کے القاب تھے

مربی	کمانڈر انچیف
مرد میدان	فیلڈ مارشل
سالار	جنرل
قائم مقام سالار	لیفٹننٹ جنرل
معین سالار	میجر جنرل
ضابط	کرنل

نائب ضابط	لیفٹننٹ کرنل
دوصد باشی	میجر
صد باشی	کپتان
پنجاہ باشی	لیفٹیننٹ

پھر ان عہدوں کی تفصیلات فراہم کی گئیں، جن کے مطابق اس تنظیم کے مربی سالار المعظم خلیفۃ المسلمین سلطان ترکی، سلطان ایران احمد شاہ قاچار (تہران) اور امیر حبیب اللہ خاں (کابل)؛ مرد میدان (فیلڈ مارشل) کی حیثیت سے ولی عہد سلطنت عثمانیہ، صدر اعظم سلطنت عثمانیہ، خلافت عثمانیہ کے وزیر جنگ انور پاشا، نظام حیدر آباد، نواب رام پور، نواب بہاولپور وغیرہ بارہ شخصیات کو بنایا گیا تھا.

اس تنظیم کے جنرل یا سپہ سالار کی حیثیت شیخ الہند مولانا محمود الحسن محدث دیوبندی کو دی گئی. قائم مقام سالار کابل مولانا عبید اللہ سندھی خود رہے. اور انتیس افراد پر مشتمل نائب سالار (لیفٹیننٹ جنرل) کی فہرست تجویز کی گئی جن میں سرفہرست مولانا محمد میاں منصور انصاری کا نام تھا. معین سالار (میجر جنرل) ضابط (کرنل) نائب ضابط (لیفٹیننٹ کرنل) میجر، کپتان اور لیفٹیننٹ وغیرہ کی تفصیلات بھی دی تھیں.

جنودِ ربانیہ کے عہدیداروں کی فہرست عالم اسلام کی ممتاز ترین شخصیات پر مشتمل تھی. علاوہ ازیں اس خط میں حکومت موقتہ ہند (Provisional Government of Independent India) کے نام سے آزاد ہندستان کی اولین عبوری حکومت کی تفصیلات بھی درج تھیں.

باب/ جہد ریشمی

افشائے راز

ریشمی خطوط شیخ عبدالرحیم سندھی کے پاس بھیجنے کے لیے مولانا عبیداللہ سندھی نے جس شخص کا انتخاب کیا وہ ان کا قابل اعتماد ساتھی عبدالحق تھا.اس شخص نے اسلام قبول کرلیا تھا. پہلے اس کا نام جیون داس ولد لورنداداس تھا.وہ ایک تعلیم یافتہ نوجوان تھا جو ہندستان کی آزادی کے نام پر مولانا عبیداللہ سندھی کی جماعت میں شامل ہوگیا تھا.عبدالحق سابق جیون داس ولد لورندا داس کو مولانا عبید اللہ سندھی نے مذکورہ بالا تینوں خطوط کو نہایت رازداری کے ساتھ شیخ عبدالرحیم تک ان کے مکان حیدرآباد سندھ میں پہنچانے کی اہم ذمہ داری سونپی مگر اس نے وہ خط اپنے سابق ولی نعمت ملتان کے جاگیردار رب نواز کو دکھادئے اور اس کے واسطہ سے ملتان کے انگریز کمشنر کے پاس پہنچ گئے اور یوں آزادی ہند کی مہم طشت از بام ہوگئی.

عبدالحق کے قدیمی تعلقات ملتان کے جاگیردار رب نواز سے تھے جو انگریزوں کا وفادار تھا، البتہ اس کا بیٹا اللہ نواز انقلابی تحریک میں ۱۹۱۲ سے تربیت لے رہا تھا اور افغانستان میں مقیم تھا.راجہ مہندر پرتاپ نے عبوری حکومت ہند کے وزرا میں اللہ نواز کا نام بھی درج کیا تھا.اللہ نواز نے عبدالحق کے ذریعے اپنے والدین کو اپنی خیریت کا خط ارسال کیا تھا.حیدرآباد میں گذارے ہوئے ایّام میں عبدالحق رب نواز کے دونوں بیٹوں کا اتالیق رہ چکا تھا. توہدایت کے برخلاف شیخ عبدالرحیم سندھی سے پہلے رابطہ قائم کرنے کے بجائے وہ اول رب نواز کے گھر گیا، وہاں قیام کیا اور دورانِ گفتگو مقصدِ آمد بھی آشکار کردیا اور وہ انتہائی خفیہ اور اہم خطوط بھی رب نواز کو دکھادئے.

رب نواز خاں نے وہ تینوں خطوط عبدالحق سے لے کر ۱۴ اگست ۱۹۱۶ کو ملتان کے

انگریز کمشنر کے حوالے کر دئے. پنجاب میں خفیہ پولس (سی آئی ڈی) افسر نے ان خطوط کی جانچ کی، عبدالحق سے پوچھ گچھ کی، اس کا بیان ۳۵ صفحات پر قلم بند کیا گیا. غالب نامہ تو عام ہو چکا تھا لیکن. اب تک تحریک آزادی کے بارے میں برطانوی حکومت ہند کے پاس صرف شبہات تھے. اب یہ کوئی راز نہیں بلکہ کھلی کتاب بن چکے تھے. تمام راز افشا ہو چکے تھے. اس وفاداری کے صلہ میں رب نواز کو خان بہادر کا خطاب حاصل ہوا اور رب نواز کی باطل نوازی نے انگریز حکومت کو حیات نو عطا کر دی. انگریزوں نے چوٹ کھائے ہوئے سانپ کی مانند انتقامی جذبات کی آتش تیز کر دی اور تحریک کے رہنماؤں اور رضا کاروں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا. اس پوری کاروائی میں تقریباً چار ماہ صرف ہوئے. جب انتقامی کاروائیوں کا منصوبہ بن گیا تو تحریک ریشمی رومال کے سرخیل مقیم حجاز شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندی، ان کے ممتاز تلامذہ مولانا حسین احمد مدنی، مولانا عزیز گل، حکیم نصرت حسین اور مولوی وحید احمد کو مکّہ میں گرفتار کر لیا گیا اور انہیں مالٹا میں اذیتناک قید میں ڈال دیا گیا جہاں حکیم نصرت حسین دورانِ قید ہی انتقال کر گئے.

عبدالحق سابق جیون داس نے گرفتاری کے بعد بہت تفصیلی بیان دیا جو رولٹ کمیٹی کی بنیاد بنا. اس بیان میں اس نے تحریک سے متعلق جن اشخاص کی نشاندہی کی ہے ان میں سرفہرست کانگریسی لیڈر اچاریہ کرپلانی کے بڑے بھائی شیخ عبد الرحیم سندھی اور دوسرے نمبر پر ''مولوی منصور'' کا ذکر ہے. رولٹ کمیٹی رپورٹ میں مولوی منصور کے متعلق عبدالحق سابق جیون داس ولد دلور نداداس کا بیان مندرجہ ذیل ہے:

> ان کا اصلی نام مولوی محمد میاں ہے اور وہ ضلع سہارنپور کے رہنے والے ہیں. میں نے ان کو تین ماہ قبل دیکھا تھا جب وہ نرنجن سرائے کابل میں قیام پذیر تھے. اس کے بعد وہ کہاں چلے گئے میں کچھ نہیں جانتا. ان کا حلیہ اس طرح ہے.
> کالا رنگ، قد متوسط، کالی آنکھیں، گھنی داڑھی اور چوغہ زیب تن کئے ہوئے.

مولانا عبیداللہ سندھی پر کابل کی سرزمین تنگ ہوگئی وہ بالآخر نظر بند کردیئے گئے مولانا محمد میاں کے گرد حصار تنگ ہونے لگا تو انہوں نے پاپیادہ ۲۳ دن کا سفر کرکے روسی ترکستان میں پناہ لی. شیخ عبدالرحیم سندھی کو جب اپنی گرفتاری کے وارنٹ کا علم ہوا تو وطن چھوڑ کر وہ روپوش ہوگئے. اس کے بعد ان کا پتہ نہ چل سکا. ان کا خاندان سندھ اور امریکہ میں مقیم ہے. ڈاکٹر عابداللہ غازی کی تحقیق کے مطابق شیخ عبدالرحیم سندھی کی پوتی عذرا محفوظ شکاگو کی معروف طبیبہ اور سماجی کارکن ہیں.

اور یوں آزادی ہند کی وہ تحریک جو تقریبا ایک چوتھائی صدی کی منصوبہ بندی، برسوں کی مشقت، جدوجہد اور مصائب و آلام کے بعد منصۂ شہود پر ابھر کر آئی تھی دو عاقبت نا اندیش لوگوں کی حکم عدولی اور جاگیر و منصب و مال کے لالچ کا شکار ہوگئی.

ریشمی رومال بظاہر ایسی چیز نہیں تھے جو گرفت میں آسکتے. علما عام طور سے سروں پر یا کاندھوں پر ریشمی رومال ڈالے رکھتے ہیں کسی کو گمان بھی نہیں تھا کہ ان رومالوں سے ایسا کام بھی لیا جا سکتا ہے جو علماء کی اس عادت کو تاریخی اہمیت کا حامل بنا دے.

ریشمی رومال مورخین کی روایت کے مطابق زرد رنگ کے ریشمی کپڑے کا تھا. بقول خان عبدالغفار خان ''رومال پر بیل بوٹوں کی شکل میں عبارت بنا دی گئی تھی''. یہ کام بذات خود بڑا تھا جس کے لئے برسوں تیاری کی گئی ہوگی. شیخ الہندؒ کے نواسے مولانا محمد ہارون کے مطابق یہ طریقہ شیخ الہند ہی کی ایجاد تھا

> پہلے سے یہ طریقہ حضرت شیخ الہند نے اختیار فرمایا تھا. اس کی نوعیت یہ ہوتی تھی کہ رومال میں سے کچھ تار اس طرح نکال دیئے جاتے تھے کہ رومال پر آپ کے دستخط ابھر آتے تھے.

یہ اہم خطوط انگریزوں کے ہاتھوں میں پہنچے اور برطانوی راج مجاہدین کے عزائم اور خفیہ تدابیر سے واقف ہوگیا. شیخ الہند اور ان کے رفقاء حجاز میں شریف

حسین کی غداری اور انگریز کی غلامی کے سبب گرفتار کر کے جدہ، مصر اور پھر مالٹا میں بھیج دیئے گئے. عبدالحق عرف جیون داس سرکاری گواہ بن گیا. شیخ عبدالرحیم سندھی روپوش ہو گئے. مولانا عبیداللہ سندھی دنیا میں مارے مارے پھرے اور آخر منصوبہ کی ولی اللّٰہی اساس کی طرف لوٹ گئے. مولانا محمد میاں منصور انصاری کی زندگی اور فکر کا دھارا بدل گیا. وہ اسلامی نظریۂ سیاست کے سب سے بڑے علمبردار بن گئے تھے. انگریزوں سے ہندستان کی آزادی کے نتیجہ میں مولانا منصور انصاری کا سیاسی تجزیہ تھا کہ باقی اسلامی ممالک، خصوصا مغربی ایشیا اور شمالی افریقہ کو بھی یورپی استعمار آزادی حاصل ہو جائے گی. یہ ترتیب بگڑ گئی تو مولانا منصور انصاری نے عالم اسلام کی بیداری کے لئے حکومت الٰہی کا نیا سیاسیاتی نظریہ مرتب کیا.

شیخ الہندؒ نے جو جنگی منصوبہ بنایا تھا اس کے رکن مولانا محمد میاں اور مولانا عبیداللہ سندھی اور ان کے چند معتمدین کو رفقا بنانے پر نیز افغانستان و یاغستان کا علاقہ منتخب کرنے کو چند مسلم مؤرخین نے ان کے سیاسی تدبر سے تعبیر کیا ہے اور ان کی جرأت وحوصلہ مندی کی تعریف کی ہے. بقول مورخ دارالعلوم دیوبند:

> منصوبہ یہ تھا کہ جرمنی، ترکی، اور افغانستان سے مدد لے کر ہندستان کی شمالی مغربی سرحد (یاغستان) پر آزاد قبائل کے ذریعہ سے انگریزوں کے خلاف جنگ چھیڑ دی جائے اور اس کے ساتھ ہندستان میں عام بغاوت پیدا کر دی جائے. اس وقت چونکہ برطانیہ کی ساری فوجی طاقت جرمنی اور ترکی کے مقابلے میں مصروف جنگ تھی اس لیے بیرونی حملے اور اندورنی بغاوت پر انگریزوں کے لیے قابو پانا مشکل ہو جائے گا اور انہیں ہندستان چھوڑ دینے پر مجبور ہونا پڑے گا.

(سید محبوب رضوی: تاریخ دارالعلوم دیوبند)

شیخ الہند نے افغانستان کا انتخاب اس لیے کیا تھا کہ ہندستان کے ساتھ مشترکہ

سرحد کی راہ سے افرادی مدد اور اسلحہ کا ملنا آسان تھا اور وہاں دارالعلوم دیوبند سے راست یا بالواسطہ فیضیاب علماء کی خاصی تعداد تھی جن میں کئی شیخ الہند کے شاگرد تھے جو آزادی کی روح، اس کے اثرات وثمرات اور اس کی ضرورت، افادیت واہمیت سے واقف تھے.

نئ کوشش

ڈاکٹر عابداللہ غازی کے ذاتی ذخیرہ میں یاغستان کے بہت سے علماء اور سرداران قبائل کے فارسی خطوط ملے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے شیخ الہند کے حکم کے مطابق سارے علاقے میں انگریزوں کے خلاف محاذ تیار کر لیا تھا اور رہنمائی کے منتظر تھے. مولانا منصور انصاری اس علاقہ میں بنیادی کام کر چکے تھے. انہوں نے یاغستان سے مولانا سید حسین احمد کے پاس کچھ ضروری دستاویزات کسی معتمد کے ذریعہ ایک خط کے ساتھ روانہ کی تھیں. اس زمانہ میں خفیہ ڈاک کا منزل پر پہنچنا بڑا مشکل تھا. مولانا محمد میاں اس سے قبل ایک خط فارسی میں کسی اور ذریعہ سے شیخ الہند کو بھیج چکے تھے جس میں اپنے سفر کے حالات تفصیل سے بیان کئے تھے. لیکن وہ خط ملنے سے پہلے ہی شیخ الہند کو گرفتار کیا جا چکا تھا. اسی لئے تشویش کی حالت میں انہوں نے مولانا سید حسین احمد کو درج ذیل خط کے ساتھ وہ دستاویزات بھی روانہ کی تھیں جو وہ شیخ الہند کے علم میں لانا چاہتے تھے.

مولانا حسین احمد مدنی کے نام خط

بخدمت بابرکت مخدومنا جناب مولانا الشیخ سید حسین احمد صاحب مدرس الحرم مع برادران عم فیوضہم السلام علیکم ورحمۃ اللہ.

بندہ جس وقت ہندستان پہنچا غوغا تھا کہ حضرت مولانا (شیخ الہند) مدظلہ کو مع کل جماعت کے انگریز نے عدن میں قید کر دیا. اب یہ مشہور ہے کہ شریف مکہ نے خدانخوستہ حضرت مدظلہم کو گرفتار کر کے انگریزوں کو دے دیا. خدا تعالیٰ سے اس کی امید نہیں.

ایک عریضہ حضرت کی خدمت میں ارسال ہے. اگر حامل عریضہ کی حضرت سے ملاقات نہ ہوتو آپ صاحبوں میں سے جوبھی موجود ہوں وہ مہربانی فرما کر میرے عریضہ کا ترکی میں ترجمہ کرا کر بذریعہ والی مدینہ منورہ بخدمت حضرت انور پاشا وزیراعظم خلافت سنیہ روانہ فرماویں.ضروری ہے. حامل عریضہ کوجس قسم کی مدد کی ضرورت ہواس سے دریغ نہ فرمائیں.

حضرت (شیخ الہند) صاحب کی خدمت میں سلام اور بچوں کو دعوات پہنچے.

والسلام مع الاکرام.

عریضہ : محمد میاں عفی عنہ انصاری ابوایوبی

۱۵شوال المکرّم ۱۳۳۵/۱۴ اگست ۱۹۱۷

نوٹ: باقی احوال یہ صاحب حامل عریضہ زبانی بیان فرمائیں گے ان کو بھی آپ ترجمہ زبانِ ترکی میں فرما کر بخدمت حضرت عالی انور پاشا روانہ فرمائیں.

فہرست تحریرات بخدمت حضرت مولانا محمودالحسن صاحب

۱- نمونہ عرضداشت جمعیۃ حزب اللہ، یاغستان بخدمت اعلیٰ حضرت سلطان المعظم خلداللہ ملکہ..

۲- نمونہ عرضداشت علماءِ خوانین یاغستان، بجواب نامہ حضرت غالب پاشا والی حجاز بخدمت اعلیٰ حضرت سلطان المعظم.

۳- عریضۂ بندہ بخدمت حضرت مولانا مدظلہ العالی.

۴- فہرست مرکز سرحدیہ منظور کردۂ دولت افغانستان.

۵- عریضہ مولوی فضل ربی صاحب بخدمت حضرت مولانا مدظلہ العالی.

۶- عریضہ نواب دیر بخدمت جناب ملا صاحب بابڑہ.

۷- خط قاضی دیر بنام مولوی فضل ربی صاحب.

ان سب کا ترجمہ ترکی میں کرا کر اور ایک بڑے لفافہ میں یک جا بند کر کے اس پر حضرت عالی انور پاشا کا پتہ لکھ دیا جائے اور والی مدینہ منورہ کی معرفت یا جو صورت احسن آپ کو معلوم ہو اس طریقہ سے حضرت انور (پاشا) کی خدمت میں روانہ فرمائیں. راز داری کا نہایت لحاظ رہے. اور اصل ترجمہ کی ہمراہ ہو.

قیصر جرمن کے خطوط ریاستہائے ہند کے نام راجہ مہندر پرتاپ نے ترکستان سے روانہ فرمائے ہیں. ان کے پہنچانے کا جلد انتظام کیا جائے گا.

اس ڈاک کا جواب اگر حضرت عالی انور پاشا سے حامل عرائض ہذا کے ہاتھ روانہ فرما سکیں تو اس سے یہاں کچھ تحریک پیدا ہو سکتی ہے، ورنہ جس افسر ترکی کو لفافہ دیا جائے اس سے باضابطہ رسید لے کر ضرور روانہ فرمائیں. اگر حضرت عالی انور پاشا سے صرف رسید ڈاک حاصل ہو سکے تو نور علیٰ نور.

یہ امر خوب ذہن نشین کرنا چاہیے کہ اگر ایرانی راہ یا بصورت صلح روس، روسی ریل کے ذریعہ سے کچھ عسکری سلطانی حدود ہرات وغیرہ پہنچ جاویں تو نائب السلطنت امیر کابل سے بغاوت کر کے بھی ہند پر حملہ کر سکتا ہے. عسکر سلطانی کے حدود افغانستان پر پہنچنے کی صورت میں لازم ہے کہ اس کی صحیح اطلاع ہم کو یاغستان میں جس طرح ہو سکے پہنچانی چاہیے. ہم اس نشان پر اعتماد کریں گے جو ہم سے غالب پاشا نے مقرر فرمایا ہے. فقط.

محمد میاں عفی عنہ انصاری

رولٹ کمیٹی رپورٹ

انگریزوں نے ۱۹۴۷ میں ہندستان اور پاکستان کے لئے اپنی شرائط پر جو آزادی منظور کی تھی وہ ۱۹۱۷ میں ہندستانیوں کی مرضی کے مطابق دینے کے لئے ہرگز تیار نہیں تھی. پہلی عالمی جنگ ابھی جاری تھی جس میں جرمنی اور ترکی کمزور پڑ رہے تھے جس کی وجہ سے برطانیہ کا استعماری حوصلہ بلند تھا محاذ جنگ پر سلطنت عثمانیہ ترکی کی کمزور حربی حکمت اندرون ہند مرکزی قیادت سے تہی تحریک شیخ الہند کو راست متاثر کر رہی تھی اور عام ہندستانی قومی سیاست پر اس کے سائے گہرے ہو گئے تھے. پلاسی (۱۷۵۷)، بکسر (۱۷۶۴)، سرنگاپٹم (۱۷۹۹)، بالاکوٹ (۱۸۳۱)، بڑی جنگ آزادی (۱۸۵۷) کے بعد چھٹی بار پھر تحریک آزادی کے تار و پود بکھر گئے اور خارزار سیاست میں ریشمی رومال تار تار ہو گئے.

شیخ الہند مولانا محمود الحسن کے نام مولانا عبید اللہ سندھی اور مولانا محمد میاں منصور انصاری کے تفصیلی خطوط عبدالحق سابق جیون داس ولد لورنداداس اور جاگیردار رب نواز کے واسطوں سے گزر کر برطانوی راج کے حکام اور پولس کے ہاتھ لگ چکے تھے اور حد درجہ رازداری سے جاری تحریک اچانک جولائی ۱۹۱۶ کے آغاز میں طشت از بام ہو گئی تھی. اس حادثہ کے پانچ ماہ بعد شیخ الہند مولانا محمود الحسن اور ان کے چند رفقا کو حرم مکہ مکرمہ میں انگریزوں کے غلام غیر شریف حسین نے گرفتار کر کے انگریزوں کے حوالہ کر دیا تھا. انہیں ۱۹ دسمبر ۱۹۱۶/۲۳ صفر ۱۳۳۵ھ کو مکہ سے جدہ کے لئے روانہ کیا گیا. ایک دن بعد جدہ پہنچے اور وہاں سے مصر اور پھر مالٹا بھیج دئے گئے جہاں شیخ الہند پر روزانہ بڑا شیطانی تشدد (torture) کیا جاتا تھا. مالٹا میں انگریز فوجیوں کی اس ایذا رسانی کو آج تک کسی نے حکومتی

دہشت گردی (state terrorism) کا نام نہیں دیا اس تہذیب میں جس پر نثار ہو گئے میر جعفر، میر صادق، حکیم احسن اللہ خان، منشی چراغ علی، عنایت اللہ مشرقی، محمد امین علی پاشا، فواد پاشا، مدحت پاشا، انور پاشا، مولوی نذیر حسین، شاہ حسین کامل، زکی ارسوزی، صلاح الدین البیطار اور نہ جانے کتنے جن کی لغت میں حریت کے معنی کچھ نہیں لکھے تھے.

انگریز کی عمرانی خوبی یہ ہے کہ وہ بڑے سے بڑا جرم قانون کے دائرہ میں رہتے ہوئے کرتا ہے یا قانون کے دائرہ کو اس قدر پھیلا دیتا ہے کہ اس میں بدترین مظالم بہ سہولت سما جاتے ہیں.

ریشمی رومال تحریک کا راز فاش ہو جانے کے بعد برطانوی راج نے ایک خانہ ساز خانہ زاد کمیٹی قائم کی جس نے ان گنت ہندستانیوں پر مظالم، ایذا رسانی اور تشدد کو قانونی جواز مہیا کیا. اس کمیٹی کا سربراہ ایک بدنام زمانہ انگریز جج سڈنی آرتھر ٹیلر رولیٹ (Sidney Rowlatt) (۱۸۶۲-۱۹۴۵) تھا. رولیٹ کے علاوہ اس پانچ رکنی مظالم کمیٹی کا سکریٹری بنگال سول سروس کا جے. ڈی. وی. ہوج (J D V Hodge) تھا. کمیٹی میں مزید دو انگریز اور دو ہندستانی ہندو رکن تھے

♦ بیسل سکاٹ (Basil Scott) بمبئی ہائی کورٹ کا چیف جج.

♦ سی. وی. کمارا سوامی ساستری (C V Kumaraswami Sastri) مدراس ہائی کورٹ کا ہندستانی جج.

♦ ویمی لویٹ (Vemey Lovett) یو. پی کے بورڈ آف ریوینیو (مجلس محصولات) کا رُکن.

♦ پی. سی. متر (P C Mitter). بنگال قانون ساز کونسل کا ہندستانی رکن.

برطانوی خفیہ پولس کی ذیلی اس کمیٹی نے مولانا عبیداللہ سندھی اور مولانا محمد میاں منصور انصاری کے خطوط کا بغور جائزہ لیا اور ایک ایک سطر اور نام پر گرفت کی تھی. اس کی

ہدایات پر ہندستان میں انگریز کی سرکاری دہشت گردی کا ایک نیا دور شروع ہوا.

رولٹ رپورٹ میں اس مہم کو سازش قرار دیا گیا تھا اور ایک عرصہ تک یہ تحریک ''ریشمی رومال سازش'' کے عنوان ہی سے بیان کی جاتی رہی. روزنامہ انقلاب بمبئی کے کمیونسٹ مدیر ظ. انصاری (سہارنپوری) نے ۱۹۵۰ میں اسے ریشمی رومال تحریک کا عنوان دیا.

رولٹ رپورٹ کی زیادہ توجہ مولانا محمد میاں منصور انصاری کی شخصیت پر مرکوز رہی اور ان کے خط میں مذکور افراد کا خاص طور سے ذکر کیا گیا تھا. اس میں متعدد جگہوں پر مولانا محمد میاں انصاری کا تذکرہ کیا ہے، نیز ان تمام افراد کے بارے میں حتی الامکان تفصیلات جمع کیں جن کا ذکر مولانا محمد میاں منصور انصاری یا مولانا عبید اللہ سندھی نے معمولی طور پر بھی کیا تھا، حتی کہ مولانا محمد میاں منصور انصاری نے اپنے خط میں جن حضرات کی طرف سے شیخ الہند اور ان کے رفقاء کو سلام بھیجا تھا یا جن رفقاء کا نام لے کر اپنی طرف سے سلام پیش کیا تھا ان سب کا تذکرہ بھی خفیہ کمیٹی کی رپورٹ میں ملتا ہے. ذیل میں ایسی کچھ شخصیات کے تذکرے کی وہ سطور بہ طور خاص پیش کی جارہی ہیں جن میں مولانا محمد میاں منصور انصاری کے خط کے حوالے سے گفتگو کی ہے. سید محمد میاں نے کسی سبب سے انہیں نظر انداز کیا.

یہ تمام تفصیلا ت ڈاکٹر عابد اللہ غازی صاحب کی فراہم کردہ اس انگریزی تحریر سے ماخوذ ہیں جو انہوں نے ۱۹۶۰ میں بذاتِ خود لندن میوزیم اور انڈیا آفس لائبریری کے سرکاری کاغذات سے تحریک ریشمی رومال پر تحقیق کے دوران اس رپورٹ کی اصل سے نقل کی ہیں. اس کی نقلیں انہوں نے سید محمد میاں اور سید اسعد مدنی کو خود دی تھیں.

خفیہ محکمہ کی یہ رپورٹ تین حصوں پر مشتمل ہے پہلا حصہ شخصیات سے متعلق دوسرا حصہ دستاویزات سے متعلق اور تیسرا حصہ انقلابی کتب سے متعلق ہے.

اس رپورٹ کے پہلے حصہ کا سرورق رولٹ کمیٹی رپورٹ کے اجزاء مندرجہ ذیل ہے. یہ حصہ ۷۰ اصفحات پر مشتمل ہے.

FilePrevious

Department Secret and Political

p.4260

1916

Subject:Afghanistan - "Silk Letter Case"

حاجی عبدالرزاق کابلی چیف جج وریڈر سردار نصراللہ خاں کے بیان کے ذیل میں مولانا محمد میاں نے مولانا محمودالحسن کو بھیجے ہوئے اپنے ریشمی خط میں بیان کیا

سردار نصر اللہ خاں نے مولانا عبید اللہ سندھی کے ذریعہ بھیجے ہوئے مہاجرین کے وفد کو دربار میں پہنچا دیا جس نے حاجی عبدالرازق صاحب کی حمایت میں بیان دیا.

محمد میاں لکھتے ہیں (صفحہ۲)

''حاجی عبدالرزاق کی حمایت اور نائب السلطنت کی مہربانیوں کے طفیل انگریزی تعلیم یافتہ وہ طلباء جو ہندستان سے ہجرت کر گئے تھے اور کچھ سکھ بڑی تعداد میں ان کے ہمراہ تھے'' (ص۱۷)

ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے بڑے بھائی حکیم عبد الرزاق انصاری کے بیان کے ذیل میں مولانا محمد میاں نے مولانا محمودالحسن کو بھیجے ہوئے ریشمی خط میں لکھا ہے

''حکیم صاحب بذات خود آپ کے گھر ہر ماہ تشریف لے جاتے ہیں اور پچاس روپیے ماہانہ دیتے ہیں. دوتین بقایا ماہ کے ادا کرنے کے لیے وہ درمیان میں بھی ایک دوبار گھر جاتے ہیں. قاضی صاحب، حکیم صاحب، ڈاکٹر صاحب اور مولانا رائے والا آپ کی مراجعت ہند کی مخالفت کرر ہے ہیں'' (ص۱۱)

''حکیم عبدالرزاق صاحب کا نام جنود حزب اللہ کی فہرست میں لیفٹننٹ جنرل کی حیثیت سے آٹھویں نمبر پر درج ہے'' (ص۱۹)

آ گے لکھا ہے

''محمد میاں ان علاقوں میں موجود نہیں ہیں. ان کو ایک طویل عرصہ سے نہیں دیکھا گیا ہے وہ شاید سرحدی علاقوں میں چلے گئے ہیں'' (ص۲۱)

مزید آ گے تحریر ہے

''حکیم عبدالرزاق نے بحری جہاز کے سفر کے تمام انتظامات کئے. خورد ونوش اور روزمرّہ استعمال کی اشیاء ضروریہ، سینکڑوں انڈے، مرغ اور دیگر سامانِ آسائش کی خریداری جو پانچ سو بلکہ ہزار روپئے سے زائد تھی. مولوی مرتضیٰ حسن اور محمد میاں میرے اور مولانا مطلوب الرحمٰن کے بعد بمبئی آئے. حکیم عبدالرزاق نے ان کے ٹکٹ کا بھی انتظام کیا لیکن اس کے پیسے مولانا سے لیے. بمبئی میں پوری جماعت کے کھانے کے انتظامات حکیم عبدالرزاق ہی نے کئے'' (ص۲۳)

عبدالوحید ولد صدیق احمد ٹانڈوی (فیض آبادی) مولانا حسین احمد مدنی کے بھتیجے کے بیان میں محمد میاں کے ریشمی خط میں وضاحت کی گئی ہے

''برادرِ عزیز وحید، مولانا حسین احمد اور دیگر حضرات جو ان کے ساتھ ہیں، ان کو مولوی عبید اللہ، فضل ربی، فضل محمود، عبدالعزیز اور مہاجر طلباء سلام پہنچاتے ہیں''

مولوی احمد جان یار محمد خان روسی ترکستانی کے بیان میں محمد میاں نے ریشمی خط میں لکھا ہے

''مولوی عبید اللہ، سیف الرحمان، فضل ربی، فضلِ محمود، اور تمام مہاجر

طلباء، وحید احمد، مولانا حسین احمد، ان کے والد و برادران حرمت اللہ اور احمد جان کو سلام پہنچاتے ہیں'' (ص ۴۳)

مولوی حکیم احمد رامپور منیہاران (سہارنپور) کے بیان میں

''مولوی محمد میاں نے اپنے ریشمی خط میں لکھا ہے

''رامپوری مولوی نے اپنے آپ کو حمایت دینے سے الگ رکھا ہے اور انہوں نے وہ رقم لینے سے انکار کر دیا ہے جو اس صورت میں انہیں دی جارہی تھی'' (ص ۴۷).

اس بیان میں صداقت نہیں معلوم ہوتی.

مولوی عزیز گل سید کا کاخیلی ولد شاہد گل کے بیان میں

''ہادی حسن (صفحہ ٦) نے بیان کیا ہے کہ عزیز گل ان لوگوں میں سے ایک ہے جو مولانا کے مکان کو اکثر و بیشتر استعمال کرتے تھے. دوسرے حضرات کے نام مرتضٰی، خاں محمد وحید، محمد سہول اور مولانا محمد میاں ہیں'' (ص ۴۵)

اس میں آگے یہ بھی تحریر ہے

''عزیز گل نے مجھے یہ بھی بتایا کہ جب انہیں محمد میاں نے ملایا تو وہ انہیں پندرہ بیس روپیہ دیتے تھے جو میں بھول گیا تھا'' (ص ۵۵)

مولوی برکت اللہ ولد قدرت اللہ بھوپالی کے بیان کے ضمن میں

محمد میاں نے اپنے ریشمی خط میں ایک جگہ یہ بھی تحریر کیا ہے کہ

''حاجی عبد الرزاق کی قیادت اور نائب السلطنت کی مہربانیوں سے انگریزی تعلیم یافتہ طلباء اور آزاد سکھوں کی وہ حمایت جو ترک وطن کر کے چلے گئے تھے پھر سے مل گئے''.

اس میں آگے تحریر ہے

''محبّ وطن جوانوں کی ایک جماعت جس کا صدر ایک ہندوستانی راجہ جو اس وقت کابل میں قیام پذیر ہے اس نے بادشاہِ سلطنت وشاہِ جرمن کو ایک رازدارنہ خط دیا ہے. ناظم صاحب (مولانا عبیداللہ سندھی) اور مولانا برکت اللہ بھوپالی اس جماعت کے سیکریٹری ہیں. یہ جماعت ایک عارضی حکومت کے قیام کی کوشش کررہی ہے جو دیگر طاقتوں کے ساتھ مل کر (انگریزوں سے) مقابلہ کرسکے. اس میں انہیں ابتدائی کامیابی مل چکی ہے'' (ص٦٠)

مولوی مبین نے اپنے ایک بیان میں (صفحہ۳) کہا ہے

''جس دن فضل الحسن (حسرت موہانی) کی انبالہ میں گرفتای کی خبر لاہور کے اخبارات میں شائع ہوئی اس دن محمد میاں اور احمد میاں میرے ساتھ انبالہ میں تھے اور محمد میاں اپنے سرحدی علاقوں کی طرف جانے کے بارے میں کہہ رہے تھے. انہوں نے موٹر کے ذریعہ جانے کی کوشش کی تھی. میں نہیں جانتا کہ ان پر کیا گذری لیکن مجھے یہ معلوم ہے کہ محمد میاں فضل الحسن کی گرفتاری کی خبر سُن کر تشویش میں مبتلا ہوئے تھے، اور وہ یہ بھی کہہ رہے تھے کہ مجھے اندیشہ ہے کہ اب ان خطوط کا راز افشاء ہوجائے گا. کیونکہ عبیداللہ سندھی کا وہ فرمان جس کے ذریعہ فضل الحسن کو بلایا گیا تھا پولیس کے ذریعے پکڑا جاچکا ہے'' (ص٦٥)

''یہ خطوط ان خیالات کی نشاندہی کررہے ہیں جو ہم جانتے ہیں کہ محمد میاں، فضل الحسن (حسرت موہانی) سے بیوی کو ہمراہ لے کر کابل آنے پر ناراض تھے'' (ص٦٦)

''محمد نورالدین جو کہ فضل الحسن (حسرت موہانی) کی گرفتاری سے قبل اس

کی علی گڑھ والی سودیشی دوکان پر ملازم تھا، کا بیان ہے کہ وہ مولوی محمد میاں کو جانتا ہے. اس نے یاد کر کے بتایا کہ محمد میاں کی ملاقات فضل الحسن سے ۴ یا ۵ اپریل کو ہوئی تھی. وہ شام کی نماز سے پہلے آئے تھے اور فضل الحسن دوکان بند کر کے ان کے ساتھ نماز کے لیے چلے گئے تھے ''(ص ۶۷)

مولوی فضل محمود، (حاجی ترنگ زئی کے ایک ساتھی) کے بیان میں

مولوی محمد میاں کے ریشمی خط میں مندرجہ ذیل پیراگراف بھی ملتا ہے

''ایک مہینہ یاغستان کے قیام کے بعد میں مہاجرین کے ایک وفد کے ساتھ کابل پہنچا. مولانا سیف (الرحمٰن) جو جماعت سے بچھڑ گئے تھے یہاں آ کر مل گئے. حکومت سازی کا عمل یہاں شروع ہو گیا. وفد کے ممبران میں دونوں فضل (فضل محمود اور فضل ربی) اور (مولانا سندھی کے بھتیجے) عبدالعزیز تھے. مولانا ناظم (عبیداللہ سندھی) اور حاجی عبدلرزاق صاحب کے تعاون سے وہ نصراللہ صاحب کے دربار میں پہنچا'' (ص ۷۴)

مولوی فضل واحد المعروف بہ حاجی ترنگ زئی کے بیان میں

مولوی محمد میاں نے اپنے ریشمی خط میں تحریر کیا ہے

''اس نے غالب نامہ کے (غالب پاشا کا فرمان) یاغستان پہنچانے کے بعد یہ بھی وضاحت کی ہے کہ حاجی اس وقت مہمند میں ہے. مہاجرین نے مہمند، باجوڑ اور سوات اور دیگر علاقوں میں آگ بھڑکا دی ہے. ان علاقوں میں غالب نامہ کی اشاعت نے خاص کردار ادا کیا ہے'' (ص ۷۹)

حبیب اللہ ولد روح اللہ کاکوری کے بیان میں

'' مولوی محمد میاں نے اپنے ریشمی خط میں ڈاکٹر شاہ بخش، سید حاجی

خدا بخش اور حبیب اللہ غازی کو سلام پہنچایا ہے‘‘ (ص ۸۴)

مولوی حرمت اللہ روسی ترکستانی کے بیان میں

مولوی محمد میاں کے ریشمی خط میں دیگر افراد کے ساتھ

’’مولوی حرمت اللہ کو بھی سلام پہنچایا ہے‘‘ (ص ۹۲)

مولوی حسین احمد مدنی کے بیان میں

’’مولوی محمد میاں کے ریشمی خط میں دیگر افراد کے ساتھ مولوی حسین احمد کو بھی سلام پہنچایا گیا ہے‘‘ (ص ۹۴)

کنور مہندر پرتاپ آف مرسان و برندابن کے بیان میں

مولوی محمد میاں نے ریشمی خط میں ان خصوصی امور کو سراہتے ہوئے جو نائب السلطنت نے عبید اللہ کے ذریعہ ان کو تفویض کئے تھے تحریر کیا ہے:

’’ہندستان کو آزاد کرانے کے لیے ایک جماعت ہے. جس کا صدر ایک ہندستانی راجہ ہے جو کابل میں قیام پذیر ہے. وہ یہاں ان رازدارانہ خطوط کے ذریعہ پہنچا جو اس نے عالی جاہ سلطان (عثمانی ترکی) وصدر جرمن سے حاصل کئے تھے. ناظم صاحب (عبید اللہ سندھی) اور مولوی برکت اللہ بھوپالی اس جماعت کے وزراء ہیں. اس جماعت نے قیام حکومت کا کام شروع کر دیا ہے. اس کے مراکز ہندوستان میں قائم کر کے دوسری بڑی طاقتوں کے ساتھ رابطہ کرنا ہے. ابتدائی مراحل کامیابی کے ساتھ مکمل ہو گئے ہیں. سرحد کے متحرک طلباء اس کام میں جٹ گئے ہیں ان میں سے کچھ طلباء خلیفہ کے دربار میں پہنچنے کے بعد آپ سے ملاقات کریں گے. انشاء اللہ‘‘ (ص ۱۰۲)

ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے بیان میں

مولوی محمد میاں نے اپنے ریشمی خط میں یہ بھی تحریر کیا ہے

''حکیم صاحب (عبدالرزاق انصاری) بذات خود آپ کے گھر گئے اور درمیانی مدت کے پچاس روپیے ماہانہ دیئے. وہ آپ کے گھر جا چکے ہیں. خاص طور سے ڈاکٹر صاحب ایک دو مرتبہ جا چکے ہیں. قاضی صاحب، حکیم صاحب، ڈاکٹر صاحب اور مولانا رائے والا سنجیدگی کے ساتھ آپ کو باعزت ہندستان واپس لانے کے لیے کوشاں ہیں'' (ص۱۴۲)

مولوی محمد میاں نے اپنے ریشمی خط میں بیان کیا ہے

'' سرحد پار کرنے کے سلسلہ میں سید نور الحسن سست واقع ہوا ہے.'' (ص۱۴۵)

مولوی سیف الرحمٰن ولد غلام خاں ضلع پشاور، استاد مدرسہ فتح پوری مسجد دہلی کے بیان میں

'' مولوی محمد میاں نے اپنے خط میں جن لوگوں کو سلام لکھا ہے ان میں مولوی سیف الرحمٰن کا بھی نام شامل ہے'' (ص۱۵۲)

الحاج ڈاکٹر شاہ بخش والد امام بخش بلوچ کے بیان میں

''مولوی محمد میاں نے اپنے ریشمی خط میں ڈاکٹر شاہ بخش کو بھی سلام تحریر کیا ہے.'' (ص۱۵۷)

مولانا شوکت علی صاحب کے بیان میں

''مولوی محمد مبین نے اپنے اضافی بیان میں (صفحہ۵) کہا ہے

''میں نے مولوی عزیز گل اور مولوی محمد میاں سے سُنا کہ مولوی عبدالباری فرنگی محلی اور محمد علی و شوکت علی برادران بھی مولانا کے خیالات سے متفق ہیں'' (ص۱۶۱)

شجاع اللہ ولد حبیب اللہ لاہوری کے بیان میں

''مولوی محمد میاں نے اپنے ریشمی خط میں راجہ مہندر پرتاپ کی جماعت کے تحت جو کچھ تذکرہ کیا ہے اس جماعت کا ایک کرنل (عبید اللہ سندھی کے ریشمی خط کے بیان کے مطابق) شجاع اللہ ہے'' (ص۱۶۲).

مولوی ظہور محمد رڑکی کے بیان میں

مولانا محمد میاں نے اپنے ریشمی خط میں تحریر کیا ہے

''مولوی ظہور صاحب ہماری بمبئی واپسی پر ہمیں لینے کے لیے پہنچے''. (ص۱۶۵).

دوسرے حصہ میں مقبوضہ دستاویزات کو رومن انگریزی میں پیش کرنے کے ساتھ ساتھ انگریزی سادہ زبان میں ترجمہ بھی پیش کیا گیا ہے. اس میں صفحہ ۹ تا صفحہ ۱۱ پر مولانا محمد میاں کے ریشمی خط کا انگریزی ترجمہ، صفحہ ۱۱ نیز صفحہ ۱۶ و صفحہ ۱۷ ایران کا خط انگریزی رسم الخط میں شائع کرنے کے بعد کچھ مزید ثبوت فراہم کر کے سب سے اہم گواہ عبدالحق سابق جیون داس ولد لورنداداس کا تفصیلی بیان شامل کیا گیا ہے. یہ حصہ سات صفحات پر مشتمل ہے. علاوہ ازیں اس رپورٹ کے ۱۳۶ تا ۱۴۱ صفحات مولانا محمد میاں سے متعلق ہیں جن میں ان کے متعلق تفصیلات مہیا کی گئی ہیں.

تیسرے حصہ میں ان تحریروں کا ترجمہ کیا گیا ہے جو مجاہدین کے کیمپوں سے مسلمانوں میں انقلابی روح پھونکنے کے لیے شائع کی جارہی تھیں اور انگریز انہیں قابل گرفت سمجھتے تھے یہ رپورٹ ستر صفحات پر مشتمل ہے.

تاریخ آزادی میں رولیٹ کمیٹی رپورٹ کے نام سے معروف یہ دستاویز مکمل حقائق پر مشتمل نہیں ہے. اس میں بیشتر معلومات ناقص ہیں اور بہت سے رازوں سے پردہ ہی نہیں اٹھا. یہ رپورٹ تقریبا ایک ہزار صفحات پر مشتمل ہے جس میں اعادہ و تکرار بہت زیادہ ہے. جواہر لال نہرو نے اس رپورٹ کو سیاہ قانون سے تعبیر کیا تھا.

رولیٹ نے اپنی رپورٹ میں شیخ الہند کی مہم کو عظیم تحریک بتلایا ہے. اس کے متعلق اس نے جو تفصیلات بیان کی ہیں ان کا درج ذیل خلاصہ پیراگراف ۱۶۴ سے ماخوذ ہے.

یہ ایک منصوبہ تھا جو ہندستان میں اس خیال سے تیار کیا گیا تھا کہ ایک طرف شمال مغربی سرحد پر گڑبڑ پیدا کی جائے اور دوسری طرف ہندستانی مسلمانوں کی شورش سے اسے تقویت دے کر برطانوی حکومت کو ختم کر دیا جائے. اس تجویز پر عمل کرنے اور اسے تقویت دینے کے لیے عبید اللہ نامی ایک شخص نے اپنے تین ساتھیوں کے ہمراہ اگست ۱۹۱۵ میں شمال مغربی سرحد کو عبور کیا. عبید اللہ پہلے سکھ تھا بعد میں مسلمان ہوا اور دیوبند کے مذہبی مدرسہ میں تعلیم حاصل کی. عبید اللہ کو جن لوگوں نے متاثر کیا ان میں اس کے استاذ مولانا محمود الحسن کی شخصیت خاص ہے. عبید اللہ کی خواہش تھی کہ دار العلوم کے فارغ التحصیل علماء کے ذریعے ہندستان میں برطانیہ کے خلاف ایک عالمگیر اسلامی تحریک چلائی جائے جس کے لیے مولانا محمود الحسن کے مکان پر خفیہ مجلسیں ہوتی تھیں جن میں سرحد کے کچھ آدمی بھی شریک ہوتے تھے. ستمبر ۱۹۱۵ میں محمود الحسن نے محمد میاں اور دو دوستوں کے ساتھ عبید اللہ کی پیروی کرتے ہوئے شمال کی طرف جانے بلکہ صوبۂ حجاز میں مقیم ہونے کے لیے ہندستان چھوڑ دیا.

آگے لکھا ہے

عبید اللہ اور اس کے دوست نے (افغانستان جانے سے) پہلے ہندستانی متعصب مجاہدین سے ملاقات کی. اس کے بعد کابل پہنچے. وہاں ترکی اور جرمنی کے ممبران سے ملے اور ان سے تبادلۂ خیال کیا. تھوڑے عرصہ بعد ان کا دیوبندی دوست مولوی محمد میاں انصاری بھی آملا. یہ آدمی مولانا محمود الحسن کے

ساتھ عرب گیا تھا اور ۱۹۱۶ میں وہ اعلان جہاد لے کر آیا جو حجاز کے ترکی حاکم غالب پاشا نے مولانا محمود الحسن کو دیا تھا. درمیان راہ میں محمد میاں نے اس کی نقلیں ہندستان اور سرحدی قبائل میں تقسیم کیں.

عبیداللہ اور اس کے ساتھیوں نے برطانوی حکومت کے خاتمے پر عارضی حکومت کے لیے ایک تجویز تیار کی تھی. اس تجویز کے مطابق اس کا صدر راجہ مہندر پرتاپ تھا جو ہندستان کے ایک معزز خاندان کا جذباتی ہندو ہے. اسے ۱۹۱۴ کے اواخر میں سوئز رلینڈ، اٹلی اور فرانس وغیرہ جانے کے لیے پاسپورٹ دیا گیا تھا. وہ سیدھا جینوا گیا اور وہاں بدنام زمانہ (امریکن غدر پارٹی کے لالہ) ہردیال سے ملا. جس نے اسے جرمن قونصل سے ملایا. وہاں سے یہ جرمنی آیا اور ایک خاص مشن پر کابل بھیجا گیا جہاں وہ عارضی حکومت ہند کا صدر ہونے والا تھا. خود عبید اللہ ہندستان کا وزیر ہونے والا تھا اور برکت اللہ (بھوپالی) کو وزیر اعظم بننا تھا جو کرستاورن (؟) کا دوست اور امریکن غدر پارٹی کا ممبر تھا. اس نے برلن کے راستے کابل کا سفر کیا تھا اور انگلستان، امریکہ اور جاپان ہو آیا تھا''.

غالبًا ان لوگوں کے ساتھ جرمنی کے کچھ اعلیٰ عہد یداران بھی افغانستان آئے تھے جنہوں نے افغانستان کے حکمراں امیر حبیب اللہ خاں سے ہندستان پر حملہ کرنے کی درخواست کی تھی لیکن امیر حبیب اللہ نے تجویز مسترد کردی تھی کیونکہ وہ درحقیقت انگریزوں کے دام فریب میں پھنسا ہوا تھا لیکن اس کا اظہار نہیں کر سکتا تھا. یہ ایک الگ موضوع ہے.

راجہ مہندر پرتاپ اور مولانا برکت اللہ بھوپالی کے ساتھ کچھ جرمن بھی تھے. اس وجہ سے رولیٹ اپنی رپورٹ میں آگے تحریر کرتا ہے:

مشن کے جرمن ممبران ۱۹۱۶ کی ابتداء میں اپنے مقصد میں ناکام ہو کر

افغانستان سے چلے گئے. ہندستانی ممبر وہیں رہے. انہوں نے عارضی حکومت کی جانب سے روسی ترکستان کے گورنر اور زارِ روس کو خطوط بھیجے جن میں ان سے برطانیہ کا ساتھ چھوڑنے اور ہندستان میں برطانوی حکومت کا خاتمہ کرنے کے لیے امداد طلب کی. ان خطوط پر راجہ مہندر پرتاپ کے دستخط تھے. آخر میں وہ خطوط برطانیہ کے ہاتھ لگ گئے. زار روس کے نام خط سونے کے پترے پر لکھا ہوا تھا جس کی عکسی تصویریں دکھائی گئی ہیں. حکومت عارضی نے ترکی حکومت کے ساتھ اتحاد پیدا کرنے کی تجویز پیش کی اور اس مقصد کے لیے عبیداللہ نے مولانا محمود الحسن کو خط لکھا کہ یہ سارے واقعات سلطنت عثمانیہ تک پہنچا دیں. اس خط کے ساتھ یہ خط اور ایک اور خط ۹ جولائی ۱۹۱۶ کے ساتھ جو مولانا محمد میاں نے (شیخ الہند کے نام) لکھا تھا بند کر کے اس نے حیدر آباد سندھ کے شیخ عبدالرحیم کے نام ایک نوٹ لکھ کر بھیجا کہ وہ کسی معتبر حاجی کے ہاتھ یہ خطوط مکہ میں محمود الحسن تک پہنچوا دیں. یہ خطوط ریشمی کپڑے پر بہت صاف اور خوشخط لکھے ہوئے تھے.

اس کے بعد رَولیٹ نے ان خطوط کے ان نکات پر روشنی ڈالی ہے جو گذشتہ صفحات میں تفصیل سے آ چکے ہیں.

پرآشوب زمانہ

ریشمی خطوط کے افشا کے بعد تحریک نئے مرحلے میں داخل ہوگئی. شیخ الہند مولانا محمود الحسن حجاز مقدس میں مقیم تھے اور عالم اسلام کے حالات سے سخت مضطرب تھے. وہ شدید انتشار اور آشوب کا زمانہ تھا. ترکی میں خلافت کو ختم کرنے کے لیے روس کے علاوہ انگریزوں نے جو تانے بانے بنے تھے اس میں انہوں نے حجاز اور نجد کے عرب حکمرانوں کو ساتھ ملا لیا تھا جس کی وجہ سے حرمین شریفین کا تقدس خطرہ میں پڑ چکا تھا. انگریزوں نے جزیرۃ العرب کو عثمانی سلطنت ترکی کے خلاف کھڑا کر کے مسلمانوں کی مرکزیت ختم کرنے کی جو مہم شروع کی تھی وہ شیخ الہند کی تحریک کے قائدین کے لئے انتہائی تشویش کا باعث تھی. حجاز میں برطانوی فوجی جاسوس ٹی ای لارنس (T E Lawrence) نے عربوں کو قومیت اور عرب سلطنت کے نام پر ورغلا کر ترکی کے خلاف کھڑا کر دیا تھا. اس عرب گروہ کی قیادت شریف مکہ حسین ابن علی اور اس کا بیٹا علی ابن حسین کر رہا تھا. دوسری جانب شریف مکہ سے سخت اعتقادی اختلاف رکھنے والا درعیہ نجد کا امیر ابن سعود بھی شریف حسین کی طرح تین انگریزوں، چارلس ڈاوٹی، مس گرٹروڈ بیل اور کیپٹن ولیم شیکسپیر (Charles Doughty, Miss Gertrude Bell, Capt William Shakespeare) کے دام میں الجھا ہوا تھا اور ترکوں کو لادین اور بدعتی قرار دیتا تھا. تیسری جانب فرانس کی یونیورسٹیوں میں تعلیم پانے والے شامی اور لبنانی نوجوانوں میں بھی ترکوں سے مغائرت اور عربیت کا احساس پیدا ہو رہا تھا. فرانسیسی مستشرقین میں لوئی سیدیو (Louis Sedillot) نے ۱۸۵۴ میں تاریخ عرب (اردو ایڈیشن: تمدن عرب) شائع کی جس میں عربوں میں احساس برتری

پیدا کرنے کی کھلی کوشش کی گئی تھی تا کہ انہیں ترک عالمی اسلامی قیادت کی چھتری سے باہر نکالا جا سکے.

لیکن ان سب عرب عناصر میں مکہ کے شریف حسین کا کردار سب سے زیادہ مکروہ تھا اور تاریخ میں وہی زیادہ بدنام ہے.

ترک سلطنت عثمانیہ کے خلاف شریف حسین کے اقدامات اور انگریزوں کے ساتھ تعاون دنیا کے مسلمانوں کی مرکزیت پر ضرب کاری تھا جس کے برے اثرات خود ہندستان کی تحریک آزادی پر پڑ رہے تھے. شیخ الہند کی مہم پر خطرات منڈلا رہے تھے جو طویل جدوجہد کے بعد کسی نتیجہ پر پہنچنے کے قریب تھیں. شیخ الہند ان حالات سے پریشان تھے.

بجا کہ غالب نامہ راز نہیں رہ گیا تھا کیونکہ اس کی لاتعداد نقلیں شمال سرحدی علاقوں میں تقسیم ہو چکی تھی لیکن تحریک کا منصوبہ برطانوی راج میں کسی کے علم میں نہیں تھا. یہ راز عبدالحق عرف جیون داس اور رب نواز کی وجہ سے کھلا جب مولانا عبیداللہ سندھی اور مولانا محمد میاں منصور انصاری کے خطوط برطانوی حکومت ہند کے ہاتھ لگے. وہ شیخ الہند کو گرفتار کرنے کے لئے حرکت میں آ چکی تھی لیکن بلا کسی وجہ کے اچانک انہیں گرفتار کرنا انگریزوں کو پریشانی میں مبتلا کر سکتا تھا. اس لیے انگریزوں نے ایک اور چال چلی.

چنانچہ انگریزوں کے ہم نوا مسلم نمائندوں نے عرب جا کر عرب علماء کے سامنے ایک ایسا محضر نامہ تیار کرنے کی بات رکھی جس میں ترکوں اور ان کی حکومت اور خلافت کی برائیاں بیان ہوں، ان کے استحقاق خلافت کو پرزور طریقہ سے رد کیا جائے اور انقلابی قومی تحریک کے برخلاف برطانوی راج کی خوبیاں گنوائی جائیں. ایسا محضر نامہ تیار کیا گیا اور زمینی حقائق سے بے خبر عرب علماء سے اس پر دستخط لے کر اس محضر نامہ کو شیخ الہند کے سامنے دستخط کے لیے پیش کیا گیا. اس محضر نامہ میں دیگر امور کے ساتھ سلطان عبدالحمید خاں ثانی کی تکفیر بھی کی گئی تھی. شیخ الہند نے اس پر دستخط کرنے سے معذرت کی کہ وہ عربوں کا محضر تھا اور

خود شیخ الہند ہندستانی تھے تو عربوں کے اس محضر پر دستخط نہیں کر سکتے تھے. اسی زمانہ میں خود ترکی میں معزول سلطان کی کردارکشی کی مہم میں مشرقی اور مغربی یورپ میں تعلیم حاصل کرنے والے ترک نوجوانوں کا ایک گروہ سرگرم ہو چکا تھا عبدالحمید خاں ثانی آخری عثمانی سلطان اعظم تھے جو اسلامی مرکزیت پر تمام دنیا کے مسلمانوں کو متحد کرنے کی جنگ ۱۸۷۶ سے ۲۷ اپریل ۱۹۰۹ تک ۳۳ سال سے زیادہ مدت تک تنہا لڑتے رہے تھے.

ان امتحانی حالات میں شیخ الہند کو احساس ہوگیا تھا کہ ترکوں کے باغی اور انگریزوں کے فریب خوردہ شریفِ مکہ کی قلمرو میں رہنا خطرہ سے خالی نہیں تھا. اس لیے انہوں نے مکہ معظّمہ سے نکل جانا مناسب جانا. ابھی وہاں سے نکلنے کا انتظام نہ ہوا تھا کہ ان کے رفقاء مولانا حسین احمد مدنی، مولانا عزیرگل، حکیم نصرت حسین اور وحید احمد کو گرفتار کرلیا گیا. جب شیخ الہند شریف حسین کی پولس کے ہاتھ نہیں آئے تو شریف حسین نے ایک متعینہ وقت تک شیخ الہند کے پیش نہ ہونے پر ان کے رفقاء کو گولی مارنے کا حکم دے دیا. شیخ الہند کی غیرت نے گوارا نہ کیا کہ ان کے رفقاء مارے جائیں تو وہ از خود پولس کے سامنے پیش ہوگئے. گرفتاری کے بعد ۱۹ دسمبر ۱۹۱۶/۲۳ صفر ۱۳۳۵ھ کو انہیں مکہ معظّمہ سے جدہ بھیج دیا گیا.

تقریباً ایک ماہ جدہ جیل میں رہنے کے بعد ۱۲ جنوری ۱۹۱۷ (۱۸ ربیع الاول ۱۳۳۵ھ) کو اس جماعت کو برطانوی مقبوضہ قاہرہ روانہ کردیا گیا جہاں وہ سیاسی قیدیوں کے جیل میں محبوس رہے. بندرمثال فوجی عدالت (monkey court) میں دکھاوے کا سرسری مقدمہ چلا. ثبوت فراہم نہ ہونے کی وجہ سے سزائے موت تو نہ ہوسکی البتہ ''جیتے جی مرنے کی سزا'' سنائی گئی اور مالٹا کے قید خانے میں ۱۶ فروری ۱۹۱۷ (۲۳ ربیع الثانی ۱۳۳۵ھ) کو بھیج دیا گیا جہاں برطانوی فوجی افسر اُن پر روزانہ جسمانی تشدد کرتے تھے. انہیں ایک تختہ پر منہ کے بل لٹا کر انگریز فوجی پیٹھ پر آہنی زنجیروں سے ضربیں لگاتے تھے. ان پر مستقل جبر تھا کہ ترکوں کی تکفیر کریں اور ان کی خلافت کو غیر شرعی قرار دیں.

شیخ الہند برطانوی حکام کی اس سرکاری دہشت گردی کو برسوں برداشت کرتے رہے لیکن ترکوں کی تکفیر اور خلافت اسلامیہ کے رد کا اعلان کرنے پر راضی نہ ہوئے. اس کی پاداش میں چار سال تک سخت جسمانی تشدد اور نفسیاتی ایذا رسانی کا شکار ہوتے رہے. مستند حوالوں سے اس کی تفصیل محمد طارق غازی نے ''تذکار الانصار'' میں بیان کی ہے:

جون ۱۹۲۰ میں شیخ الہند مالٹا سے رہا ہوکر ہندستان آئے اور نومبر میں ان کا انتقال ہوگیا. خیال ہے مالٹا میں انہیں کچھ زہریلی ادویات دی گئی تھیں جن کے اثر سے وہ شہید ہو گئے. مولانا حسین احمد مدنی (۱۸۷۹-۱۹۵۷) کی روایت ہے کہ غسل میت دینے والوں نے شیخ الہند کے جسم پر زخموں کے نشانات دیکھے اور تحقیق کی تو انہوں نے وہ راز کھولا کہ قید کے دوران انگریز فوجی افسر روزانہ جسمانی تشدد کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ شیخ الہند جنگ عظیم میں ترکی کے خلاف برطانیہ کی حمایت کریں. شیخ الہند انکار کرتے تو ان کو شدید جسمانی اذیت پہنچائی جاتی تھی. مفتی انتظام اللہ شہابی (**علماء حق اور ان کی مظلومیت کی داستانیں**) نے لکھا ہے کہ:

''شیخ الہند کے بدن کو گرم سلاخوں سے داغا جاتا اور انہیں تحریک آزادی سے علیحدگی اختیار کرنے پر مجبور کیا جاتا. مگر شیخ الہند نے ان تمام مصائب کے باوجود اپنے موقف آزادی میں کوئی لچک پیدا نہ کی. ان مصائب کا انکشاف حضرت شیخ الہند کی وفات کے بعد مولانا مدنی نے کیا.''

خلیق احمد نظامی (**تاریخ مشائخ چشت**) ان حالات کے ذکر میں لکھتے ہیں کہ حاجی امداد اللہ اور شیخ الہند کے'' رفقا اور تلامذہ نے ہندستان سے انگریزی حکومت کا اقتدار ختم کرنے کے لئے جن مصائب کا سامنا کیا تاریخ ہند کا کوئی دیانت دار مورخ ان کو نہ بھلا سکے گا.''

یہ بھی تاریخ کا ستم ہے کہ ہندستان تو کیا سارے برصغیر کو وہ دیانت دار مورخ ہی

نہ ملے اور بقول محمد طارق غازی ''ہندستان کے مورخوں نے بہر حال ان تمام لوگوں اور ان کی قربانیوں کو بھلانے میں بڑی عجلت کی''.(تذکار الانصار .سوانحی شذرہ-محمد میاں منصور انصاری. ص۴۰۳-۴۰۴).

اس طرح تحریکِ آزادی کا یہ باب جو تاریخ میں ''ریشمی'' ہوتا تار تار ہوا اور بند ہو گیا.ریشم کی ردا کو خارزار ملے یا ریشم کی گٹھری کو طاق نسیاں اس سے کسی قوم کی عبائے فاخرہ بننا تاریخ میں مقدر نہیں ہوتا.

اک جان کا زیاں ہے تو ایسا زیاں نہیں

اس عہد کی تاریخ سے اندازہ ہوتا ہے کہ شیخ الہند کے بعد اس تحریک کے قائد مولانا محمد میاں منصور انصاری تھے.رولیٹ کمیٹی کی رپورٹ میں انہی کو ریشمی رومال تحریک کا شعوری سرمایہ قرار دیا گیا ہے.

اس تاریخی شعور کا قریب ترین منبع شاہ ولی اللہ دہلوی کی عمرانیات میں تھا جس کے دوسوسالہ تسلسل میں اسلامی علماء اور اہل اللہ نے آزادی ہند اور حریت عالم اسلام کے لئے یہ عظیم منصوبہ ترتیب دیا تھا.اس کی تکمیل میں شیخ الہند نے ۱۵ سال لئے اور ۱۹۰۵ میں جب دارالعلوم دیوبند کے صدر مدرس بنائے گئے تو ملک کے علماء اور دانشوروں کو متوجہ کیا کہ آزادی کے لئے مسلح جدوجہد ضروری ہے.

تاریخی اصول مزاحمت کی بنیاد پر شیخ الہند اور ان کے رفقاء نے اپنی مہم کا ہدف اور طریقہ عمل وضع کیا تھا جس پر وہ تاریخ میں مورد الزام نہیں ہیں.جنگ میں ہر محاذ کی اپنی حکمت حربی ہوتی ہے.شیخ الہند جانتے تھے کہ ان کے منصوبۂ آزادی کی تکمیل کے لئے انگریزوں کے حریف ممالک کا مالی،فوجی اور اخلاقی تعاون ضروری بھی تھا اور حربی نقطۂ نظر سے مناسب بھی.مسلح جدوجہد کا یہ منصوبہ جامع،مربوط اور مکمل تھا.اسے مرتب کرنے میں ۱۵ سال کی پیش رفت بھی حوصلہ افزا تھی.مگر قدرت کے اپنے فیصلے ہوتے ہیں.ساری کوششیں

آن کی آن میں ختم ہوگئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ طاقتیں مجتمع ہونے لگیں جو اس انقلابی تحریک کی مخالف اور دشمن تھیں.

انقلاب برپا نہ ہوسکا مگر وہ نہ بغاوت کی ناکامی تھی نہ قابل مذمت.انگریزوں نے اسے بغاوت اور سازش کا نام دیا تو وہ ان کے غصہ کا نتیجہ تھا کیونکہ اس تحریک کے نتیجہ میں برطانیہ کی سالانہ مالی یافت میں کروڑوں پاؤنڈ کی کمی ہوجاتی اور برٹش امپائر دوبارہ ایک حقیر سے رقبہ کے غریب و نادار ملک میں سمٹ جاتی جیسا کہ آج کا برطانیہ ہے.

لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ریشمی رومال تحریک کے ختم ہوتے ہی گاندھی جی تحریک آزادی شروع ہوجاتی ہے.جس زمانہ میں ریشمی رومال تحریک مرتب کی جارہی تھی اس وقت کانگریس میں گنگادھر تلک ،موتی لال نہرو، چترنجن داس وغیرہ سوراج (مختاریت) کے حامی تھے،لیکن ۱۹۲۰ میں یہی لوگ انگریزوں سے عدم موالات اور آزادی کے حامی بن کر نمایاں ہوئے.ان قومی رہنماؤں کو یہ حوصلہ شیخ الہند کی تحریک ریشمی رومال ہی سے ملا تھا.اس اعتبار سے ریشمی رومال تحریک مکمل آزادی کی راہ کا سب سے اہم سنگ میل ثابت ہوتی ہے..

سیاسی عمل میں ریشمی رومال تحریک غیر موثر ہوئی تو اس کے کئی رہنما اور کارکن گرفتار ہوئے اور قید وبند کی سختیوں اور سرکاری تشدد کا شکار ہوئے یہاں تک کہ خود شیخ الہند اور ان کے رفقاء کو دیار حرم میں بھی پناہ نہ ملی اور اسلام کے نام لیواؤں نے انہیں فرنگیوں کے حوالہ کردیا لیکن قابل ذکر اور قابل تعریف ہے افغانوں کی غیرت ملی اور ایمانی قوت کہ افغانستان میں موجود شیخ الہند کے جاں نثاروں نے ان کے رفقاء کو انگریزوں کی حراست میں نہیں دیا.

شیخ الہند اور ان کے رفقاء کی گرفتاری سے تحریک کے رشتے شیخ الہند سے منقطع ہوگئے تھے البتہ ان کے شاگردوں کا قافلہ میدان عمل میں ڈٹا ہوا تھا.ان کی تربیت مولانا منصور انصاری بدستور کرتے رہے.افغانستان کا حکمراں حبیب اللہ خان (ح:۱۹۰۱-۱۹۱۹) افغان عوام کی مرضی کے خلاف کھل کر تو انگریزوں کی حمایت نہیں کرسکتا تھا لیکن اس کی دلی

ہمدردیاں انگریزوں کے ساتھ تھیں. افغانستان میں مولانا عبیداللہ سندھی نے اس کا سیاسی نقطۂ نظر بدلنے کی کوشش کی تھی مگر کامیاب نہ ہو سکے.

امیر حبیب اللہ کے بھائی سردار نصراللہ خاں نائب السلطنت کو مولانا محمد میاں منصور انصاری اپنے عزائم سے تحریری طور پر آگاہ کر چکے تھے. لیکن امیر حبیب اللہ پر کسی بات کا اثر نہیں ہو رہا تھا. تاہم اتنا ضرور تھا کہ افغان عوامی حمایت کی وجہ سے مہاجرین کو افغانستان کی سرزمین پر کام کرنے میں اتنی دشواری نہیں تھی جتنی دیگر جگہوں پر پیش آ رہی تھیں. وہاں یہ امید وابستہ تھی کہ جلد ہی انہیں کامیابی ملے گی.

امیر حبیب اللہ ذاتی طور ایک ذی علم اور دین دار شخص تھا. مگر علم دین کے ساتھ جذب دل نہ ہو تو مومن کی شخصیت مکمل نہیں ہوتی. امیر حبیب اللہ خان کی شخصیت میں ایک آنچ کی کمی تھی. اس میں حالات سے ٹکرانے کی جرأت تو نہیں تھی لیکن اپنے مفاد کے حصول میں سرگرم رہتا تھا. انگریزوں نے اس طبیعت کا فائدہ اٹھا کر اسے بھی ترکوں کی جگہ خلیفۃ المسلمین بنانے کا لالچ دیا تھا. آدمی سیاست میں ہو اور غرض کا بندہ ہو تو دنیا کی طرف تیزی سے لپکتا ہے اور ملت و دین سے پھرتی سے کنارہ کر لیتا ہے. اس برطانوی جھانسہ کی وجہ سے امیر حبیب اللہ نے افغانستان کی راہ سے ہندستان پر ترکی کے حمایتی حملہ کی خواہش کو کامیاب نہیں ہونے دیا اور مجاہدین کی تحریک کو ناکام بنانے میں مؤثر کردار ادا کیا.

آزاد ہندستان کی اولین عبوری حکومت کا مرکزی دفتر اگر چہ کابل میں تھا لیکن امیر حبیب اللہ خان نے اسے کھل کر کام کرنے کا موقع نہیں دیا تھا اور شیخ الہند کی گرفتاری کی خبر کے بعد اُس نے اُن کے رفقائے کار کے گرد دائرہ تنگ کر دیا. چنانچہ مولانا عبیداللہ سندھی کو کابل میں نظر بند کر دیا گیا اور مولانا محمد میاں کو گرفتار کر کے انگریزوں کے حوالہ کرنے کی کوشش کی گئی لیکن صدر اعظم سردار نصراللہ خاں کی مدد سے وہ گرفتاری سے بچ کر چھپتے چھپاتے بخارا چلے گئے.

باب/ جہد ریشمی

نظریہ کا نیا موڑ

مولانا منصور انصاری ایک زیرک ماہر سیاسیات تھے. لگاتار امتحانی حالات کے پیش نظر ان کی عملی ترجیحات قدرتی طور پر تبدیل ہوتی تھیں. شیخ الہند کی تحریک کا ایک ذیلی نشانہ عالم اسلام کی آزادی تھا. افغانستان کے تجربات اور باقی مسلم دنیا میں برطانوی، روسی، باقی یورپی ممالک کی ریشہ دوانیوں سے اگاہی ہوئی تو مولانا منصور انصاری نے اپنی تحریک کے وسیع تر محاذوں پر فکری یلغار کی جسے انہوں نے حکومت الٰہی کا نام دیا.

سلطان اعظم عبدالحمید خاں ثانی (ح:۱۸۷٦-۱۹۰۹) کی جبری معزولی کے بعد سلطنت عثمانیہ پر نزع طاری ہو چکا تھا. دیکھتے دیکھتے خلافت عثمانی ان کی آنکھوں کے سامنے ختم ہوگئی تھی. اس وقت مسلم دنیا میں ایک مدبر عصر مسلمانان عالم کی عمرانی اور سیاسی قوت کی نئی شیرازہ بندی کے عنوان سے مولانا منصور انصاری دنیا کے سامنے آتے ہیں.

بکھری ہوئی سلطنت عثمانیہ کے ملبہ میں انگریزوں، فرانسیسیوں، ولندیزیوں، روسیوں کی غلام قومیں، چند بے حقیقت اور غیر موثر دریوزہ گر ملک عالم اسلام کا نقشہ پیش کر رہے تھے. مولانا منصور انصاری نے مستقبل میں پیدا ہونے والے سیاسی خلا کا معروضی اندازہ قائم کر کے اسے پر کرنے کے لئے ایک نئی عالمی مسلم قوت کے طور پر حکومت الٰہی کا نظریہ دنیا اور مسلمانوں کے سامنے پیش کیا. اسی بنا پر اب ان کا ہدف صرف ہندستان کی آزادی نہیں رہا تھا بلکہ وہ عالم اسلام کی مکمل آزادی اور ایسی خودمختار حکومت کے قیام کے خواہشمند تھے جو دنیا امن وسکون کی ضامن ہو، اللہ کی وحدانیت کا علم بلند کرے اور اس کی مرضی کے مطابق دنیا میں حق وصداقت اور عدل وانصاف کا حقانی ربانی نظام قائم کرے.

اس نظریہ کی پیشکش سے سو سال پہلے ہندستان اور باقی مسلم ملکوں میں ذہنی افلاس اس قدر بڑھ چکا تھا کہ انہیں دنیا ہی نہیں جیسے اپنی اخروی نجات بھی وھائٹ ہال کی دربانی میں دکھائی جارہی تھی اور ایک طبقہ اسے قبول کر چکا تھا. اس عالم میں خلافت عثمانیہ کا دائرۂ نظر استنبول کے مغرب سے ہٹ کر اپنے وجود کی سخت جدوجہد میں نقطہ بن رہا تھا اور مولانا منصور انصاری کے اس ابتکاری تصور کو قبول کرنے والے مسلمانوں دنیا میں نہیں رہ گئے تھے. پھر بھی جب دنیا میں کسی کو یہ تصور بھی نہیں تھا مولانا منصور انصاری نے قرآن وحدیث کے مطالعہ اور شرح و تجزیہ کے بعد ۱۹۱۸ میں حکومت الٰہیہ کا خاکہ تحریری شکل میں مرتب کیا. یہ نظریہ تنقید کا نشانہ بنا اور اس پر ان لوگوں نے بھی زبان اعتراض دراز کی جو بعد میں حکومت الٰہیہ کا علم لے کر اپنی مخصوص شناخت بنانے میں مصروف ہوئے.

نظریہ مفکر دیتا ہے اور نظریہ کو پرچم اور علم بردار درکار ہوتا ہے. مولانا منصور انصاری نے اس نظریہ کے لئے ابتداء میں امیر حبیب اللہ خاں سے توقعات وابستہ کی تھیں. وہ حبیب اللہ جو انگریزوں کے ہاتھوں تاج خلافت پہننے کی آس لگائے بیٹھا تھا اور تاریخ میں حرف غلط بن گیا، ایک بڑے انقلاب کا سرخیل بھی بن سکتا تھا مگر غم ذات میں مبتلا افراد تیمور لنگ تو بن سکتے ہیں حق کی وراثت سے محروم ہوجاتے ہیں. حبیب اللہ خان ایک ایسا ہی محروم عظمت سیاست داں تھا.

قاضی عبدالحمید کے ایک خط مورخہ ۲۱ محرم ۱۳۳۷ھ مطابق ۲۷ اکتوبر ۱۹۱۸ سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا محمد میاں منصور انصاری نے کسی تقریب میں اپنی اور جملہ مسلمانوں کی طرف سے امیر حبیب اللہ خاں کا استقبال کیا تھا جس پر قاضی عبدالحمید نے ان کا شکریہ ادا کیا تھا. اس خط سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کسی مسئلہ پر قاضی عبدالحمید کو معطل کیا گیا تو انہوں نے مولانا منصور انصاری کو سفارشی ذریعہ بنایا تھا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا منصور انصاری امیر حبیب اللہ خان پر اثر رکھتے تھے. ان قریبی تعلقات کی بناء پر انہوں نے

امیر حبیب اللہ کو انگریزوں کے خلاف اور ہندستان پر حملہ کرنے کے لیے بہت ترغیب دلائی۔اس میں انہیں کامیابی نہیں ہوئی تو انہوں نے عوامی بیداری کی خاطر حکومتِ الٰہیہ کا پروگرام عوام کے سامنے پیش کیا۔

یہ تحریرامیر حبیب اللہ کے لئے شہ مات تھی اور انگریزوں کی حمایت میں اس کی سرگرمی ماند پڑ گئی مگر حریت پسند ملی عناصر بہر حال اس کی طرف سے مطمئن نہیں تھے۔ادھر شیخ الہند کی گرفتاری سے جذبہ حریت پر اوس پڑ گئی تھی۔البتہ اسی وقت ایک انقلابی لیڈر سید جمال الدین افغانی (۱۸۳۸-۱۸۹۷) نے استقلال پارٹی افغانستان میں قائم کر لی تھی۔ یہ پارٹی فوج کو زیر اثر لے آئی تھی۔استقلال پارٹی بھی ایک ایسے صالح نظامِ حکومت کی خواہشمند تھی جو اسلامی اصولوں پر عمل پیرا ہو۔افغانستان کے فوجی افسران بالا امیر حبیب اللہ کے اقتدار کو اسلامی اصولوں سے منحرف تصور کر رہے تھے حبیب اللہ سے اندرونی مخالفت رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ بیگم علیا حضرت اور امیر امان اللہ خاں بھی مخالفین کے شریک یا مددگار تھے۔

اس زمانہ میں دنیا کے مسلم حکمرانوں میں بے شعوری کی روایت بہت مستحکم ہو چکی تھی جس کی وجہ سے معاندین کو پے بہ پے کامیابیاں حاصل ہو رہی تھیں۔ترکی میں ہنگروی یہودی سازشی اور سیاسی صہیونیت کے بانی تھیوڈر ہرزل (۱۸۶۰-۱۹۰۴) (Theodor Herzl) کی ریشہ دوانیوں، مقامی یونانی نژاد یہودی قانون داں عمانوئل قرہ سو (۱۸۶۲-۱۹۳۴) (Emanuel Karasu) کے زیر اثر نوجوان ترک تحریک کی کارروائیوں، اور اس کی تائید اور حمایت سے نراجی مارکسی (anarchist-marxist) بیلا روس کے یہودی باشندہ الگزنڈر پاروَس (اصل نام اسرائیل لزاریوِچ گلفنڈ -Alexander Parvus) کی بحران سازی، اور برطانیہ، فرانس، روس اور یونان کی پھیلائی ہوئی بغاوتوں اور متواتر جنگوں کے نتیجہ میں آخر کار نوجوان ترک جماعت، انجمن اتحاد و ترقی (Committee for Union and Progress) نے سلطان اعظم عبدالحمید خاں ثانی کو ۲۷ اپریل

۱۹۰۹ کو معزول کر دیا اور سلطنت عثمانیہ پر نزع طاری ہو گیا.

اس تشویشناک دور میں برطانیہ نے بے شعور مسلمان حکمرانوں کو طرح طرح کے جھانسے دے رکھے تھے. برطانوی جاسوس تھومس لارنس نے مکہ کے شریف حسین کو عرب شہنشاہ اور خلیفۃ المسلین بنانے کا خواب دکھایا تھا. برطانوی جاسوس کیپٹن ولیم شیکسپیر اور اس کی ساتھی مس گرٹروڈ بیل نے ایسا ہی خواب نجدی شیخ کو دکھا رکھا تھا. بلوچستان کے برطانوی راج کے کمشنر ہنری میکمیہن (Henry McMahon) نے افغانستان کے امیر حبیب اللہ خان کو یہی باور کروایا تھا اور حبیب اللہ نے تو سلطنت عثمانیہ کے خاتمہ کا انتظار کئے بغیر ہی فروری ۱۹۱۹ میں جمعہ کے خطبہ میں خود اپنے امیر المومنین و خلیفۃ المسلمین ہونے کا اعلان کروا دیا تھا. اس کا خیال تھا کہ ترکی کی حکومت قریب الختم تھی اور برطانیہ کی مدد سے تاجِ خلافت اسے ہی نصیب ہوگا. غالباً اس کی یہی عجلت پسندی انگریزوں ہی کے ایک جاسوس کے ہاتھوں اس کے قتل کا موجب ہوئی یعنی اس کی موعودہ خلافت انگریزوں کی عملی سیاسی ترجیحات میں کہیں نہیں تھی.

نتیجے جن کے ہمارے خلاف نکلے ہیں
وہ فیصلے تو ہمارے بھی اختیار میں تھے

یاد رہے یہ وہی ہنری مک میہن تھا جس نے مصر میں برطانوی کمشنر کے طور پر مکہ کے شریف حسین کو سلطنت عثمانیہ خلاف ورغلایا تھا اور خلافت کا خواب دکھایا تھا اور پھر سلطنت کے خاتمہ کے بعد اسے مذاکرات کے بہانے جدہ میں لنگر انداز اپنے جہاز پر بلایا اور دھوکے سے گرفتار کر کے تا زندگی جزیرہ قبرص کے ایک تاریک جیل میں وفا اور جفا کے ہجے یاد کرنے کے لئے تنہا چھوڑ دیا تھا. دفاع عزت کی خاطر اس شرمناک تاریخ کو بہت بدل دیا گیا ہے.

وہ عجیب لوگ تھے کہ دنیا سے منصب خلافت ہی کو ختم کرنے والی طاقت سے

اسلام کی سیاسی سربراہی اور نئی خلافت کے تاج وتخت کی امیدیں باندھے بیٹھے تھے. ماضی اور اب حال میں بھی ایسے خواب دیکھنے والوں نے دوسچائیوں سے آنکھ بند کرلی تھی. ان کا معیار شعور اتنا بھی نہیں تھا کہ اسلامی خلافت کسی غیر مسلم طاقت کا عطیہ نہیں ہوسکتی اور یہ کہ اس منصب کے لئے فرد اور پھر اس کے خانوادہ یا قوم میں قیادت وسرداری کی ذاتی صلاحیت اوراجتماعی فراست ایمانی میں غیر معمولی امتیاز لازمی ہے. اسلامی تاریخ میں جن افراد اور معاشرتی جماعتوں نے خود کو اس منصب کا اہل ثابت کیا اور اس سیاسی قوت کو دنیا میں برپا کیا ان کی زندگیوں میں اس شعور اور صلاحیت وفراست کا حصہ نمایاں تھا مگر تاریخ سے سبق لینے کے لیے قائد کا اعلیٰ علمی ذوق شرط ہے.

برطانیہ کے شاطر دفتر داروں اور جاسوسوں سے حبیب اللہ خان کی توقعات جو بھی ہوں، افغان عوام کا شعور دنیا کے دیگر مسلمانوں کے مقابلہ میں زندہ تھا. حبیب اللہ کا خلیفۃ المسلمین کہلانا ہی غالباً اس کے قتل کا بہانہ بن گیا. اسے ایک برطانوی جاسوس نے قتل کیا تھا. انگریزوں کو اس کی عجلت گوارہ نہ ہوئی کیونکہ ان کا مقصد خلافت اسلامیہ کی بقا یا اس کا تسلسل نہیں اس کا مکمل خاتمہ تھا تا کہ دنیا کے مسلمانوں کو برائے نام سہی سیاسی مرکزیت سے محروم کردیا جائے.

حبیب اللہ خان صوبہ لغمان میں شکار کھیلنے گیا تھا کہ ۲۰ فروری ۱۹۱۹ کی رات میں مصطفیٰ صغیر نامی انگریزوں کے ایک جاسوس نے اس کے کمرے میں داخل ہوکر اسے گولی کا نشانہ بنادیا جس سے اس کی موت ہوگئی. مصطفیٰ صغیر فرار ہوگیا تھا اور انقرہ میں گرفتار ہوا جہاں تفتیش کے دوران اس نے اعتراف کیا کہ وہ انگریزوں کا تنخواہ دار جاسوس تھا اور انہی کے حکم پر اس نے حبیب اللہ خان کو قتل کیا تھا.

بدیہی طور پر شاید اس بات کو قبول کرنا دشوار ہے. حبیب اللہ خاں انگریزوں کا دوست تھا اور ۱۹۰۶-۱۹۰۷ میں اس نے برطانوی راج کی دعوت پر ہندستان کا دورہ بھی

کیا تھا.مولانا عبداللہ انصاری کی سوانح حیات مرج البحرین میں ذکر ہے کہ

امیر حبیب اللہ خان انگریزوں سے مفاہمت کا رویہ رکھتے تھے جس کے گہرے سیاسی اثرات ہندستان میں محسوس کئے جا رہے تھے اور انگریز حکومت ان اثرات سے خوب فائدہ اٹھا رہی تھی.امیر حبیب اللہ خان کا دورۂ ہند اسی سیاسی عمل کا حصہ تھا.

مرج البحرین.اقرا ایجوکیشنل فاؤنڈیشن ممبئی.۱۵۳

البتہ یہ بھی حقیقت ہے کہ انگریز اور اب ان کے عام مغربی جانشین کسی کو صرف اس وقت تک دوست رکھتے ہیں جب تک وہ شخص ان کے اقتصادی اور سیاسی مفادات پورا کرتا رہتا ہے، ورنہ اسے راستہ سے ہٹا دیتے ہیں.مثالیں بہت ہیں.مکہ کا شریف حسین اس پالیسی کی بدترین مثال ہے.حالیہ تاریخ میں وسطی امریکہ کے ملک نکاراگوا کا ڈکٹیٹر اناستاسیو سوموزا(Anastasio Somoza Debayle)اور فلپین کا ڈکٹیٹر فرڈننڈ مارکوس (Ferdinand Marcos)تازہ مثالیں ہیں.

حبیب اللہ خاں کے قتل کے بعد فوج نے اس کے بھائی سردار نصر اللہ خاں کو امیر مقرر کیا مگر ایک ہفتہ بعد ان کو معزول اور گرفتار کر کے حبیب اللہ کے بیٹے امان اللہ خاں کے امیر افغانستان ہونے کا اعلان کر دیا.

امان اللہ خاں نے اپنے پیش رو کے برخلاف عنانِ حکومت ہاتھ میں لیتے ہی جنگی تیاریاں شروع کر دیں اور سرحد پر فوجیں بھیج دیں.اس معاملہ میں امان اللہ خان کے اپنے مقاصد تھے جو ہندستانی جنود آزادی کے مقاصد سے پوری طرح ہم آہنگ نہیں تھے.جلاوطن ہندستانی قیادت اس سے باخبر تھی یا نہیں مگر سیاسی حکمت کے پیش نظر تعاون کرنے پر تیار تھی.مولانا عبید اللہ سندھی کو رہائی ملی تو انہوں نے عبوری حکومت ہند کی طرف سے ہندستانیوں کو جنگ کی صورت میں افغان فوجوں کی مدد کے لیے تیار رہنے کا پیغام دیا. امیر امان اللہ نے افغانستان کو انگریزوں کے دباؤ سے نکال لیا.

ادھر انگریزی حکومت کے لئے ایک مصیبت اور کھڑی ہوگئی. زار روس نکولس ثانی (ح: ۱۸۹۴-۱۹۱۷) کی حکومت انگریزوں کی حلیف تھی. اس کا خاتمہ ۱۹۱۷ میں ہو چکا تھا اور روس میں ولادیمیر لینن کی قیادت میں بالشویک حکومت کا قیام عمل میں آچکا تھا. نئی روسی حکومت محکوم قوموں کی آزادی کی حمایت کررہی تھی. یہ بھی وجہ تھی کہ افغانستان کے معاملہ میں انگلستان کمزور پڑ گیا تھا. چنانچہ انگریز افغانستان سے جنگ بندی پر مجبور ہو گئے اور ۸ اگست ۱۹۱۹ کو دونوں فریق راولپنڈی میں جمع ہوئے اور دونوں ملکوں کے درمیان معاملات طے ہو گئے جس کے مطابق انگریزوں نے افغانستان کی مکمل آزادی کو اور حکومت افغانستان نے ہندستان کے ساتھ ۱۸۹۳ میں انگریزوں کے کھینچے ہوئے ڈیورنڈ خط (Durand Line) کو ہند افغان سرحد تسلیم کرلیا.

مولانا سندھی کی مایوسی

مولانا عبیداللہ سندھی نے افغان حملہ کی صورت میں ہندستانیوں سے جس مدد کا تقاضا کیا تھا اس پر اہل وطن نے دھیان نہیں دیا. انگریزوں کے پروپیگنڈا دفتر نے ملک میں مہم چلائی کہ ''مسلمان افغانستان سے حملہ کرا کے اور خود ان کی مدد کر کے ہندستان میں ایک متحدہ قومی یورپی جمہوریت نہیں بلکہ افغانستان کی اسلامی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں''.

تحریک آزادی کے خلاف اس کہانی کا اثر ہوا اور ہندستانیوں نے آزادی سے منہ پھیر لیا. دوسری وجہ خود ہندستان میں قیادت کا فقدان تھی. بے شک اس وقت ملک میں خلافت تحریک جاری تھی اور اس کی قیادت بھی قافلہ شیخ الہند کے سالار مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی کررہے تھے، مگر باوجودیکہ گاندھی نے خلافت تحریک کی حمایت کی تھی، کانگریسی قیادت ظاہری جمع خرچ کے سوا علی العموم انگریز کے پروپیگنڈے سے زیادہ متاثر تھی. ملک کے عام مسلمان مغرب سے درآمدہ سیاسی اور اقتصادی نظریات کے بے ہنگم شور وغوغا

میں فیصلہ کن عنصر کے طور پر نہیں ابھر سکے تھے.

برطانوی حکومت سے افغانستان کے استقلال اور سالمیت کو تسلیم کروالینا بے شک ایک بڑی کامیابی تھی. اس مسلم ملک پر کسی نہ کسی عنوان سے قبضہ کرنے کے لئے ایسٹ انڈیا کمپنی کی چلمن کے پیچھے سے برطانوی حکومت جنگ بالاکوٹ (۱۸۳۱) کے وقت ہی سے کوشاں تھی اور افغانستان کے بعد تاجکستان، ترکمانستان، قزاخستان اور کرغیزستان تک پر استعماری قبضہ کا منصوبہ بنائے ہوئے تھی. اس مقصد کے لئے لڑاؤ اور حکومت کرو کی آزمودہ پالیسی پر عمل کرتے ہوئے انگریزوں نے دوست محمد خاں اور شاہ شجاع درانی کے اختلاف سے سیاسی فائدہ اٹھانا چاہا مگر ۱۸۳۹-۱۸۴۲ کی پہلی افغان انگریز جنگ میں انگریزوں کو تباہ کن شکست ہوئی تھی. اس کے باوجود افغانستان میں ان کی ریشہ دوانیاں جاری تھیں. آخر ۱۹۱۹ کے راولپنڈی معاہدہ نے وسطی ایشیا میں انگریزوں کے نفوذ کے راستہ میں کوہ ہندوکش جیسی بلند رکاوٹ کھڑی کردی.

تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ مولانا عبیداللہ سندھی صرف افغانستان کی آزادی پر قانع نہیں تھے. شیخ الہند کی سیاسی نظر دوررس تھی اور مولانا سندھی اور مولانا انصاری دونوں اسی راہ کے مسافر تھے.

امان اللہ خان اکثر امور میں اپنے والد حبیب اللہ خان سے مختلف نہ تھے. وہ افغانستان میں مغربی یورپی طرز کی معاشرتی اور سیاسی تبدیلیاں لانے پر کمر بستہ تھے. معاہدہ راولپنڈی کے بعد وہ علاقائی یا نسلی قومیت کے اسی یورپی تصور میں الجھ گئے تھے جو ایشیا کے دوسرے کنارہ پر سلطنت عثمانیہ کی جڑیں کھوکھلی کر رہا تھا اور عرب علاقوں میں یورپی غلامی کے ایک نئے دور کا آغاز کر رہا تھا. ان حالات سے دل برداشتہ ہو کر مولانا عبیداللہ سندھی کابل کو خیرباد کہہ کر ماسکو روانہ ہو گئے. قریب سات ماہ وہاں رہ کر انہوں نے کمیونزم کا مدبرانہ تجزیاتی مطالعہ کیا اور اسے سمجھا. اس کے بعد وہ تین سال تک ترکی میں رہے وہاں انہوں نے عالمی

اسلامی تحریک (Pan-Islamic Movement) کا جائزہ لیا جو ۲۷ اپریل ۱۹۰۹ کو سلطان عبدالحمید خاں ثانی کی معزولی اور ۱۰ فروری ۱۹۱۸ کو ان کے انتقال کے بعد مجلس اتحاد و ترقی کی چوکھٹ پر دم توڑ چکی تھی. اسی اثنا میں ان کی ملاقات لالہ لاجپت رائے کے علاوہ مولانا محمد میاں منصور انصاری سے دوبارہ ہوئی. پھر وہ برطانیہ گئے. وہاں جواہر لال نہرو سے ان کی ملاقات ہوئی جن کے سامنے انہوں نے ہندستان میں ہندو مسلم ہم آہنگی کے لئے کچھ تجاویز پیش کیں. --م ط غ

باب/ جہد ریشمی

قدم قدم آزمائش

افغانستان میں مولانا عبید اللہ سندھی نے جو عبوری حکومت ہند قائم کی تھی اس کی تشکیل میں مولانا محمد میاں کی کوششوں کا بڑا حصہ تھا لیکن انہوں نے اس عبوری حکومت میں کوئی عہدہ نہیں لیا تھا مختلف افراد کی لکھی ہوئی وزراء کی فہرستوں میں ان کا نام نہیں ہے. ایک قیاس ہے کہ ہزاروں مجاہدین آزادی ہند یا جنود ربانیہ کا قیام تن تنہا ان کا کارنامہ تھا اس لئے عبوری حکومت میں ان کی حیثیت وزیر دفاع کی ہوگی مگر اس کی تصدیق نہیں ہوتی.

عملی طور پر جنود آزادی کے سپہ سالار کے طور پر مولانا منصور انصاری کی خواہش تھی کہ افغانستان اور جرمنی کی مدد سے ہندستان میں انگریزی حکومت کے خلاف جنگ چھیڑ دی جائے لیکن جب امیر حبیب اللہ خان اس میں مزاحم ہوا تو مولانا محمد میاں منصور انصاری اس کی مخالف تنظیموں کے ساتھ ہو گئے جس کی وجہ حبیب اللہ ان سے ناراض ہو گیا اور جب ہندستان کے انگریز سرکاری افسروں نے ریشمی رومال تحریک کے الزام میں مولانا منصور انصاری کو گرفتار کر کے ان کے حوالہ کرنے کا مطالبہ کیا تو حبیب اللہ اس پر فوراً راضی ہو گیا. تاہم حبیب اللہ خان کے بھائی سردار نصر اللہ خان مولانا منصور انصاری کے معتقد اور ان کی تحریک کے حامی و مددگار تھے تو ان کی مدد سے مولانا منصور انصاری خاموشی سے راتوں رات افغانستان کے پہاڑی علاقوں میں روپوش ہو گئے جہاں انگریزوں کی رسائی ناممکن تھی. انگریزی حکومت کے جاسوس ان کو تلاش کرتے رہے لیکن کامیاب نہ ہوئے.

حالات قدرے موافق ہوئے تو وہ افغانستان کے ان دور دراز پہاڑی علاقوں سے نکل کر مختلف راہوں سے پیادہ پا انتہائی مشقتوں و مصیبتوں کا سفر طے کر کے بخارا کی

حد میں پہنچے. مولانا منصور انصاری کی یادداشتوں میں ایک صفحہ ڈاکٹر عابداللہ غازی کے ذخیرۂ دستاویزات میں محفوظ ہے جس پر مولانا منصور انصاری نے زندگی اس سفر کی چند تاریخیں تحریر کی ہیں. اس کے مطابق وہ ۲۰ ذی الحجہ ۱۳۳۶ (۲۷ ستمبر ۱۹۱۸) کو درۂ پیچ کے راستہ سے مزار شریف پہنچے. محرم ۱۳۳۷ (اکتوبر ۱۹۱۸) سے جمادی الثانی ۱۳۳۷ (مارچ ۱۹۱۹) تک علاقۂ سنگ چارک میں صوفی محمد جان کے پاس رہے. جمادی الثانی ۱۳۳۷ (مارچ ۱۹۱۹) میں ترکستان اور روس کی طرف روانگی ہوئی اور بخارا و تاشقند کی زیارت ہوئی. تاشقند میں سید عبداللہ اور وہاں موجود دارالعلوم دیوبند کے طلباء سے بھی ملاقات ہوئی. شعبان ۱۳۳۷ (مئی ۱۹۱۹) میں جنگی قیدیوں کے ہمراہ کرکی پہنچے اور جنگِ روس و ترکستان کے موقع پر کرکی کے قلعہ میں قید رہے. قید و بند کی یہ تکلیف ۱۰ رمضان المبارک ۱۳۳۷ (۹ جون ۱۹۱۹) تک رہی.

اسی تاریخ کو افغانستان کے ایک رئیس نائب الحکومت (سفیر) مزار شریف آئے تو مولانا منصور انصاری کو جنگی قیدیوں کے ساتھ مزار شریف پہنچا دیا گیا جہاں وہ غالباً ۲۷ رمضان تک رہے. پھر ۲۷ رمضان سے ۲۰ شوال ۱۳۳۷ (۲۶ جون تا ۱۹ جولائی ۱۹۱۹) نائب الحکومت (سفیر) کے حکم کے بموجب عمر بخش اور بابا مراد ترکمانی کے ہمراہ تاشقند کا سفر کیا. عید الفطر تاشقند میں بابا مراد کے گھر پر ہوئی. تاشقند سے فیض محمد کاتب اول سفارت افغانستان کے ہمراہ بخارا واپس ہوئے جہاں ۲۱ شوال ۱۳۳۷ (۲۰ جولائی ۱۹۱۹) کو جنرل محمد ولی خاں سفیر افغانستان اور مولانا سیف الرحمٰن سے ملاقاتیں ہوئیں. وہاں سے واپس افغانستان کی حدود میں داخل ہوئے.

فارسی میں تحریر اس یادداشت کا صرف ایک ہی صفحہ دستیاب ہو سکا ہے. بہرحال اس سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ ۲۰ ذی الحجہ ۱۳۳۶ تا ۲۱ شوال ۱۳۳۷ (۲۷ ستمبر ۱۹۱۸ تا ۲۰ جولائی ۱۹۱۹) تقریباً دس ماہ مولانا منصور انصاری پر بے انتہا صبر آزما گذرے جس دوران انہوں نے قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں اور پاپیادہ سفر کی تکلیف بھی اٹھائی.

افغانستان واپسی

مولانا انصاری کابل واپس آئے تو امیر امان اللہ خاں نے ان کا پر جوش استقبال کیا اور افغانستان کے امور حکومت میں رہنمائی کی درخواست کی. یہ خود مولانا انصاری کی دلی آرزو تھی. .البتہ آزادی ہند کی جو شمع ان کے سینہ میں روشن تھی وہ لو دیتی رہی اور امان اللہ خاں کو اس معاملہ میں اقدام پر اکساتے رہے، جس کے نتیجہ میں امان اللہ خان نے مئی ۱۹۱۹ میں ہندستان پر حملہ کر دیا. مولانا محمد میاں منصور انصاری اور مولانا عبید اللہ سندھی کے مشورے سے ہونے والی اس یورش میں مولانا انصاری کی کمان میں جنود ربانیہ شامل تھے.

مولانا انصاری کو خوش گمانی تھی کہ اس حملہ کے ساتھ ہی ہندستان میں اندرونی طور پر انگریز حکومت کے خلاف شور اٹھے گا، عوام متحرک ہو جائیں گے اور انگریزوں کے لئے ہندستان کی زمین تنگ ہو جائے گی لیکن ایسا نہیں ہوا. اندرون ملک سناٹا تھا. اس کے کئی اسباب تھے. بڑا سبب یہ تھا کہ قومی قائدین کی بڑی تعداد انگریز سیاست کے جال میں جانے انجانے پھنسی ہوئی تھی اور اس نے اس آواز پر لبیک نہیں کہا. دوسرے جیسا کہ بیان ہوا، انگریزوں نے طوفانی پروپیگنڈا کر رکھا تھا کہ افغان یورش کا مقصد ہندستان میں افغان پٹھان حکومت قائم کرنا ہے. کانگریس کی قیادت اس پروپیگنڈے سے متاثر تھی اس لئے وہاں سے ریشمی مجاہدین کو کسی طرح کی اخلاقی مدد یا تائید بھی حاصل نہیں ہوئی. تیسرے یہ کہ اس یورش میں شامل افغانستان و سرحدی آزاد قبائل کے پاس ضروری اسلحہ نہیں تھا خصوصاً جدید قسم کا سامانِ حرب و ضرب بہت کم تھا جس کی وجہ سے افغان اور جنود ربانیہ کی پیش قدمی جاری نہ رہ سکی. اس کے باوجود متحدہ عسکری قوت کی بناء پر افغانستان نے راولپنڈی معاہدہ کے تحت انگریزوں سے اپنی مکمل آزادی کا مطالبہ منظور کرا لیا. مولانا انصاری کو افغانستان کی اس مکمل آزادی سے خوشی ضرور ہوئی لیکن امان اللہ خاں کی

طرف سے ہندستان کی آزادی کے بارے میں مکمل خاموشی اور وقت پر قائدین ہند کے مکمل سکوت نے انہیں مایوس کیا،مولانا عبید اللہ سندھی نے تو اس غم سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے اس کے بعد کابل ہی کو خیر باد کہہ دیا جس پر مولانا منصور انصاری کی ناخوشی دونی ہوگئی،لیکن مولانا محمد میاں نے حوصلہ نہیں ہارااور کابل میں رہ کر کام جاری رکھنے کا فیصلہ کیا.

مولانا عبید اللہ سندھی کا تحریک سے جدا ہونا مولانا محمد میاں کے لیے سوہان روح تھا لیکن وہ مجبور تھے.وہ حالات سے دل برداشتہ ضرور ہوگئے تھے لیکن ناامید نہیں ہوئے تھے.انہیں توقع تھی کہ وہ ایک نہ ایک دن اپنی کوششوں میں کامیاب ہوں گے اور ہندستان میں آزادی کا سورج ضرور طلوع ہوگا.ان کا مقصد اتنا ہی تھا کہ وطن کو انگریزوں کی غلامی سے نجات ملے.اپنی خدمات کے عوض کسی عہدے،انعام واکرام یا کسی معاوضہ کے طلبگار نہیں تھے.انہوں نے اس راہ میں جس قدر پریشانیاں جھیلیں،مصائب برداشت کئے وہ آزادی کی جدوجہد میں شاید ہی کسی اور نے جھیلے ہوں،مگر کبھی حرف شکایت نے ان کے لبوں یا دل کو آلودہ نہیں کیا.

بدلے ہوئے حالات میں جہاں ان کے افکار کا ایک نیا رخ متعین ہوا وہاں اب ان کی خواہش تھی کہ حکومت الٰہی کی تازہ مہم پر کسی مسلم ملک میں حکومت کی معاونت سے آزادانہ کام کریں.یہ خواہش پوری نہیں ہوئی کیونکہ مسلم دنیا پر مسلط کسی بھی حکمران کو اسلام سے وہ وابستگی ہی نہیں رہی تھی جس نے تاریخ میں مسلمانوں کو دنیا پر سیاسی،اقتصادی،علمی، عمرانی طور پر موثر کیا تھا.

موت سے آنکھ مچولی

مولانا منصور انصاری امیر امان اللہ خاں کے قریبی ساتھیوں میں تھے.امان اللہ بھی ان سے وزارتی امور میں صلاح ومشورہ کرتے تھے.کچھ دنوں بعد جب امیر امان اللہ

خاں نے محسوس کیا کہ ترک حکومت کے ساتھ تعلقات کو مستحکم کرنے کے لیے کسی ایسے شخص کی ضرورت ہے جو مسلم ملکوں کے درمیان اسلامی اخوت کے عنوان سے تعلقات استوار کرنے میں معاون ہو تو انہوں نے مولانا منصور انصاری کو ترکی میں افغانستان کا سفیر مختار بنا کر بھیجا۔اس سفارت کا مقصد خلافت اسلامیہ ترکی سے افغانستان کی آزادی کی تصدیق کروانا تھا۔سفارت مشن کی سفرگاہ روس کی ترکستانی نوآبادیوں سے گزرتی تھی۔اس سفر میں بھی مصائب و مشکلات مولانا منصور انصاری کی ہم سفر تھیں۔سفارتی رفقا ابھی راستہ میں ہی تھے کہ روسی حکومت کے سپاہیوں نے مولانا منصور انصاری کی نقل وحرکت کو مشتبہ قرار دے کر انہیں کر قید کرلیا اور وہ تقریباً تین ماہ تاشقند کی جیل میں رہے۔ان پر مقدمہ چلا اور پھانسی کی سزا سنائی گئی لیکن قدرت کو انہیں زندہ رکھنا تھا چنانچہ اس کے اسباب مہیا ہوگئے۔

تاشقند کے ایک بڑے افسر سردار عبدالرسول مولانا منصور انصاری کی شخصیت سے متاثر ہوئے اور انہوں نے کوشش کرکے ان سزائے موت معاف کرادی لیکن خفیہ محکمہ نے تاشقند کی دوسری عدالت میں مقدمہ دائر کردیا۔وہاں بھی موت کی سزا سنائی گئی اور پھر سزا معاف ہوئی۔تیسری مرتبہ مقدمہ دائر ہوا اور ایک بار پھر سزائے موت برقرار رہی۔البتہ اس اثناء میں نئی روسی حکومت اور افغانستان کے تعلقات میں بہتری آئی اور ساتھ ہی سردار عبد الرسول کی کوششوں کے باعث سزائے موت تیسری بار بھی معاف ہوگئی۔اس طرح وہ مرد مجاہد تین ماہ میں لگاتار تین مرتبہ موت کے پھندے سے نکلے۔

تاشقند کی جیل سے رہا ہونے کے بعد حکومت افغانستان نے مولانا منصور انصاری کو افغانستان واپس بلالیا اور امیر امان اللہ خاں نے ان کے علمی ذوق وقرآن حکیم سے دلچسپی سے متاثر ہوکر ترجمہ قرآن پر مامور کردیا۔اس سلسلہ میں ۲ مارچ ۱۹۲۱ کا لکھا ہوا شاہ عبداللہ کا ایک خط ڈاکٹر عابداللہ غازی کے ذخیرۂ خطوط میں ہے جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ مولانا منصور انصاری نے کوئی خط صدر اعظم (وزیر اعظم افغانستان) کو لکھا تھا جس کے

جواب میں صدر اعظم نے شاہ عبداللہ کے توسط سے مولانا کو مطلع کیا کہ

ترجمہ قرآن مکمل ہونے کے بعد کابل بھیج دیا جائے اور پارۂ عم کا ترجمہ مکمل ہونے کے بعد سورۂ بقرہ سے آغاز کر دیا جائے

یہ علمی کام تفسیر مجملی سورہ فاتحہ کے عنوان سے مولانا منصور انصاری کے صاحبزادہ مولانا قاری سیف اللہ نصاری نے مولانا منصور فاؤنڈیشن کابل سے شائع کر دیا ہے. یہ تفسیر دری زبان میں ہے.

سفارتی مشن برائے روس، ترکی

ابھی یہ کام تکمیل کو نہیں پہنچا تھا کہ روس کے لیے ایک سرکاری مشن بھیجنے کی ضرورت پیش آ گئی. افغانستان کی شمالی سرحد ان ترکستانی علاقوں سے متصل تھی جن پر زار شاہی کے زمانہ سے روسی تسلط قائم تھا. سیاسی حکمت عملی کا تقاضا تھا کہ کابل اور ماسکو کے درمیان باہمی افادہ پسندی پر مبنی تعلقات استوار ہوں. اس مقصد کے لئے حکومت افغانستان نے مولانا منصور انصاری کی سربراہی میں ایک سفارتی مشن روس بھیجا. ماسکو میں مولانا منصور انصاری نے بالشویک حکومت کے سربراہ ولادیمر لینن اور دیگر روسی کمیونسٹ زعما سے ملاقاتیں کیں اور انہیں اسلام پیش کیا.

ماسکو میں انقلابی مولانا منصور انصاری کا سرکاری قیام زار روس کی خواب گاہ میں تھا. اس قیام کے دوران روسی انقلابی لینن سے اپنی ملاقات کا حال انہوں نے اپنے صاحبزادہ مولانا حامد الانصاری غازی سے بیان کیا تھا. اس بیان کے مطابق مولانا منصور انصاری نے لینن کو بتایا کہ جن معاشی اور معاشرتی عوارض کی اصلاح کے لئے ان لوگوں نے کمیونزم کو اختیار کیا تھا ان کا حل اسلام میں موجود تھا. اس کے جواب میں لینن نے کہا تھا

ہمیں اسلام کے بارے کچھ خبر نہیں ہے. ہمیں کارل مارکس کے فلسفہ میں اپنے مسائل کا حل نظر آیا تو اس بنیاد پر ہم روس میں انقلاب لے آئے. اسلام

ایک قدیم دین ہے اور دنیا میں کئی مسلم ملک ہیں. آپ جس اسلام کا ذکر کرتے ہیں ان میں کسی ایک ملک میں آپ وہ اسلام نافذ کر کے ان ملکوں کے معاشی اور معاشرتی مسائل حل کر کے دکھایئے. ہم انقلابی ہیں. انقلابی تبدیلی سے ڈرتا نہیں، بلکہ خود تبدیلی لاتا ہے. ہم تبدیل ہو سکتے ہیں.

ستر سال بعد روسی کمیونسٹ انقلابی تبدیل ہو گئے. سو سال سے زیادہ ہو گئے لینن کا چیلنج بدستور مسلم دنیا کی فضاؤں میں گونج رہا ہے اور لینن کے پیرو روسیوں نے مارکسی نظریہ کی ناکامی کے بعد اسی یورپی مسیحی جمہوریت اور سرمایہ دارانہ اقتصادی نظام کو قبول کر لیا جس کے خلاف کمیونزم اٹھا تھا.

افغانستان کے نقطۂ نظر سے روس میں مولانا منصور انصاری کی سفارت کو بڑی کامیابی حاصل ہوئی. اس مشن سے افغانستان کے بہت سے مفادات وابستہ تھے. یہ کامیابی افغانستان کے لئے اہم تصور کی جا رہی تھی.

سلطنت عثمانیہ اپنے آخری دنوں سے گزر رہی تھی اور جنگ بلقان اور پہلی عالمی جنگ کے ملبہ کے نیچے سے ایک نئی ریاست ترکی ابھر رہی تھی تو افغانستان کو اس نئے ترکی کے ساتھ تعلقات کی تازہ شرح و تنظیم کی ضرورت محسوس ہوئی. ترکی کا دارالحکومت استنبول سے انگورہ (اب انقرہ) منتقل ہو چکا تھا اور وہاں افغان سفیر عبدالہادی خاں موجود تھے. مگر سفارتی تعلقات کی تنظیم نو کے لئے مولانا منصور انصاری کا انتخاب ہوا اور انہیں وزیر مختار سفیر فوق العادہ (minister plenipotentiary) مقرر کر کے ترکی بھیجا گیا جہاں وہ سفیر عبدالہادی خاں کے سیاسی مشیر بھی نامزد تھے.

انہیں ترکی بھیجے جانے کی حتمی تاریخ کا تو پتہ نہیں چل پایا تاہم افغان سفارت خانہ کے ایک خط مورخہ ۲ جوزا ۱۳۰۰ھ شمسی (۲۳ مئی ۱۹۲۱/ ۵ رمضان ۱۳۳۹) سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا منصور انصاری اس وقت انقرہ میں کاتب سفارت تھے.

فارسی زبان میں یہ خط احمد صاحب(؟) نے تحریر کیا ہے.جس میں مولانا منصورانصاری کواطلاع دی گئی تھی کہ

> سفارت کی اہم دستاویزات افغانستان پہنچانے کے لیے سفیر نے آپ کو مناسب سمجھا ہے.حفاظتی سپاہی آپ کے ہمراہ ہوں گے انشاءاللہ.سفارت کی ڈاک (مقام) چہل دختران کی سرحد تک بخوبی پہنچ جائے گی.حفاظتی سپاہی ڈاک کے ہمراہ ہرات تک جائیں گے. اب آپ جیسا مناسب خیال فرمائیں.عبدالہادی خاں صاحب سے ملاقات فرمائیں.

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مئی ۱۹۲۱میں وہ انقرہ میں افغانی سفارت خانہ سے منسلک تھے اوراہم دستاویزات کو ذمہ داری کے ساتھ حکومت افغانستان تک پہنچانے اوران کی حفاظت کے لیے ان سے مشورہ کیا جاتا تھا.

باب/ جہد ریشمی

سفر روس کے مصائب

مولانا منصور انصاری نے ۲۱حمل ۱۳۰۲ھ شمسی (۵ اپریل ۱۹۲۳/ ۱۹رشعبان ۱۳۴۱) کو روس کا سفارتی سفر شروع کیا جس میں انہیں بڑی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا. انہوں نے ایک خط پسولکا (Pasyolka) اسٹیشن سے ۲۳حمل ۱۳۰۲ھ ش(۱۲ اپریل ۱۹۲۳) کو تحریر کیا. خط کے کچھ حصے مٹے ہوئے ہیں. انقلاب کے بعد روس کے عام انتشار، سیاسی بے راہی، معاشرہ پر شبہات کا راج، قانون سفارت سے سرکاری کارندوں کا جہل مطلق اس یادداشت میں سامنے آتا ہے. مکمل خط درج ذیل ہے:

عزیز الرحمٰن خان کے نام خط

جناب محترم مکرم مولانا عزیز الرحمٰن خاں صاحب جنرل قونصل دولت عالیہ، تاشقند

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ!

۱۶حمل پیر کے روز محل پہنچا اور پھر پسولکا اسٹیشن سے روسی افسر خارجہ کے گھر قیام کیا. اسی دن مہر شدہ سرکاری اشیاء جو چودہ صندوق ہیں وصول کیں اور وزارت خارجہ آفس میں لے آیا. ۱۸حمل بدھ کے دن چھل دختران (ایک مقام کا نام) جانے کے ارادہ سے تمام سرکاری اشیاء ڈاک اور ذاتی سامان (غیر مہر شدہ) کو لے کر دموجنہ کے ادارہ میں لے گیا. یہاں پنجا لنک آسوب اویل اپنے اسسٹنٹ کے ساتھ پہلے سے موجود تھا. کسٹم آفیسر نے دونوں اور ڈاک کا وزن کرنے کے بعد عالیجاہ عبدالحمید خان کے کوریر اور خان صاحب کے سامان کی تلاشی کا ارادہ کیا. نیز مہر شدہ سرکاری اشیاء کی بھی تلاشی لینا چاہی. بندے نے کہا کہ

یہ مہر بند اشیاء سرکاری ہیں، مجھے انھیں معائنہ کرانے کی اجازت نہیں اور آپ بھی حسب قانون ان کی تلاشی لینے کا حق نہیں رکھتے.ان کے لیے وزارت خارجہ ماسکو نے پاس کرادینے کا خط دیا ہے وہ بھی جلد پہنچا چاہتا ہے.میرے جواب میں انہوں نے کہا کہ ہمیں اندیشہ ہے کہیں اس میں روسی حکومت مخالف سامان ہو لہٰذا تلاشی لینا ضروری ہے.میں نے کہا حکومت افغانستان تو روسی حکومت کی دوست ہے وہ روس کے نقصان کا ہرگز کوئی ارادہ نہیں رکھتی، میرے پاس ویزا ہے. . .(مٹے ہوئے الفاظ). . مہر توڑنے کے خیال سے فی الحال باز آ گئے اور میرے ذاتی سامان کی طرف متوجہ ہوئے (جو مہر بند نہ تھا) اور تلاشی لینے کا ارادہ کیا.میں نے کاتب کی حیثیت سے پیش ہو کر کہا کہ میرے اشیاء تلاشی (قانونی اعتبار سے) محفوظ ہیں.میرے جواب میں انھوں نے کہا کہ کاتب اول اور سفراء قونصل ہی (قانونی اعتبار سے) محفوظ ہوتے ہیں لیکن روسی قانون میں کاتب دوم کی اشیاء سامان اور دوسرے کارندوں کے اسباب ومتاع تلاشی سے مستثنیٰ نہیں ہوتے.میں نے اس کی تردید کی اور کہا کہ بین الاقوامی قانون میں کاتب ثانی مجلس سفارت یا قونصل گرامی کا جزو ہوتا ہے اور وہ بھی تلاشی سے کاتب اول کی طرح مستثنیٰ ہے اور اس امر میں کوئی فرق نہیں (وہ کاتب اول ہے یا دوم).میرے جواب میں انھوں نے کہا کہ خیر روس کا قانون اس طرح نہیں ہے.

میں نے اس کے جواب میں کہا کہ بہت اچھا اگر روس کا قانون یہ نہیں تو سامان کی تلاشی اسی وقت لازم تھی جب میں نے سامان پر تیر کا نشان لگانے کو کہا تھا.اب میں اپنی تمام سرکاری اور ذاتی اشیاء اور سامان کو یہیں چھوڑ تا ہوں اور ہرات جا کر اس سلسلے میں تمہارے قونصل سے گفتگو کرتا ہوں.اس کے بعد ہماری اور آپ کی حکومت کے درمیان جو بھی فیصلہ ہوگا اس پر عمل کیا جائے گا.میرے جواب میں انھوں نے کہا کہ یہ مال آپ کسی کی تحویل میں نہیں دے سکتے.اگر تم خود یہیں رہو گے تو تمہارے سامان کی ہم تمہارے آگے تلاشی نہیں لیں گے.اس کے بعد میں رہنے پر راضی ہوگیا.اور دونوں بکس ڈاک (خطوط)

عالی جاہ عبدالحمید خاں کے کوریر کے ہاتھ چہل دختران روانہ کر دیا اور خود وہیں رہا تاکہ آپ وزارت خارجہ کو خط روانہ کریں اور اسے میں اپنے ہمراہ لے کر ہرات چلا جاؤں. اور خان صاحب کو بھی میں نے ہرات روانہ کر دیا.

کوریر گیا تو پنجالنک اسوب اویل نے خلاف عہد اور بلا اجازت میرے ذاتی سامان کی تلاشی لینا شروع کر دی. روسی افسر خارجہ بھی اس میں ان کے شریک کار تھے. صندوق اور میرے بستر کی تلاشی لینے کے بعد دو چنگیری روٹی وغیرہ رکھنے کے لیے مجھے دی. اور ایک چھوٹا صندوق جس میں سامان بھرا ہوا تھا کارٹون میں شکاری بندوق اور ستارے دیکھنے کے لیے ایک دوربین اور بعض دوسری چیزیں صابن پاؤڈر وغیرہ کہ یہ سبھی اشیاء ہمارے جناب مکرم غلام محمد خاں صاحب سرکار کاتب سفارت مختاری (مقیم) ماسکو نے اپنے والد محترم کے لیے بھجوائی تھیں روسیوں نے سبھی ضبط کر لیں.

تلاشی کے بعد میں نے کہا اپنے قول، قانون کے خلاف اور بغیر میری اجازت اس طرح آپ کا تلاشی لینا حکومت افغانستان کے لیے ایک سند ہے. اس کے بعد پنجالنک آسوب اویل وراس کا معاون ایک کمرے میں مجھے لے گئے اور دروازے بند کر کے مجھ سے کہا ہمارا گمان ہے کہ تمہارے پاس روس مخالف مواد ہے اس لیے ہم تمہارے جسم کی تلاش لیتے ہیں. میں نے پھر قانون کی بات کہی تو انھوں نے کہا کہ افغانستان کے قوانین دوسرے ہیں اور روس کے دوسرے. روس کا قانون وہی ہے جس پر ہم عمل کر رہے ہیں. بالآخر میری تلاشی لی. میرے پاس میرے ذاتی کتابچے اور متفرق مکاتیب تھے جو بعض حضرات نے اپنے دوستوں کو دینے کے لیے مجھے دیئے تھے. ان میں ایک مکتوب جناب محترم فقیر احمد خان سرکار کاتب سفارت مختاری ماسکو کا تھا جو انہوں نے افسر خارجہ مزار شریف کو لکھا تھا کہ ہرات میں جا کر ڈاک کے حوالے کر دیا جائے. علاوہ ازیں سند خدمات بھی تھیں اور بعض معمولی کاغذات تھے غرض کہ جو بھی چیز میری جیب میں ملی انھوں نے لے لی

اور مجھ سے دستخط کرالیے کہ یہ اشیاء مجھ سے لی ہیں. اور میں نے اس کی ایک کاپی پنجالنک کے دستخط کرواکے اپنے پاس رکھ لی ہے.

جب میں نے عبدالحمید خان کے ہاتھ جناب رسالدار فقیر محمد خان کو خط ارسال کیا تھا اس کے دوسرے دن خود رسالدار صاحب آئے تھے ان سے میں نے مہر توڑنے اور سرکاری چیزوں کے بارے میں کافی گفتگو کی تھی لیکن کچھ فائدہ نہیں ہوا. انھیں کی زبانی معلوم ہوا کہ اس کے بعد چہل دختران کے روسی تھانے میں آدم آسوب اویل گیا تھا اور ڈاک کی بھی تلاشی لینا چاہی تھی. اسی کشمکش میں ڈاک کی مہر بھی اکھڑ گئی. رسالدار صاحب نے دو تین دن عبدالحمید خان کو چہل دختران میں اسی جرم میں بند کئے رکھا کہ مہر اکھڑی ہوئی ڈاک کیوں لے کر آئے. پھر انھیں ہرات روانہ کر دیا. میرے بارے میں رسالدار صاحب کی خواہش تھی کہ مجھے چہل دختران جانے کی اجازت دے دیں، یا پھر چھوڑ دیں تا کہ تاشکند (تاشقند) واپسی ہو جائے اور سرکاری مال کا خط لے آؤں. لیکن افسر خارجہ نے اجازت نہ دی. عذر کر دیا کہ ہم نے تمہارے بارے میں تاشکند ٹیلیگرام کیا ہے لہٰذا ہم مجبور ہیں کہ مرکز کے حکم کے مطابق عمل کریں. **توکلنا علی اللہ.**

منصور عفا عنہ

بروز پیر ۲۲ حمل ۱۳۰۲ھ شمسی (۲۰ اپریل ۱۹۲۳)

سفارتی آداب کی خلاف ورزی

مولانا منصور انصاری کا روس کا یہ سفارتی سفر ہزار دقتوں اور پریشانیوں سے پُر تھا اور بظاہر مغربی سرمایہ داری کے خلاف قائم ہونے والی روس کی نئی حکومت مروجہ سفارتی آداب کی خلاف ورزی میں آزاد تھی. اس سفر میں سامان کی تلاشی پر تنازعہ شروع ہوا حکومت افغانستان نے مولانا منصور انصاری کی حمایت کی، مگر وہ موثر نہ ہوئی. مولانا منصور انصاری

نے روس میں غالباً ساڑھے تین مہینے قیام کیا. یا تو وہ خود ہی روسی حکومت سے بیزار ہو گئے یا پھر حکومتِ روس نے ان کو افغانستان واپس جانے پر مجبور کر دیا یقینی علم تو نہیں ہو سکا کہ وہ روس سے کب واپس ہوئے لیکن ۶ ستمبر ۱۹۲۳ کو انقرہ سے انہوں نے اپنے کسی معتمد کو جو خط تحریر کیا تھا اس سے واضح ہے کہ وہ انقرہ جانے سے پہلے اس زمانہ میں وہ کابل میں قیام پذیر تھے. اس خط میں مولانا منصور انصاری لکھتے ہیں:

> انقرہ سے آپ کے چلے جانے کے تین ہفتہ بعد میں یہاں پہنچا. اب میں تین ہفتہ یہاں مزید رکوں گا. امید ہے کہ آپ کے بعد راجہ صاحب (غالباً راجہ مہندر پرتاپ) بھی دارالسلطنت کابل پہنچ گئے ہوں گے. جناب شیخ عبدالعزیز (شاویش) اپنے وطن (مصر) واپس چلے گئے. قاضی صاحب اور دوسرے ساتھی بھی مختلف علاقوں کی طرف کوچ کر گئے. امید ہے کہ آپ اپنے حالات کے بارے میں تفصیل سے تحریر فرمائیں گے. تمام احباب خصوصاً راجہ صاحب کو خصوصی سلام پہنچا دیں. فقط والسلام

عبد حریت محمد میاں منصور انصاری

مقیم حریت ہوٹل انقرہ ۲۴ محرم ۱۳۴۲ھ/ ۶ ستمبر ۱۹۲۳

بہر حال یہ طے ہے کہ وہ اپریل ۱۹۲۳ میں روس گئے تھے، اگرچہ یہ واضح نہیں کہ وہاں قیام کی نوعیت کیا رہی، لیکن اتنا واضح ہے کہ وہ اگست ۱۹۲۳ میں کابل میں تھے اور راجہ مہندر پرتاپ وغیرہ کے ساتھ پھر آزادی ہند کے انقلابی مشن میں شامل ہو گئے تھے اور شاید آئندہ کسی سفارتی ذمہ داری پر جانے کا پروگرام نہیں تھا. اسی لئے انہوں نے وزارت خارجہ سے اپنے بقایاجات ادا کرنے کی درخواست دی جسے ۲۷ سنبلہ ۱۳۰۲ (۱۹ ستمبر ۱۹۲۳/ ۶ صفر ۱۳۴۲ھ) کو منظوری مل گئی.

باب/ درس نمو

تعلیم نسواں

مورخوں اور عمرانیوں کی غفلت یا ان کی تاریخی تحریروں کی گمشدگی یا ان تحریروں سے بوجوہ ارباب معاشرہ کی بے اعتنائی کے سبب سے تاریخ نے بہت سے معمے مستقبل کے ماتھے پر دے مارے ہیں. ان میں ایک معمہ مسلم عورتوں کی تعلیم کا مسئلہ ہے.

ہندستان میں اس کا ایک ظاہری سبب شدر اور دیگر نچلی جاتیوں کے ساتھ ہندو عورتوں کو تعلیم سے بیگانہ رکھنے کا قدیم رواج تھا. قدیم آریائی سماج کی نچلی جاتیوں کو علم سے بے بہرہ رکھنے کا اصل سبب تو نسلی امتیاز تھا، لیکن خاص طور پر اسلامی ہند میں ہندوؤں میں اپنی عورتوں کو عام مادی علوم سے دور رکھنے کی ایک اہم عمرانی وجہ تھی. اسلام کے زیر اثر ہندو عورتوں میں بھی پردہ یا کم سے کم لمبے گھونگھٹ اور ستر پوشی کا رواج پڑ گیا تھا. عورتوں کو کسی قسم کا سرکاری یا غیر سرکاری کام کرنا نہیں تھا. دیہاتوں میں وہ کھیتوں میں مدد کرتی تھیں جس کے لئے عملی تجربہ تو ضروری تھا لیکن مدرساتی تعلیم درکار نہیں تھی. مگر ہندو مردوں نے ہوشیاری کی کہ وہ خود تو مسلم بادشاہوں اور نوابوں کے پاس نوکری کرتے تھے اور اس مقصد کے لئے عربی، فارسی اور اردو میں مہارت حاصل کرتے تھے مگر اپنی عورتوں کو گھروں میں صرف ہندی زبان پڑھاتے تھے تاکہ ان کی مذہبی اور مادری زبان زندہ رہے اور ان کی آئندہ نسلیں اپنے دھرم اور اس کی ریت رواج سے دور نہ ہو جائیں.

اس کے برعکس مسلمانوں نے انگریزی دور میں اپنی عورتوں کو کالجوں میں بھیجا یہاں تک کہ آج ان کی نسلیں اپنی مادری زبان اردو پڑھنا اور لکھنا تو درکنار اردو کا ایک لفظ

درست نہیں بول سکتیں، اوراسی لئے دین سے بیگانہ اوراپنی تہذیب اور تاریخ سے بے خبر ہیں کیونکہ برصغیر میں اسلامی دینی، تہذیبی اور تاریخی معلومات کا بڑا ذخیرہ اردو ہی میں ہے.

لیکن یہ قصہ جدید دور کا ہے. ماضی قریب میں مسلم عورتوں کی دینی تعلیم کا انتظام بھی نہیں ہوا صرف علماء کے گنے چنے گھروں میں عورتوں کو چند بنیادی باتیں بتانے کا طریقہ تھا، جبکہ ان علماء کے خاندانوں ہی کی اکثر عورتیں اس قابل بھی نہیں کہ ضرورت پڑ جائے تو بچیوں کو قرآن شریف، اردو، حساب اور بہشتی زیور پڑھا کر ہی گزر بسر کر لیں. اس رویہ کے اسباب کیا تھے کوئی نہیں جانتا مگر حقیقت یہ ہے کہ ۱۸۵۷ کی جنگ آزادی کے بعد امت میں علم سے دوری کی روایت قائم ہوئی جسے دیو بند اور علی گڑھ بھی شکست نہ کر سکے.

عورتوں کی تعلیم نہ تو اسلام میں ممنوع ہے اور نہ مسلم تاریخ سے ایسی کوئی بات ثابت ہے. حقیقت یہ کہ تاریخ تو یہ بتاتی ہے کہ کئی مسلم خواتین مرد وائمہ کی استاذ ہوئی ہیں. ہندستان میں مسلم دور حکومت (۱۲۰۷-۱۸۵۷ء) کے دوران حکمراں خاندانوں کی خواتین اعلی تعلیم یافتہ بلکہ اہل قلم ہوتی تھیں. سلطان شمس الدین التتمش کی بیٹی رضیہ سلطانہ بڑی ذی علم خاتون تھی، شہسواری اور تیغ زنی کی ماہر تھی. بابر کی سب سے چھوٹی اولاد گلبدن بیگم فارسی اور ترکی کی اہل زبان اہل قلم تھی اور اس کی کتاب ہمایوں نامہ تاریخ کی اساسی کتابوں میں شمار ہوتی ہے. جہاں گیر کی بیوی نور جہاں بڑی ذی علم، عقل مند خاتون تھی اور فی البدیہ شعر بھی کہہ لیتی تھی اگر چہ باقاعدہ شاعرہ نہیں تھی.

شاہجہاں کی بیٹیاں جہاں آرا بیگم اور روشن آرا بیگم دونوں اعلی پایہ کی عالمہ تھیں. اورنگزیب کی بیٹی زیب النساء غالبا اس کی اولاد میں سب سے زیادہ ذہین اور ذی علم تھی اور شاعرہ بھی تھی. اس کا علمی مقام یہ تھا کہ فتاوی عالمگیری جیسی فقہی موسوعہ مرتب کرنے والوں میں شہزادی زیب النساء کا نام شامل ہے..

مگر پھر انگریزوں کے دور حکومت میں جب مسلم تعلیمی نظام کو مکمل طور پر منہدم اور

معدوم کر دیا گیا تو اس طرف مسلمانوں کی وہ توجہ نہ رہی اور یہی معاشرتی روایت بن گئی. اگر بچیوں کو سکولی تعلیم کی راہ سے انگلستانی تہذیب سے دور رکھنا مقصود تھا تو یہ اس درجہ قابل اعتراض بات نہیں تھی، لیکن اس خطرہ سے تحفظ کا راستہ اگر اعلیٰ نہیں تو کم سے کم اچھی اسلامی دینی تعلیم کا تھا. اس سے خود علما کے خاندانوں میں بھی غفلت نا قابل فہم تھی.

مولانا منصور انصاری نے اپنے معاشرہ کی اس خرابی کا احساس کیا. اپنے والد مولانا عبداللہ انصاری کے فکر کے مطابق وہ تعلیم کو دینی اور دنیاوی خانوں میں بانٹنے کے حامی نہیں تھے. علم اللہ تعالیٰ کی صفت ہے اور صرف علم ہے بشرطیکہ وہ انسانوں کے نفع بخش ہو. مسجد، آپ کا گھر، اور شہر کی سڑک تعمیر کرنے والا مسلمان معمار اور مستری دینی علم کے اعتبار سے کمزور یا غیر اہم ہرگز نہیں ہے صرف اس لئے کہ اس نے مدرسہ میں ہدایہ اور شرح وقایہ نہیں پڑھی. عمرانی حقیقت یہ ہے کہ ایسے علما بھی ہیں اور ہوئے ہیں جنہوں نے علم دین کو دنیا سازی کے لئے استعمال کیا اور مادی علم رکھنے والے ایسے لوگ بھی ہوئے ہیں جنہوں نے دنیا کو آخرت کا راستہ بنانے کا گر انسانوں کو دکھا دیا. مگر یہ حالت عورتوں کو علم دین تک سے محروم رکھنے کی دلیل نہ تھی اور نہ ہے.

افغانستان کی وزارت تعلیم سے وابستگی کے دوران مولانا منصور انصاری نے لڑکیوں کی تعلیم کا انقلابی قدم اٹھایا. اس زمانہ میں افغانستان میں بھی لڑکیوں کی تعلیم شجر ممنوعہ تھی اور اس کے حق میں کوئی لب کشائی نہیں کر سکتا تھا. خراسان جس نے دنیائے علم کو نابغۂ روزگار شخصیات دی تھیں علم سے تہی ہو گیا تھا. افغانستان میں عموماً مردوں ہی کو علم سے دلچسپی نہیں رہی تھی تو خواتین کس شمار میں تھیں. بے علمی کی فضا میں یہ بات پٹھانوں کی غیرت کے منافی بن گئی تھی کہ ان کی خواتین گھر کی چہار دیواری سے باہر نکل کر علم حاصل کریں. وہ اس کے صرف منفی پہلوؤں پر نظر رکھتے تھے، مثبت پہلو پر ان کی نظر نہیں تھی. بلکہ وہ خواتین کی تعلیم کو شریعت سے متصادم سمجھتے تھے.

اس عام غلط فہمی کے ازالہ کے لئے مولانا منصور انصاری نے پہلے ان کی ذہن سازی کی اور دلائل سے بتایا کہ شریعت اسلامیہ نے عورتوں کو حقوق عطا کئے ہیں اور قرآن و حدیث کی روشنی میں بتایا کہ عورتوں کو علم سے دور رکھنا محرومی ہے. اس مقصد کے لئے انہوں نے ایک رسالہ ''تعلیم النساء فی الاسلام'' تحریر کیا. یہ معلوم نہ ہوسکا کہ یہ رسالہ طبع ہوا تھا یا نہیں. اصل رسالہ باوجود کوشش کے دستیاب نہیں ہوسکا. ممکن ہے وہ ان کاغذات میں ہو جو قاری حمید میاں انصاری کے پاس تھے اور پتا نہیں ان کے انتقال کے بعد وہ کاغذات محفوظ ہیں یا معدوم ہوگئے. البتہ مولانا منصور انصاری نے ترکی میں متعین سفیر افغانستان سردار عبدالہادی خاں کو، جو اُن دنوں میں بخارا میں تھے، اس رسالہ کی ایک نقل ایک وضاحتی خط کے ساتھ بھیجی تھی جس میں لکھا تھا کہ از روئے شرع حصول تعلیم ہر مسلمان پر فرض ہے اور اس میں عورتیں شامل ہیں. یہ خط ڈاکٹر عابداللہ غازی کے ذخیرۂ دستاویزات میں موجود ہے. اس خط میں مولانا منصور انصاری نے سردار عبدالہادی خاں سے اس رسالہ کا مسودہ ملاحظہ کرنے کی درخواست کی تھی.

تعلیم نسواں کے متعلق مولانا منصور انصاری بہت سنجیدہ تھے اور شریعت اسلامیہ کی روشنی میں اس کا حل نکال کر اس جمود کو توڑنا چاہتے تھے جو اس مسئلہ پر افغانستان اور جنوبی ایشیا میں پایا جاتا تھا. انہوں نے علماء کو بھی عورتوں کی تعلیم کے مسئلہ پر غور کرنے کی دعوت دی تھی اور ہندستان میں افغانستان کے سفیر سردار عبدالحسین خاں کی معرفت علمائے ہند کی خدمت میں بھی اپنا رسالہ روانہ کیا تھا. اس سالہ پر علماء ہند کے ردِّعمل کا حتمی علم تو نہیں ہے لیکن مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی مہتمم دارالعلوم دیوبند نے مولانا محمد میاں منصور انصاری کو ایک خط میں اطلاع دی تھی کہ اس اہم علمی مسئلہ کی وضاحت سے سردار عبدالحسین خاں صاحب کو مطلع کردیا گیا ہے.

اپنے جواب میں مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی لکھتے ہیں کہ

دونوں پہلو ظاہر کر دیئے گئے .جس جانب کو ترجیح تھی اس کو بھی ظاہر کر دیا گیا.امید ہے کہ دوسری جگہوں سے بھی جواب آ گئے ہوں گے.اس سے مطلع فرمائیں کہ ان فتووں کا کیا اثر ہوااور بالآخر کیا فیصلہ قرار پایا.

یہ خط ۲۰ دسمبر ۱۹۲۳ (۱۱ جمادی الاولی ۱۳۴۲ھ) کا ارسال کردہ ہے لیکن یہ واضح نہیں کہ علماء دیوبند کس جانب کو ترجیح دیتے تھے .بہرحال اس معاملہ میں پیش رفت تاریخ کا حصہ نہیں ہے.

اس مہم سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ روس سے کابل واپسی اور افغانستان کی وزرات تعلیم سے وابستگی سے قبل ہی مولانا منصور انصاری تعلیم نسواں سے دلچسپی لے رہے تھے.اس سے ایک نازک معاشرتی مسئلہ پر رائے عامہ کو ہموار کرنے کے لئے سرکاری طور پر ان کی کوششوں کا اندازہ بھی ہوتا ہے.وہ افغانستان میں خواتین کی تعلیم سے متعلق ایک زبردست انقلاب لانے کے خواہش مند تھے.اور چاہتے تھے کہ ہندستان کے علماء اسلام اس معاملہ میں مثبت اقدام سے ملت کی رہنمائی کریں.

بہاؤ رک جائے تو جوہڑ بن کر پانی سڑ جاتا ہے.اور بہتا رہے تو چٹانوں میں بھی راستہ نکال لیتا ہے.عورتوں کے لئے مدرسوں کی ضرورت سے شدید انکار کے بعد اب خود مولویوں کے خاندانوں کی لڑکیاں دنیاوی سکولوں کالجوں یونیورسٹیوں میں جارہی ہیں اور ان میں وہ بھی ہیں جو دین سے دور ہورہی ہیں اور مغربی معاشرتی اور سیاسی اثرات کے دباؤ میں نسویت (feminism) جیسے منفی فلسفوں کے جھنڈے اٹھا لیتی ہیں.

مولانا محمد میاں منصور انصاری اس حالت سے مسلم معاشروں اور مسلم عورتوں کی حفاظت کرنا چاہتے تھے.

خیر کا نقطۂ آغاز

تعلیم نسواں مولانا منصور انصاری کے لئے ایک ہنگامی خیال نہیں تھی. جو بات امت کی بیٹیوں کے لئے پسند کی اس کا آغاز اپنی بیٹی سے کیا کیونکہ اس اہم معاملہ میں وہ بہت سنجیدہ تھے. ان کی فکری رہنمائی میں یہ انصاری خاندان عورتوں کی تعلیم کی حمایت میں بڑا سرگرم تھا مولانا منصور انصاری کے چھوٹے بھائی مولانا احمد میاں انصاری بڑے بھائی کے ہم فکر تھے. ان دونوں کے والد مولانا عبداللہ انصاری انبہٹوی کے شاگرد مسیح الملک حکیم اجمل خان دہلوی تقریبا سو سال پہلے عملی اقدام اٹھا کر قرول باغ دہلی کے طبیہ کالج میں زنانہ تعلیم کا آغاز کر چکے تھے.

ہندستان کے علماء نے ۱۹۲۳ میں مولانا منصور انصاری کی تجویز کی کھلی مخالفت تو نہیں کی مگر کوئی مثبت عملی قدم بھی نہیں اٹھایا، جس سے ان کا نقطۂ نظر بہر حال سامنے آیا. یقیناً اس رائے کے حق میں ان کے دلائل بھی ہوں گے، تاہم وہ دلائل بھی سامنے نہیں آئے کہ مزید گفتگو کا دروازہ کھلتا.

دوسری جانب ہندستان میں اس زمانہ کے اشراف، یعنی نوابین اور جاگیردار زمیندار، اور افغانستان میں قبائلی سردار بھی عورتوں کی تعلیم سے دلچسپی نہیں رکھتے تھے مگر ان کے دلائل کو رد کرتے ہوئے شیخ محمد عبداللہ پاپا میاں کی کوششوں سے ۱۹۰۶ میں علی گڑھ میں اپر کوٹ کے علاقہ میں ایک چھوٹا سا زنانہ سکول کھل گیا تھا، جو ۱۹۲۱ میں مسلم یونیورسٹی کے ماتحت ہائی سکول بن گیا اور ۱۹۲۲ میں انٹرمیڈیٹ کالج کے درجہ پر ترقی کر گیا. ظاہر ہے علی گڑھ کا یہ زنانہ مدرسہ دنیاوی تعلیم کے لئے تھا؛ دینی تعلیم وہاں جزوی اور نیم ضروری تھی.

مولانا منصور انصاری کا فکر بنیادی طور پر اسلامی تھا. عالمی تبدیلیوں کو وہ قرآنی عمرانیات کی نگاہ سے دیکھتے تھے. وہ دنیا کے کئی انقلابات کے عینی شاہد تھے. افغانستان میں حبیب اللہ خان، امان اللہ خاں، بچہ سقہ اور شاہ نادر خان کے انقلابات ان کے سامنے برپا ہوئے. انقلاب روس کا تو وہ خود بھی دوبار شکار ہوئے. انقلاب خراسان (ایران) کے نتیجہ میں سلطنت قاچار کا خاتمہ اور پہلوی شاہی کا قیام ان کے زمانہ میں ہوا. پہلی عالمی جنگ کے بعد انہوں نے یورپ کا نیا نقشہ بنتے دیکھا. آسٹری ہنگری شہنشاہیت ان کے زمانہ میں صفحہ یورپ سے مٹ گئی. جرمنی کی شہنشاہیت ان کے سامنے قصہ ماضی بنی اور انہوں نے وائمر جمہوریہ بنتے دیکھی. انہوں نے جرمنی میں ہٹلر، اٹلی میں مسولینی، پرتگال میں سلازار، ہسپانیہ میں فرانکو کی آمریتوں کا عروج دیکھا. سلطنت عثمانیہ ان کی آنکھوں کے سامنے داستان پارینہ بنی. ترکی میں لادینی قومی حکومت اس دور میں قائم ہوئی. اسی جنگ اور سلطنت عثمانیہ سے بغاوت کے نتیجہ میں عربوں کو تتر بتر ہوتے انہوں نے کھلی آنکھوں دیکھا.

ان تمام عالمی انقلابات کے تجزیہ میں انہیں عالم انسانیت کی بے راہ روی اور اس کے نتیجہ میں ناکامیوں کا ایک تسلسل دکھائی دیا. اسی لئے وہ اسلام کے بنیادی افکار و اقدار میں کوئی سمجھوتہ کرنے کے لئے تیار نہیں تھے. وہ چاہتے تھے کہ آئندہ پچاس سو برسوں میں جو چیزیں اسلام کے لئے چیلنج کی شکل اختیار کرلیں گی ان کے بارے میں علما اسلام کو ابھی سے غور و فکر شروع کرنا لازم تھا اور ان راہوں کو ہموار کرنا ان کی ذمہ داری تھی جن سے مستقبل کی اسلامی نسلوں کو بہر حال گذرنا مقدر تھا.

اسی فکری پس منظر میں ان کا نظریہ تعلیم نسواں مرتب ہوا تھا.

یہ پس منظر ملت کا وہ منظر نہ بن سکا جس کا خواب ایک آوارۂ وطن اور غریب الامت نے سوسال پہلے دیکھا تھا. مگر پھر عورتیں گھروں سے نکلیں اور علم کی ان راہوں پر گئیں جہاں ان کا اپنا وجود تو ضرور تھا مگر ملت کا مستقبل نہیں تھا.

انقلابی قدم

یہ وہ زمانہ تھا جب افغانستان جیسے قدامت پسند ملک تو در کنار ہندستان میں بھی عموماً اور مسلمانوں میں خصوصاً خواتین کی تعلیم کا تصور تک محال تھا. مولانا منصور انصاری ہندستان سے دور اور اپنے وطن کے خواص پر غیر موثر تھے تو انہوں نے افغانستان اور قبائل آزاد میں تعلیمی مہم شروع کی. لیکن جو بڑا انقلابی کام انہوں نے کیا وہ اپنی صاحبزادی قدسیہ خاتون کو مرتب و منظّم نصابی تعلیم سے آراستہ کرنے کا تھا.

والد کی ہدایت پر قدسیہ خاتون نے قرولباغ دہلی کے طبیہ کالج میں طب کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی اور امتیازی کامیابی پر سونے کا تمغہ حاصل کیا. یہ ذہن میں رہے کہ قدسیہ خاتوں پر کوئٹہ کے زلزلہ ۱۹۳۵ کا سنگین سانحہ گزر چکا تھا اور ان کی ذہنی صحت اس سے متاثر تھی. مگر ان کو تحصیل علم، خصوصا اسلامی علوم کا اس قدر شوق ہوا کہ ایک خط میں والد مکرم سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ:

> میں ترجمہ قرآن مجید سیکھنا چاہتی ہوں، اس کے لئے مجھے آپ سے بہتر اور مناسب کوئی آدمی نہیں ملتا جو قرآن کے مفاہیم و معانی و مطالب کو کماحقہ سمجھا سکے. لہٰذا اس کے لئے یا تو آپ مجھے افغانستان بلا لیں یا پھر آپ ہندستان تشریف لے آئیں.

یہ پورا خط تعلیم نسواں کے موضوع پر ایک اہم دستاویز ہے.

اس خط پر تاریخ ۲۲ رمضان المبارک ہے مگر سن درج نہیں ہے. قیاس ہے کہ یہ خط ۲۲ رمضان المبارک ۱۳۵۷ھ (۱۶ نومبر ۱۹۳۸) کو تحریر کیا گیا تھا کیونکہ خط میں انہوں نے والد محترم سے ملنے کی خواہش ظاہر کی ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ مجھے آنے کے لئے پاسپورٹ بنوانا ہوگا نیز تین آدمیوں کے مصارف بھی ہوں گے. یقینی طور پر اس کے بعد مولانا منصور

انصاری نے بیٹی کو بلانے کے انتظامات کئے ہوں گے.

یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ قدسیہ خاتون ۱۳۵۸ھ/ ۱۹۳۹ میں والد محترم سے ملاقات کے لئے افغانستان گئی تھیں. اس سفر میں مولانا قاری محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند، مولانا حامد الانصاری غازی، ان کی اہلیہ محترمہ ہاجرہ نازلی ساتھ تھے. اس لئے اس خط کی تاریخ ۲۲ رمضان المبارک ۱۳۵۷ھ کی مطابقت ۱۶ نومبر ۱۹۳۸ ہونا صحیح معلوم ہوتا ہے.

قدسیہ خاتون کا یہ خط ایک انقلابی باپ کی انقلابی بیٹی کے خیالات ہی نہیں بلکہ ایک ایسے دور کی تمہید تھے جس میں اسلام کو دوبارہ ایک ولی قوت بننا مقدر ہے.

بیٹی کا خط باپ کے نام

۲۲ رمضان المبارک

مخدومی معظمی حضرت اقدس قبلہ والد صاحب

بعد آداب مؤدبانہ عرض ہے کہ الحمد للہ میں بخیریت رہتے ہوئے آنجناب و بھائی صاحب (قاری حمید میاں انصاری) کی خیریت درگاہ رب العزت سے نیک چاہتی ہوں.

ایک عرصہ سے آنجناب کی خدمت میں عریضہ ارسال کرنے کی کوشش کر رہی تھی مگر صدمات پیہم کا احساس و خیالات کا انتشار کسی ارادہ میں کامیاب نہیں ہونے دیتا.

پیارے ابا جان، گذشتہ واقعات یاد آ کر باوجود صبر کی انتہائی کوشش کے اب بھی میری آنکھیں برق و باراں بن جاتی ہیں. آج کل میری زندگی مجسم حسرت و یاس ہے. میں سکون کی تلاش میں چمکتے ہوئے ستاروں، نیلے آسمان، لہلہاتے ہوئے درختوں کو دیکھتی ہوں لیکن نہ تو آپ جیسا وہ چہرہ کسی شے میں نظر آتا ہے اور نہ ہی میرے دل مضطر کو قرار آتا ہے.

بہر حال اس مالک حقیقی پر نظر ہے آپ بھی دعاء فرمائیے کہ وہ مجھے اطمینان کی دولت عطا فرمائے اور اپنی محبت میں سرشار کر دے.

میں آج کل دہلی میں مقیم ہوں جس کی وجہ یہ ہے کہ زلزلہ کوئٹہ سے میری صحت پر کافی اثر پڑا کیونکہ میں بھی بہت کافی ملبے میں دب گئی تھی. من جملہ اور تکالیف کے ہر وقت آنتوں میں اور دل میں درد رہنے لگا، یہاں تک کہ دل کے درد کی وجہ سے مجھے ایک لمحہ کے لئے بھی زندگی کی توقع نہیں رہتی.

چنانچہ ان حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ رائے ہوئی کہ مجھے طبیہ کالج میں داخل کر دیا جائے کیونکہ چچا میاں (مولانا احمد میاں انصاری) نے (اپنی صاحبزادی) آپا محمودہ صاحبہ کو بھی جو گذشتہ دو سال سے یہاں رہتی تھیں ان کے لئے بھی سب کی رائے (یہی ہوئی). اسی طبّیہ کالج میں ان کی وجہ سے چچی بہو (مولانا احمد میاں انصاری کی اہلیہ) بھی اس سال یہاں داخل ہوگئی ہیں.

زنانہ طبیہ کالج حکیم اجمل صاحب مرحوم نے خاص اسی غرض سے بنایا ہے کہ بیکس وغمگین ہستیاں یہاں آ کر آرام پائیں، نیز تعلیم سے مستفید ہو کر اپنے پیروں پر کھڑی ہو جائیں اور خلق خدا کی بہتری و بہبودی کا باعث بنیں.

یہاں پر بورڈنگ میں شرفاء کی کم و بیش ۳۰ لڑکیاں رہتی ہیں. پردہ کا خاص انتظام ہے. استانیاں سب مسلمان نیک و شریف الخیال ہیں اس لئے مریضوں کا علاج وغیرہ بھی بہت اچھی طرح سے ہوتا ہے. کالج کے سرپرست حکیم محمد احمد صاحب ہیں اور وائس پرنسپل ان کے بھتیجے ظفر احمد صاحب ہیں. ہماری منصرمہ صاحبہ (وارڈن) لڑکیوں کی ہر جا بیجا حرکت کی نگرانی رکھتی ہیں.

غرض اخلاقی اعتبار سے کالج کی فضا لڑکیوں کے لئے اپنے گھر کی فضا سے کسی طرح کم نہیں.

میرا داخلہ تین باتوں کے پیش نظر ہوا ہے (اول) امراض کا علاج اور ان سے خلاصی (دویم) رنج و غم کی تسکین کیونکہ یہاں پر ہر ایک لڑکی ایک دوسرے کی سچی ہمدرد ہے

اگر ایک غمگین ہوتو سب اس کو خوش کرنے کی کوشش کرتی ہیں اور سب کچھ نہ کچھ رنج والم اٹھائے ہوئے ہیں. اس لئے سب کی داستان الم سن کر بھی کچھ صبر کی تلقین ہوتی ہے. (سویم) تعلیم جو چار سال کا کورس ہے. بشرط زندگی ممکن ہے کہ میں اس سے محترم خالوابا (مولانا مفتی صدیق احمد مالیر کوٹلوی کے داماد) وجنابہ والدہ صاحبہ مکرمہ کی کچھ خدمت کر سکوں نیز شاید اپنے شفیق والدین و پیارے بھائیوں کی پریشانیوں (کو کم کرنے) میں کچھ حصہ لے سکوں کیونکہ یہاں ہماری ہر ایک پروفیسر کی چالیس روپیہ ماہوار تنخواہ ہے، وائس پرنسپل صاحبہ بیگم فخر الدین محمود ڈیڑھ سو پاتی ہیں.

محترم خالوابا کی انتہائی خواہش، میرے انبہٹہ رہنے کی تھی لیکن مخدومہ خالہ صاحبہ خاموش وصبر مجسم ہیں. وہ سب مجھ کو ان کی جگہ پر سمجھتے ہیں.

حضرت محترم بھی دعاء فرمائیں کہ خدائے کریم مجھ کو ان سب کی اطاعت کی ایسی ہی توفیق بخشے جیسی کہ وہ کرتے تھے اور ان سب کو میری ایسی ہی محبت دے جیسی کہ ان کی تھی.

اچھے ابا جی، یہاں آنے سے پہلے میری خواہش تھی کہ میں آنجناب کی خدمت میں حاضر ہو کر تفسیر کلام مجید کا درس لینے کی سعادت حاصل کروں اور بھائی صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر حفظ کلام اللہ شروع کر دوں. مگر اب یہاں داخل ہوگئی اس لئے یہ کورس ختم کرنے کے بعد بشرط زندگی خاص اسی غرض سے حاضر خدمت ہوں گی انشاءاللہ!

میں نے دو ہفتہ ہوئے محترم بھائی صاحب کی خدمت میں عریضہ روانہ کیا تھا. اس کے بعد محترم بھائی میاں صاحب کے خط سے آنجناب کا جلال آباد تشریف لانا معلوم ہوا. خدائے تعالیٰ مبارک کرے. حقیقت میں آنجناب کا بھائی صاحب (قاری حمید میاں) کے پاس تشریف لانا ہم سب کے لئے بہت اطمینان کا باعث ہے. جناب محترم کی خدمت میں اپنے حاضر خدمت ہونے کے متعلق میرا یہ خیال تھا کہ یہاں کا کورس ختم کرنے کے بعد حاضر خدمت ہو کر مستقل قیام کرنے کے بعد خالص زمین دارانہ زندگی بسر کروں تا کہ میری

ذات سے پیارے بھائی جان و جناب محترم کچھ امداد حاصل کرسکیں.

میں موسم گرما کی تعطیلات جو جون سے شروع ہو کر اگست تک رہتی ہیں حاضر خدمت ہو جاؤں لیکن اس صورت میں حضرت محترم کو بہت زیادہ خرچہ برداشت کرنا پڑے گا جو کہ موجودہ حالت کو دیکھتے ہوئے میری طبیعت پر گراں گذرتا ہے. سب سے پہلے پاسپورٹ کا خرچ کیونکہ میرا پاسپورٹ زلزلہ میں دب گیا ہے. اس کے بعد تین آدمیوں کا آمدورفت کا کرایہ. اس لئے کہ میں دو ماہ سے زیادہ قیام نہیں کرسکتی. ان تمام حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے حضرت محترم جیسا حکم فرمائیں اس پر عمل کیا جائے.

محترم بھائی صاحب سے فرما دیجیے کہ میں نے دو تین ہفتہ ہوئے آپ کے پاس خط لکھا تھا مگر اب تک جواب سے محروم ہوں. خدا کے لئے آپ میرے خطوط کا انتظار کئے بغیر اپنی خیریت سے مطلع کرتے رہا کریں کیونکہ میری حالت کا آپ کو علم ہے اس پر انتظار کی تکلیف مستزاد ہو جاتی ہے.

نیز یہ کہ آپ خوب دل لگا کر زمین کی آبادی میں مصروف رہیں اور ایک گائے خرید لیں تا کہ میں آکر دودھ بلو کر آپ سب کو بہت سا مکھن کھلا کر اور کھا کر خدائے تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کروں.

اور ہاں ایک اچھا سا گھوڑا بھی لے لیں کہ ہم اس کی سواری سیکھیں. اور اپنے دونوں کوٹھوں (کمروں) کے ساتھ ایک چھوٹے سے صحن کی چار دیواری بھی اپنے کھیت میں بنوالیں تا کہ ہم صبح سے شام تک وہاں رہ کر رات کو شہر میں واپس آجایا کریں. والدہ صاحبہ محترمہ بخیریت ہیں اور دہلی ہی میں مقیم ہیں. نیز ہم یہاں پر ہر طرح با آرام ہیں.

انشاءاللہ آئندہ ہفتہ بھائی صاحب کی خدمت میں علیحدہ عریضہ روانہ کرونگی.

طالب دعا

آپ کی قدسیہ

مسئلۂ تصویر و مجسمہ

مولانا منصور انصاری کا فکر مجتہدانہ تھا. اس انداز فکر کے تکوینی اسباب پر اوپر بات ہو چکی ہے. دنیا، خصوصاً مسلم دنیا، کو جس طرح انہوں نے دیکھا برتا تھا اس کی دوسری مثال شاذ و نادر ہی ملے گی. اسی وجہ سے وہ جب کسی مسئلہ پر رائے قائم کرتے تھے تو وہ رائے جامد الفکر طبقات کے لئے حیرانی سے زیادہ پریشانی کا باعث ہوتی تھی اور ملت کا مروجہ معاشرتی نظام فرسودگی کی وجہ سے اس پر عمل کے لئے آمادہ نہیں ہوتا تھا، جس کی مثال تعلیم نسواں کے باب میں سامنے آ چکی ہے. یہ الگ بات ہے وہی لوگ جو مولانا منصور انصاری کے انتباہات سے اعتنا نہیں کرتے تھے اب اپنی اولادوں میں لڑکیوں کو بلا جھجک سکولوں اور یونیورسٹیوں میں تو بھیج رہے ہیں مگر ان بچیوں کے لئے دینی مدرسوں کا اہتمام کرنے میں بدستور معذور ہیں.

تعلیم نسواں کی طرح دینی حلقوں میں تصویر کشی بھی شجر ممنوعہ تھی. اس مسئلہ پر بھی مولانا منصور انصاری کی رائے مجتہدانہ تھی. کچھ کم ایک صدی پہلے انہوں علماء عصر کو ان حالات کی طرف توجہ دلائی جو مستقبل قریب میں پیش آنے والے تھے. ان کا نظریہ تھا کہ تصویر کشی اور مجسمہ سازی میں فرق ہے. ان کی جہاں دیدہ تجربہ کار نگاہوں پر آنے والے دور کے وہ حالات آئینہ تھے جب امت اس سلسلہ میں کشمکش کا شکار ہو جائے گی اور سخت گیر علما کو بھی اس سلسلہ میں کوئی نہ کوئی جواز فراہم کرنا ہی پڑے گا.

وہ چاہتے تھے کہ اس سے قبل کہ ایسے حالات پیش آئیں، پیش بندی کے طور پر علما کو از خود اس حساس مسئلہ پر توجہ کرنی چاہیے. چنانچہ ۱۹۳۵ کے اوائل میں انہوں نے علمائے دیوبند کو ایک خط میں اس مسئلہ پر غور و فکر کرنے کی دعوت دی.

تعلیم نسواں کی طرح اس معاملہ میں بھی معلوم نہیں علما نے کیا فیصلہ کیا لیکن مارچ ۱۹۳۵ میں دارالعلوم دیو بند کے مہتمم مولانا قاری محمد طیب نے مولانا منصور انصاری کو جوابی خط میں اطلاع دی تھی کہ

''تصویر کشی کے سلسلہ میں علمائے کرام آپ کے خطوط پر غور وفکر کر رہے ہیں''

اس معاملہ میں کراہت کے ساتھ جزوی گنجائش نکالی گئی. البتہ سب جانتے ہیں کہ ۸۰-۸۵ سال بعد اب ہر فرقہ اور طبقہ کے علما، بشمول علمائے تحریک دیو بند، کرہاً ہی نہیں طوعاً بھی کیمرہ کے فوٹو، ٹیلیوژن، انٹرنیٹ، یوٹیوب اور سوشیل میڈیا وغیرہ پر تصویر کو مباح تو سمجھنے ہی لگے ہیں.

یہ کسی حالت کا ردعمل اور جوابی عمل ہے. رسول اللہ صلی اللہ علیہ سلم کی سنت مختلف ہے. آں حضور نے کبھی ردعمل کا شکار ہو کر کوئی فیصلہ نہیں کیا بلکہ امکانات کو سامنے رکھتے ہوئے ہمیشہ پیشگی اقدامی فیصلے کئے تا کہ امت کی اثباتی استعداد قوی تر ہو.

تصویر و مجسمہ کے بارے میں ارادی فیصلہ اور جبری فیصلہ کا فرق ہی نہیں نقصان بھی یہاں واضح ہو جاتا ہے.

باب/ درس نمو

وزارتِ تعلیم سے وابستگی

روس سے واپس آنے کے بعد مولانا منصور انصاری افغانستان میں کام کرنا چاہتے تھے. وہ مستند عالم دین تھے. تقدیر نے انہیں احوال دنیا کے راست مشاہدہ کا موقعہ دیا جو روایتی علما کو حاصل نہ تھا. افغانستان میں گزشتہ سات سالہ زندگی میں انہوں نے نصف دنیا کا مشاہداتی وتجزیاتی مطالعہ کر لیا تھا اور اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ قرآن حکیم کے پیغام کو عام کئے بغیر مظلوموں، محکوموں اور غلاموں کی آزادی کی جدوجہد کو نشان منزل اور استحکام حاصل نہیں ہوسکتا. اس مقصد کی خاطر انہوں نے اپنی توجہ ترجمہ قرآن پر مبذول کر دی اور ''ضرورتِ ترجمۂ قرآن بہ احتیاج انسان عظیم الشان'' فارسی زبان میں تالیف کی.

اس مسئلہ پر افغان حکام سے ان کی گفتگو ہوتی رہتی تھی. کئی افغان عمائدین ان سے متفق ہوئے اور وزارتِ تعلیم نے ان سے رہنمائی کی درخواست کی اور انہیں محکمۂ تعلیم کا ڈائریکٹر مقرر کر دیا گیا. وہاں بیٹھ کر انھوں نے پوری دو نسلوں کی ذہن سازی کی.

قطعی طور تو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ مولانا منصور انصاری محکمۂ تعلیم سے کب وابستہ ہوئے لیکن ۱۳ جدی ۱۳۰۲ ھ شمسی (۴ جنوری ۱۹۲۴/ ۲۵ جمادی الاولی ۱۳۴۲) کے وزارتِ تعلیم ایک خط میں ان کو دار العلوم شرعیہ کی ایک نشست میں شرکت کی دعوت دی گئی تھی اور اس میں ان کے نام کے ساتھ ''مؤلف وزارتِ معارف'' تحریر کیا گیا تھا. اس بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ وہ جنوری ۱۹۲۴ سے قبل ہی افغانستان کی وزارتِ تعلیم سے وابستہ ہو گئے تھے.

ابتدا میں وہ تعلیم نسواں کی طرف متوجہ رہے اور غالباً بعد میں وہ وزراتِ معارف کے ڈائریکٹر مقرر ہوئے. مارچ ۱۹۲۴ میں وزارتِ معارف سے ان کا ایک معاہدہ ہوا.

مدیریت تحریرات

وزرات معارف نے مولانا منصور کے ساتھ معاہدہ کیا ہے کہ:

۱- اردو زبان میں موجودہ علمی اور ادبی کتابوں میں سے وزارت معارف جس کو انتخاب کرے گی مولانا منصور ''خاں'' مہاجر اس کا ترجمہ کریں گے.

۲- دارالتالیف، معارف کی ترجمانی کے عوض مولانا کو سالانہ ایک ہزار روپیہ دیا جائے گا.

۳- مولانا ہر ہفتہ کم از کم تین صفحہ ۱۵ سطر والا ترجمہ کریں گے اور ہفتہ کے اخیر میں ادارہ تالیفات میں تفویض کریں گے.

۴- وزارتِ معارف ایک ہزار سات سو کابلی روپیہ عائد کے خرچ کے لئے مولانا کو پیشگی دے گی. یہ رقم مولانا کی تنخواہ سے وضع کی جائے گی.

۵- اس سلسلے میں کاغذ، قلم، سیاہی وغیرہ تمام کام کی چیزیں وزارت مہیا کرے گی.

۶- اگر مولانا ادارہ سے استعفا دیں تو جب تک نیا ترجمان حاضر نہ ہوگا تب تک استعفا معطل مانا جائے گا.

جانبین سے یہ قرار پا کر ایک صفحہ وزارت معارف کو اور ایک مولانا کے حوالہ کیا جائے.

تحریر ۲ حمل ۱۳۰۳ھ شمسی (۲۲/ مارچ ۱۹۲۴/ ۱۵ شعبان ۱۳۴۲ھ

جلال آباد میں تقرر

مولانا منصور انصاری کابل میں وزارتِ معارف میں ترجمہ وتبلیغ کا کام کر رہے تھے کہ جلال آباد میں ان کی ضرورت محسوس کی جانے لگی. وزارتِ معارف نے ان کو جلال آباد کے مکاتب کی اصلاح کے لئے بھیج دیا. ابھی وہاں پہنچے چند ماہ ہوئے تھے کہ کابل سے ان کے نام ۳ میزان ۱۳۰۴ھ شمسی (۲۵ ستمبر ۱۹۲۵/ ۶ ربیع الاول ۱۳۴۴) کو ایک سرکاری خط پہنچا جس میں ان سے درخواست کی گئی تھی کہ

> ہمارے مکاتب جلال آباد کی اصلاح کے لئے خوش قسمتی سے آپ وہیں تشریف رکھتے ہیں اس لئے وزارتِ تعلیم کو ان مکاتب کی صدارت کے لئے آپ کا نام نامی ارسال کر دیا گیا ہے. منظوری ملنے تک آپ سے درخواست کی جاتی ہے کہ قائم مقام صدر مدرس کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دیں.

اُدھر سرکاری طور پر یہ خواہش تھی، اِدھر جلال آباد کے عوام وخواص میں انہوں نے مختصر سے عرصہ میں جو مقبولیت حاصل کر لی تھی وہ بھی مثالی تھی. وہاں کے لوگ ان کے قیام سے خوش تھے. چنانچہ وہاں کے ایک نواب صاحب نے انہیں لکھا

> آپ کا اہل خانہ کے ساتھ جلال آباد تشریف لے آنا ہمارے لئے مژدۂ جاں فزا ہے. آپ سے گذارش ہے کہ آپ اور آپ کے اہل وعیال کی رہائش کے لئے مزارات کی سمت میں ہمارا قلعہ اور زمین و جائداد موجود ہے، نیز بستی خشک، بالا باغ اور عبدالجلیل ان تینوں جگہوں میں سے جس جگہ آپ چاہیں رہ سکتے ہیں. یہ تینوں جگہیں ہی قابل بود و باش ہیں. آپ یہاں رہ کر مجھے مسرور

کریں. مذکورہ زمین کے محصولات میں سے نقد جنس جو بھی کچھ ہوگا وہ آپ کا
ہے. اپنی املاک کی میرے پاس تحریر ہے وہ آپ کے پاس روانہ کردوں گا. اور
اگر کسی دوسرے مقام کو پسند کرتے ہیں تو ہماری طرف سے اس کا بھی اختیار
ہے، لیکن انشاءاللہ ہمارے یہاں آپ کو کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی. اپنے حالات
سے متعلق مجھے خط ضرور بھیجیں تا کہ غلہ اور اجناس وغیرہ کی طرف سے آپ
مطمئن ہو جائیں.

۱۴ سرطان ۱۳۰۴ھ شمسی (۵ جنوری ۱۹۲۵/ ۱۳ ذی الحجہ ۱۳۴۳)

نظر کے زاویے

انسانی فکر دریا کی مانند ہوتی ہے. منبع نہ ہو اور کسی بلندی سے اترتے ہوئے برفشار کی حمایت نہ ملے تو دریا نہیں بنتا، اور دریا جزو بحر اعظم نہ بنے تو ریگ صحرا میں غائب ہو جاتا ہے. زمین ذہن پر زندہ فکر کو بھی راہداری چاہئے. حالات کے سنگلاخ زاویۂ نظر میں تبدیلیوں کا تقاضا کرتے ہیں مگر مقصد و منزل کے عرفان کے ساتھ وقت کے فرازوں سے پہلو بچاتے ہوئے اور نشیبوں میں تموج کا تماشا دکھاتے ہوئے بہاؤ کے تسلسل کا برقرار رہنا لازم ہے. فکر عملی تسلسل باقی نہ رکھ سکے تو محض فلسفہ ہوتی ہے جو ضروری نہیں انسانی زندگی پر موثر بھی ہو.

مولانا منصور انصاری کسی انسانی فلسفہ کو عنوان انقلاب بنا کر میدان عمل میں نہیں اترے تھے. قرآنی عمرانیات اور نبوی حکمت عملی ان کا فکری پس منظر تھی جن کی بنیاد پر خلافت راشدہ کا نظام مرتب ہوا تھا. یہ نظام دنیا میں کہیں باقی نہیں تھا. مولانا محمد میاں منصور انصاری اسی نظام کا احیاء چاہتے تھے. یہ خواہش ان کے تعلیمی پس منظر سے ابھری تھی، لیکن اس کو مہمیز اس وقت لگی جب ماسکو میں بالشویک لیڈر رولادیمر لینن نے ایک ملاقات میں تبلیغ ایمان کے جواب میں ان سے الزامی طور پر کہا تھا کہ آدھی دنیا مسلمان ہے مگر مسلمانوں نے کہیں بھی وہ نظام قائم نہیں کر رکھا جس کی دعوت مولانا منصور انصاری نے اسے دی تھی.

خاندانی روایت کے مطابق مولانا حامد الانصاری غازی نے ایک مجلس میں اس ملاقات کی تفصیل اپنے والد کے حوالہ سے بیان کی تھی. کاش وہ اسے کہیں لکھ دیتے.

> مولانا منصور انصاری نے جب روسی کمیونسٹ لیڈر لینن کو اسلام کی دعوت دی اور کہا کہ جن معاشی اور معاشرتی عوارض کے خلاف بالشویک جماعت اٹھی ہے اس کا شافی علاج اسلام میں موجود ہے تو لینن نے کہا کہ آدھی دنیا مسلمان ہے مگر جس

اسلامی نظام کا ذکر آپ کر رہے ہیں وہ نظام ان مسلم ملکوں میں کہیں نظر نہیں آتا، اور ان سب ملکوں کے عوام وہ تمام معاشی اور معاشرتی مسائل بھگت رہے ہیں جن کے خلاف کمیونسٹ میدان میں آئے ہیں. آپ کسی ایک مسلم ملک میں اسلام کا وہ نظام نافذ کر کے نتائج دکھایئے. ہم اسلام قبول کریں گے.

لینن نے کہا:

ہم انقلابی ہیں. انقلابی تبدیلی لاتا ہے. تبدیلی سے ڈرتا نہیں. ہم تبدیل ہو سکتے ہیں. ہم اسلام قبول کر سکتے ہیں.

یہ تھا وہ پس منظر جس نے مولانا منصور انصاری کی سوچ کو ایک نیا زاویہ، نیا رخ دیا تھا.

وہ افغانستان کو ایک ایسی ماڈل اسلامی ریاست بنانا چاہتے تھے جو صرف اللہ کے حکم کے تابع ہو اور دنیا کی آنکھوں میں آنکھ ڈال کر اپنی بات منوانے کی طاقت رکھتی ہو.

وہ افغانستان کی مختلف وزارتوں سے منسلک رہے. امیر امان اللہ خان سے ان کی بہت قربت تھی اور وہ امان اللہ خان کی فکر کو صحیح سمت دینے میں کوشاں رہے. افغانستان کی اندرونی صورت حال اضطرابی دور سے گزر رہی تھی. ہر وقت کسی انہونی کا دھڑکا لگا ہوا تھا. ایک دن انگریزوں کی سازش رنگ لائی اور انہوں نے اسی ملک کے ایک ڈاکو بچہ سقہ کے واسطہ سے افغانستان میں امان اللہ خاں کے خلاف ایک طوفان برپا کر دیا. جس کے نتیجہ میں امان اللہ خاں کو تخت سے دستبردار ہونا پڑا اور بچہ سقہ کی حکومت قائم ہو گئی. اس حالت میں مولانا منصور انصاری کا وہ خواب ہی بکھر گیا جو وہ افغانستان کے لئے دیکھ رہے تھے اور اس کے لئے امان اللہ خان کو تیار کر رہے تھے.

بچہ سقہ انگریزوں کی حمایت کے سہارے یہاں تک پہنچا تھا. یہی کھیل انگریز مختلف مسلم ملکوں میں کھیلتے آ رہے تھے. بچہ سقہ چاہتا تھا کہ اسے کچھ تجربہ کار اور حکومت کے

ماہر افراد میسر آجائیں. اس نے مولانا منصور انصاری کو افغانستان کی پارلیمنٹ کا صدر بنانے کی تجویز رکھی لیکن مولانا انصاری نے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ وہ افغان شہری نہیں ہیں اس لئے اس ذمہ داری کے اہل نہیں ہیں. مگر وہ جانتے تھے کہ ایک تو بچہ سقہ نے حکومت پر غاصبانہ قبضہ کیا تھا دوسرے وہ انگریزوں کی حمایت اور مدد سے اقتدار پر قابض ہوا تھا. تیسرے اس کی بغاوت نے افغانستان کے اسلامی مستقبل کو معرض خطر میں ڈال دیا تھا. اس لئے اس کے ساتھ کسی بھی طرح کا تعاون انگریزوں کو امداد پہنچانے کے مترادف تھا جو مولانا منصور انصاری کو گوارا نہ تھا. ہندستان پر انگریزوں کا قبضہ بھی اسی طرح کی غاصبانہ دسیسہ کاریوں کا نتیجہ تھا اور اسی کی مخالفت میں مولانا منصور انصاری نے مشکلات برداشت کی تھیں. بچہ سقہ کے ساتھ تعاون کے نتیجہ میں ہندستان کی طرح افغانستان بھی انگریزوں کی ویسی غلامی میں چلا جاتا جس کا کامیاب تجربہ عرب ملکوں میں سلطنت عثمانیہ کے خاتمہ کے بعد یورپی طاقتیں کر چکی تھیں.

چنانچہ مولانا منصور انصاری نے بچہ سقہ کی پیشکش مسترد کر دی. بچہ سقہ نے اسے اپنی توہین سمجھ کر مولانا منصور انصاری کو قید خانہ میں ڈلوا دیا اور سرسری عدالتی کاروائی کے بعد انہیں پھانسی کا حکم سنا دیا گیا.

پھانسی کا پھندہ مولانا منصور انصاری کے سر پر ایک بار پھر جھولنے لگا. لیکن وہ تو جان ہتھیلی پر لے کر ہی گھر سے نکلے تھے. البتہ ہر سنگین موقعہ پر اللہ تعالی کی طرف سے مدد آجاتی جس کا مطلب یہ تھا کہ تقدیر الہی میں ان سے ابھی اور کچھ کام لینا باقی تھا. اس بار بھی وہ کسی تدبیر سے قید خانہ سے باہر نکل آئے. بے شک انہیں مزاحمت کا سامنا تھا مگر وہ ایسی مزاحمتوں اور دقتوں کے عادی تھے. بیڑیاں ہتھکڑیاں کاٹ کر ایک رات کے آخری پہر میں قید خانہ کو الوداع کہا اور دشوار گذار راستوں کو پا پیادہ عبور کرتے ہوئے سرحدی علاقہ میں اپنے پرانے ٹھکانے میں جا کر روپوش ہو گئے. وہاں ان کے پرانے تعلقات تھے اور اپنا

مشن جاری رکھنا آسان تھا.اس بار وہاں نواب باجوڑ سے تعلقات مزید مستحکم کر لئے اور کافی عرصہ تک اسی علاقہ میں رہے.

باجوڑ پاکستان اور افغانستان کے درمیان خاصے بڑے رقبہ پر پھیلا ہوا سرحدی علاقہ کا حصہ ہے جو یاغستان کے نام سے جانا جاتا تھا.اس کی آبادی ان قبائل پر مشتمل ہے جو اپنی جرأت وحوصلہ مندی اور غیرت وحمیت کی وجہ سے جنگجو شمار ہوتے ہیں. یہ لوگ عموماً قول و قرار کے پابند ہوتے ہیں اور ان کی دوستی پائیدار ہوتی ہے. یاغستان کو آزاد سرحدی قبائلی علاقہ بھی کہا جاتا ہے.اس خطہ کی جو سرحد افغانستان کے شہر جلال آباد کے کنارے واقع دریا سے متصل ہے وہ باجوڑ، دیر، سوات اور مہمند جیسے ذیلی علاقوں پر مشتمل ہے.

مولانا منصور انصاری اس علاقہ کے تاریخی وجغرافیائی حالات سے بخوبی واقف تھے اور ان علاقوں کے باشندوں کو افغانوں سے لڑانے کی انگریز سازش سے بھی باخبر تھے.انہوں نے ۲۴ ذی قعدہ ۱۳۴۶ (۱۵مئی ۱۹۲۸) کو اس علاقہ کی تفصیلات سے حاکم سرحدات کو مطلع کر دیا تھا یہ ایک بہت تفصیلی خط ہے جو ڈاکٹر عابداللہ غازی کی دستاویزات میں موجود ہے.مولانا منصور انصاری نے اس خط میں دیگر امور کے ساتھ انکشاف کیا تھا کہ

> برطانیہ یہ اقدام کر رہا ہے کہ سوات کے بجائے دیر، جندول اور باجوڑ کی ریاستوں کو متحد کر کے افغانستان کے مقابلے میں استعمال کرے، کیونکہ سوات کا اثر افغانستان پر براہ راست نہیں پڑتا، جبکہ ان علاقوں کا اثر اس پر براہ راست پڑتا ہے.

برطانیہ بے حد چھوٹا ملک ہے. صنعتی انقلاب نے اسے دوطرف سے باندھ دیا تھا.اس کے پاس مادی وسائل تقریبا مفقود ہیں.معدنیات میں کوئلہ ہے یا پھر عمارتی اور صنعتی معدنی مواد جس کی مقدار صرف ۱۲ فی صدی ہے اور جو صنعتی انقلاب کی دیوہیکل مشینوں کا پیٹ بھرنے کو ناکافی تھا.اس لئے برطانیہ کے علاوہ بلجیم، ہالینڈ، پرتگال جیسے دیگر چھوٹے

چھوٹے یورپی ممالک کے لئے لازم ہوا کہ وہ ان ایشیائی اور افریقی ملکوں پر قبضہ اور تسلط حاصل کریں جو معدنی اور دیگر قدرتی وسائل سے مالا مال تھے. اس مقصد کے لئے ان سب مغربی یورپی ملکوں نے اپنے بادشاہوں اور ملکاؤں کی حمایت اور استعانت سے ایسٹ انڈیا کمپنیاں قائم کر کے ایک نئے طرز کی سیاست شروع کی.

دوسری طرف ان مشینوں کی بھاری پیداوار کی کھپت کے لئے برطانیہ کے پاس انسانی آبادی بھی نہ ہونے کے برابر تھی تو ان صنعتی مصنوعات کے واسطے اسے منڈیاں بھی درکار تھیں. معدنی پیداوار اور منڈیوں پر قبضہ برقرار رکھنے کے لئے ضروری تھا کہ ان ملکوں کے عوام کو مختلف عنوانات سے منتشر اور باہم دست و گریبان رکھا جائے تا کہ آپس کی دشمنیوں اور لڑائیوں اور تباہ کن فسادات میں ملوث یہ قومیں یورپی تسلط کے خلاف جمع نہ ہوں. تاریخ اور عصری عمرانیات میں اسی کو لڑاؤ اور حکومت کرو کی پالیسی کے طور پر جانا جاتا ہے.

برصغیر میں آزاد قبائل کے شمال مغربی علاقہ اور افغانستان میں بھی برطانوی ہند اسی پالیسی پر عمل پیرا تھا. ایک باشعور مجاہد آزادی اور باریک بین سیاسی مدبر کی حیثیت سے مولانا منصور انصاری لندنی سیاست کاروں کے اس کھیل کو خوب سمجھتے تھے اور ان کے ذہن میں اس کا توڑ بھی تھا. اپنے خط میں اس موضوع پر لکھتے ہیں:

> بندہ نے اس کے مقابلے میں ایک حرکت (تحریک) اسلامی احساسات کی شکل میں (شروع) کی ہے جس کی وجہ سے امید ہے کہ شہر (باجوڑ) کا نواب افغانستان کے ساتھ (دوست) ہو جائے. نواب اور ان کے بزرگ افغانستان کی طرف مائل بھی نظر آتے ہیں. توقع یہ ہے کہ خان جندول کو بھی افغانستان کے ساتھ دوستی میں اپنی بھلائی نظر آئے گی. خاں صاحب محمود خاں ملکی چارمنگ افغانستان کے ساتھ فدا کارانہ خدمت کریں گے. خان کوٹکی مرد مسلمان اور افغانستان کا دوست ہے. اگر دولت عالیہ (افغانستان) اپنے گروہ

کی تربیت پر توجہ فرمائیں تو ملکی چارمنگ، کوٹکی، جندول، نادہ گئی کی ریاستیں اور مہمند، ماموند، سالارکرئی اور چارمنگ کی قومیں افغانستان کی خدمت کے لئے آمادہ ہوجائیں گی.

بے شک سو سال بعد اب سیاسی جغرافیائی صورت حال بہت مختلف ہے جس کے پیش نظر اس نقطۂ نظر کی تشریح بدل گئی ہے، کیونکہ انگریز اس سیاست سے خارج ہو چکا ہے. مگر جنوبی ایشیا میں شیطانی ذریات چھوڑ گیا ہے اور سفارتی ریشہ دوانیوں سے باز نہیں آیا.

مولانا محمد میاں منصور نصاری بنیادی طور پر ہندستان کی آزادی کے لئے جدو جہد کر رہے تھے. اس منصوبہ کو افغانستان کی مدد ضروری تھی. اسی وجہ سے افغانستان کی عملی سیاست پر اثر انداز ہونا ان کے لئے ناگزیر تھا. سلطنت عثمانیہ میں نوجوان ترک تنظیم اور اتاترک کی وجہ سے ترکی کے قلعے میں شگاف پڑ جانے کے بعد مسلم دنیا میں اب صرف افغانستان ہی امید کی کرن تھا. افغانستان کا مستحکم ہونا ضروری تھا اور افغانستان کے استحکام کے لئے اسلامی بنیاد پر شمالی سرحدی ہندستان کے آزاد قبائل کا اتحاد علاقائی امن اور ارتقا کی شرط تھا. مولانا منصور انصاری ان علاقوں کے مسائل پر گہری نظر رکھتے تھے اور صوبہ سرحد میں انگریز حکومت کے ساتھ تعاون کے بجائے حکومت افغانستان کے ساتھ ان قبائلی ریاستوں کی دوستی اور تعاون کے لئے کوشاں تھے.

اس خطہ سے ان کی ذہنی وابستگی کی ایک وجہ یہ تھی کہ انہوں نے اسی مقام کو تحریک آزادی ہند کا مرکز بنایا تھا. تاریخی اعتبار سے یہ علاقہ آزاد بھی تھا اور نسلی، لسانی، تہذیبی، دینی بنیادوں پر صوبہ سرحد سے وابستہ بھی تھا. اسی وجہ سے شاہ ولی اللہ کی سیاسی حکمت علمی اور سید احمد شہید کی تحریک مجاہدین سے مولانا منصور انصاری کی تحریک ریشمی رومال تک برصغیر کے تمام حریت پسند اس خطہ سے مانوس تھے. ذاتی اعتبار سے مولانا منصور انصاری کے سیاسی نظریات اور دینی معتقدات کی بنا پر اس خطہ کے عوام بھی ان سے بے حد مانوس اور بیشتر

قبائل ان کے جذبۂ صادق، للّٰہیت، محنت، لگن اور انقلابی ذہن سے متاثر تھے. اس لئے مولانا منصور انصاری نے اس علاقہ سے کبھی ناطہ نہیں توڑا. علاقہ کے سربرآوردہ رہنما، بشمول نواب باجوڑ غلام محمد میاں، ان سے متاثر اور ان کے معتقد تھے اور ان سے باہم روابط برادرانہ و دوستانہ رکھتے تھے. بچہ سقہ حکومت میں جب مولانا منصور انصاری کو مشکلات کا سامنا ہوا تو وہ پناہ کے لئے قدرتی طور پر اسی علاقہ کی طرف متوجہ ہوئے.

اس علاقہ میں سب سے بڑا مسئلہ وہاں کے باہم دست و گریباں قبائل میں اتحاد قائم کرنا تھا. اس انتشار کا سبب جہاں برطانوی ریشہ دوانیاں تھیں وہاں عام لوگوں میں تعلیم کی کمی کو بھی بڑا دخل تھا. قبائل میں اس بے علمی سے انگریز فائدہ اٹھا رہے تھے. اس آزاد قبائلی علاقہ میں انگریز حکومت نے نہ تعلیم کا انتظام کیا تھا اور نہ اقتصادی ترقی اور اس کے لئے ضروری زمینی وسائل کی فراہمی پر ادنی درجہ میں بھی توجہ دی تھی. تو یہ ایک سنگین مسئلہ تھا. اس کے حل کے لئے مولانا منصور انصاری نے افغانستان کی وزارت تعلیم سے وابستگی کے زمانہ میں اس علاقہ میں تعلیم کے مراکز قائم کر دئے تھے تا کہ بے علمی دور ہو سکے اور اتحاد اور ترقی کی راہیں ہموار ہو سکیں.

دوسری طرف انگریز اس علاقہ میں مسلسل شکست و ریخت اور معاشرتی انتشار کے لئے کوشاں تھے اور اپنے ایجنٹوں کے ذریعہ ان قبائل کو ایک ایسی جنگ میں مبتلا رکھنا چاہتے تھے جس کی دلدل سے یہ قبیلے نکلنے نہ پائیں اور انگریزوں کی حمایت کے طلب گار اور ان کے محکوم رہیں. مولانا منصور انصاری پر یہ باتیں پوری طرح عیاں تھیں اور وہ اپنے خیر خواہ سرحدی پٹھانوں کو انگریزوں کی اس سازشوں سے باخبر رکھتے تھے. یہ مخلصین بھی مولانا انصاری کو نئے مسائل کی تفصیل سے آگاہ کرتے رہتے تھے.

ایسے ہی ایک مخلص اور مولانا انصاری کے معتقد امیر الدین تھے. جب سرحدی قبائل میں شورش پیدا ہوئی تو امیر الدین نے مولانا انصاری کو ایک خط ۱۴ شوال ۱۳۴۶ (۵

اپریل ۱۹۲۸) کولکھا تھا. اس خط میں باجوڑ کے باشندوں کی مشکلات، ان کے داخلی انتشار، قبائل اور خانات کی باہمی لڑائیوں کی وجہ سے پیدا شدہ کمزوریوں سے واقف کرایا گیا تھا:

> ملا صاحب (شور بازار) حج کو چلے گئے ہیں اور ہم باجوڑ میں ہیں. نواب دیر نے سوات پر لشکر کشی کر دی. اوفزی اور خان جندول بھی ان کے ہمراہ ہیں. باقی جندول میں ہیں. مہمند میں انگریزوں کا غلغلہ ہے. حاجی صاحب (ترنگ زئی) حالات کا مقابلہ نہیں کر پا رہے ہیں. وہ کہتے ہیں کہ انگریز آہستہ آہستہ سب برباد کر دیں گے. (حاجی ترنگ زئی کے جانشین اور بیٹے) میاں گل اور کوہستانی باشندوں میں جنگ جاری ہے. ابھی باجوڑ میں سکون ہے کوئی فتنہ و فساد نہیں ہے. دو تین روز قبل برطانوی جہاز مہمند میں آ گئے تھے لیکن پھر رک گئے. ہم آپ کے حکم کے مطابق تعلیم کے کام میں سرگرم ہیں.

اس خط کا انداز بتا رہا ہے کہ یہ اس زمانہ میں لکھا گیا تھا جب مولانا منصور انصاری افغان وزارت تعلیم سے وابستہ تھے اور باجوڑ، دیر، سوات مہمند وغیرہ قبائلی علاقوں سے رابطہ میں تھے اور ان کے مسائل پر خاموشی سے کام کر رہے تھے. اس زمانے کے مولانا انصاری کے اور دوسرے معتقدین ووابستگان تحریک کے خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ باجوڑ کے نواب غلام محمد میاں بھی مسلسل ان کے رابطہ میں تھے.

نواب غلام محمد میاں نے مولانا انصاری کو تازہ ترین حالات سے آگاہ کرنے کے لئے ۱۲ ذی قعدہ ۱۳۴۶ (۲ مئی ۱۹۲۸) کو جو خط تحریر کیا اس میں اسلامی اقوام اور قبائل میں انقلاب کی خواہش کے اظہار کے ساتھ اس امر پر تشویش کا اظہار کیا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اعلیٰ حضرت غازی (شاہ افغانستان) کی غیر حاضری میں قبائل مہمند و مصافی اور دیر، باجوڑ جندول وغیرہ کے بیچ جنگ شروع ہو جائے.

اس کے ساتھ نواب باجوڑ غلام محمد میاں نے ان تحریکات کا بھی ذکر کیا تھا جو خود

ان کے خلاف باجوڑ میں چلائی جارہی تھی اور جن کا مقصد یہ تھا کہ کسی طرح سے باجوڑ کو مدافعتی جنگ میں دھکیل دیا جائے اس کو ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں

لیکن خدائے برتر کا شکر ہے کہ ہم نے محض رضائے الٰہی کی خاطر ملی مفاد کو ذاتی مفاد پر فوقیت دی ہے اور آج تک لڑائی سے بچے ہوئے ہیں، کیونکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہماری جنگ سے دولتِ افغانستان کو صدمہ پہنچے.

بہر حال یہ بات طے تھی کہ افغانستان کی حکومت مضبوط ہاتھوں میں ہو اور فکری اعتبار سے پختہ اسلامی عقائد والوں کے پاس رہے تو انگریز لاکھ کوششوں کے باوجود اپنے عزائم میں کامیاب نہیں ہوسکیں گے. اسی لئے انگریزوں نے اپنی ترجیحات میں بدلتے ہوئے افغانستان میں شورش پھیلانے کو مقدم کیا جس کے نتیجہ میں بچہ سقہ کے ذریعہ افغانستان میں امان اللہ خان کی حکومت کا سقوط عمل میں آیا اور ان کے رفقائے کار کو مزاحمتوں کا سامنا کرنا پڑا جن میں مولانا منصور انصاری بھی شامل تھے.

قبائل آزاد کی وحدت

مولانا منصور انصاری باجوڑ پہنچے تو محسوس کیا کہ وہاں علماء اور امراء کے مابین دوری تھی اور انگریز اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہے تھے. لہٰذا مولانا منصور انصاری نے علاقہ کے روحانی پیشوا حاجی فضل وحید ترنگ زئی کے نام ۲۲ محرم ۱۳۴۸/ ۳۰ جون ۱۹۲۹ کے خط میں آزاد قبائل کے باہمی اتحاد کو امت مسلمہ اور افغانستان کے لئے لازمی قرار دیا.

حاجی ترنگ زئی کے نام خط

عارف باللہ قدوۂ اہل اللہ حضرت حاجی صاحب عم فیوضھم و مدظلھم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ. بہت زمانہ گزر گیا کہ آوارہ آزاد سرحد کی سرزمین پر فرنگیوں کی قوم اور یہاں پر ان کی سیاست کے مطالعہ میں مشغول ہے، خاص طور سے دولت عالیہ (حکومت امان اللہ خان) کے اختلال وسقوط کے بعد باجوڑ کی اقوام کے اتحاد کو لازمی تصور کر رہا ہوں کیوں کہ وحدت عمومی کے بغیر فرنگیوں کا جواب دینا خلاف عقل وقیاس ہے.

جناب عالی کو معلوم ہے کہ عوام کا اختلاف خواص کے اختلاف کا آئینہ دار ہوتا ہے اور اس وطن میں خواص صرف دو طرح کے ہیں (یعنی علمائے کرام ودانشوران عظام). چونکہ ان دونوں گروہوں کے بیچ کی مخاصمت بدقسمتی سے عرصۂ دراز سے جاری رہ کر اس وطن کے عوام کو دو حصوں میں تقسیم کر چکی ہے اس لئے ان کا علاج خواص کے گروہ (مشائخ وخوانین وطن) کے اتحاد کے بغیر ممکن نہیں ہے. ان کے اتحاد کی اطلاع تجاوز کار کو عالی جاہ نواب صاحب (باجوڑ غلام محمد میاں) کی خدمت میں بھیجا گیا. اس آوارہ ناکام کے لئے یہ بات

باعث خوشی ہوئی کہ عالی جاہ نواب (غلام محمد میاں) صاحب کی مدافعت کی فکر میں عوام و خواص متحد ہیں اوران کی مدافعت افغان اور علاقہ آزاد کے عوام کے اتحاد کے بغیر ممکن نہیں. لہٰذالازم ہے کہ پہلے اپنی وحدت کی صورت اور عالی جاہ نواب کے اتحاد کی صورت معین ہواس کے بعداللہ تعالیٰ شانہ سے امیدرکھتا ہوں کہ باقی اقوام اورخوانین اس دیار کی ثابت قدمی کے لئے متحدہ کوشش سے ایک وجود ہو جائیں گے اور مدافعت کے لئے ہاتھ میں صحیح طاقت لائیں گے.اس دیار کی کمزوری جو کہ افغانستان کی کمزوری سے پیدا ہوئی ہے ان کو بھی عوام کے اتحاد کی ضرورت ہے.

اس وقت اگرانگریز اسلامی علاقوں پر قبضہ نہ بھی کرے تو بھی ان کی خفیہ سازشوں سے بچنااور بغیر اتحاد قومی کے حفاظت کرنا ممکن نہیں ہے. وطن کے حالات جو کہ زمانہ کے انقلاب سے تبدیل ہو گئے ہیں وہ آپ کے نزدیک پوشیدہ نہیں اس وحشت ناک انقلاب (بچہ سقہ کے تسلط) کے اثرات سے بچنے کے لئے ضروری ہے کہ اپنی صفوں میں اتحاد پیدا کیا جائے کیونکہ اس کے بغیر مقصد حاصل نہیں ہوگا. **وما التوفیق الا باللہ العلی العظیم**

موقع کو غنیمت شمار کر کے اپنی کوششیں خدمت اقدس میں پیش کر رہا ہوں اور مخلصانہ دعا کرتا ہوں کہ جناب عالی کا اتحاد نواب صاحب باجوڑ سے اتحاد عمومی ہو کر عام مسلمانوں کے مصائب اور پریشانیاں دور ہوں.آمین ثم آمین

مبارک اتحاد ہو جائے تو اسلامی ممالک کو یہ تفکرات سے نجات عطا فرمانے کا سبب ہوگا.انشااللہ تعالیٰ.

منصور

شہر باجوڑ سے

۲۲محرم ۱۳۴۸/ ۳۰رجون ۱۹۲۹

باب/آفاق شمال

اصلاحی انقلاب کی مہم

دنیادارانہ سیاست سازشوں اور ہتھکنڈوں، فریب اور دغا، منافقت اور خودغرضی کا دوسرا نام ہے. روز روز کی سازشوں نے مولانا منصور انصاری کو سرکاری کاموں سے یکسو کر دیا تھا. انہیں اب ایک ہی دھن تھی کہ ایک اصلاحی انقلاب کی غرض سے امت مسلمہ کی ذہن سازی اور تربیت کی جائے جس سے ان کے اندر ایک اصلاحی انقلاب برپا ہو جائے. وہ جانتے تھے کہ پوری امت اسلامیہ کو قرآن سے قریب کئے بغیر یہ کام نہیں ہوسکتا.

مولانا منصور انصاری حکومت الٰہی کے قیام کی خاطر ہی افغانستان اور خطہ آزاد کی عملی سیاست میں داخل ہوئے تھے. لیکن مقامی سیاست کے بدلتے تیوروں اور اقتدار یا مال (پول) کے خواہشمندوں کی عیاریوں و مکاریوں کے اسباب و نتائج سے انہیں ایک گونہ مایوسی ہو رہی تھی. ایک جانب عالم اسلام کا دشمن طاقت ور تھا، دوسری طرف خود مسلمانوں میں اس کھلے دشمن کا آلۂ کار بن جانے والوں کی کمی نہیں تھی. ہنگامی سیاست، وقتی تقاضے، انفرادی اور گروہی مفادات کو ہمہ گیر ملی مقاصد پر ترجیح حاصل تھی. نتیجہ ظاہر تھا.

امیر حبیب اللہ خاں کے بعد مولانا منصور انصاری کو افغانستان میں اپنے مشن کی کامیابی کی جو توقعات پیدا ہوئی تھیں وہ حالات زمانہ کی نذر ہو گئیں. پہلی عالمی جنگ کے بعد یورپی توازن میں تبدیلی، سقوط خلافت عثمانیہ اور مسلمانوں کی عام پست ہمتی نے ان افکار پر عمل کے راستے بند کر دئے تھے. امان اللہ خان کے برسر اقتدار آنے سے مایوسی کے بادل چھٹنے شروع ہوئے تھے اور حالات قدرے سازگاری کی طرف مائل ہوئے تو بچہ سقہ نے پھر بازی پلٹ دی. ان حالات نے مولانا منصور انصاری کو خطۂ آزاد کی چھوٹی قبائلی ریاستوں کی

طرف متوجہ کیا تھا. وہاں افراد تو تھے، حالات سازگار نہیں تھے.

مولانا منصور انصاری ان علاقوں میں اتحاد امت کی کوشش کرتے رہے. اس مقصد کے لئے ایک تنظیم ''الاصلاح سرحد آزاد'' بھی قائم کی تھی جس کا دستور اساسی قرآن و حدیث کی روشنی میں ترتیب دیا گیا تھا. اس تنظیم کا مقصد آزاد وطن کی علمی اجتماعی ترقی اور عوامی خدمت تھا. انہوں نے اس تنظیم میں اپنے لئے کوئی منصب نہ رکھا. اس کے عہدیدار قبائل کے منتخب علماء، مجاہدین، حساس دل، صاحب قوت و ذکاوت اور انتظامی صلاحیتیوں کے حامل افراد تھے. اس کی عاملہ و مجلس عام میں قبائل کے علماء، مشائخ، جدید تعلیم یافتہ لوگوں کو منتخب کیا گیا تھا.

اس طریقہ پر باجوڑ، مہمند، دیر، صوات، کوٹکی، ملکی، چارملنگ، ناوہ گئی وغیرہ جیسی چھوٹی ریاستوں کے وفاق سے مولانا منصور انصاری ایک متحدہ محاذ کی تشکیل کے لئے کوشاں تھے، لیکن مزاحمت بھی کم نہیں تھی.

مولانا منصور انصاری کو ان حالات سے قدرتاً بے انتہا تکلیف بھی تھی اور مایوسی بھی. انہوں نے حاجی صاحب ترنگزئی کے بڑے صاحبزادے اور تحریک حریت و اصلاح و تعلیم میں ان کے جانشین اور خود اپنے ایک مخلص رفیق بادشاہ گل خاں کو ان حالات میں جو خط لکھا اس سے ان کی قلبی اذیت کا احساس ہوتا ہے:

ابن حاجی ترنگ زئی کے نام خط

''میرے عزیز! افغانستان میں (سقاوی) انقلاب کے ابر کو محیط دیکھ کر اس جگہ سے میں نے کنارہ کشی اختیار کی. اس وطن کی سیاسی تبدیلیوں سے امید رکھتا ہوں کہ افغانستان میں تبدیلی آئے گی تو بندہ اپنی پوری قوت کے ساتھ تحفظ اسلام کی خدمت اپنے کندھے پر لے گا لیکن اسے خلاف توقع سمجھ رہا ہوں کیونکہ اس وطن کے خواص کا باہمی

اختلاف اس حد تک پہنچ چکا ہے کہ اس کی امید تقریباً ناممکن ہے. وطن کی حالت یہ ہے کہ لامرکزی اقوام خود اجتماعی کی قابلیت قطعاً نہیں رکھتی ہیں. یہ لوگ ایک دوسرے کو برباد کرنے کے لئے خوب دوستی رکھتے ہیں. اس میں انہیں ید طولیٰ حاصل ہے، حالانکہ اس کو حاصل کرنے کی ضرورت نہیں تھی اور اجتماعیات میں بھی ان کے تمام امور ترقی کے محتاج ہیں.

آں عزیز، میں پوری کوششوں کے باوجود مرکز میں قوت پیدا نہیں کر پایا. اور ان کوششوں کا حاصل صرف یہ ہے کہ چند دوست اپنے کام کے خدمت کرنے والے ہاتھ آئے ہیں. ان کی قوت اور کوشش بیکار نہیں جا سکتی کہ وطن میں اتحاد جو کہ ہمارا قومی فریضہ ہے اسی سے پیدا ہوگا. اللہ وطن کے امین ہیں.

بظاہر وطن اہل علم کے باہمی اختلافات اور ان کی آپسی دشمنی کی وجہ سے غیروں کے قبضہ میں جا رہا ہے. بعض لوگ حد سے بھی تجاوز کر گئے، بعض لوگ ٹانگ اڑا کر خدمات اجتماعی کی قابلیت کو کھو رہے ہیں. اگر کسی کے اندر کسی حد تک کوئی صحیح جذبہ ہے تو وہ اپنے دوستوں کے طعن وتشنیع سے عذاب میں مبتلا ہو جاتا ہے.

الغرض مجموعۂ وطن ایک مٹھی بالو ریت کے مانند ہے کہ باہمی نظام کی پختگی کی صلاحیت نہ رکھنے کی وجہ سے طاقتور دشمن کے سر پر ضرب مارنے کی قابلیت ہرگز نہیں رکھتا ہے.

نواب باجوڑ کی مساعی

مولانا منصور انصاری باجوڑ آئے تو نواب غلام محمد میاں نے عقیدت اور ان کی حفاظت کے پیش نظر انہیں باجوڑ سے جانے نہیں دیا اور اتحاد قبائل کے ان کے مشن کی ذمہ داری خود لے لی. اس کا ثبوت وہ خطوط ہیں جو انہوں نے مختلف علاقوں سے مولانا منصور انصاری کو ان کی خیریت طلبی اور مشن کو جاری رکھنے، نیز تحریک کی کامیابیوں کے سلسلہ میں لکھے تھے.

نواب باجوڑ غلام محمد میاں کا پہلا خط ۱۵ رجب ۱۳۴۸ (۱۷ دسمبر ۱۹۲۹) کا تحریر کردہ ہے جس میں لکھتے ہیں:

> آپ کی ہدایت کے مطابق میں باجوڑ لوٹنا چاہ رہا تھا. رات میں کوٹ تک پہنچ بھی گیا تھا لیکن زبردست بارش اور برفباری کی وجہ سے اپنا ارادہ ملتوی کر کے رات باند میں گزاری اور پھر واپس کوٹ پہونچ گیا. کیونکہ سفر بے انتہا دشوار گذار ہو گیا ہے اس لئے فی الحال نہیں آپا رہا ہوں. آپ مجھ سے خط و کتابت کے لئے پشاور کے پتہ پر خطوط تحریر کریں.

دوسرا خط ۲۰ رجب ۱۳۴۸ (۲۲ دسمبر ۱۹۲۹) کو سید و شریف سے تحریر کیا تھا:

> ۱۹ رجب کو بندہ بخیریت سید و شریف پہنچا. یہاں سے تین چار دن میں میں اپنے کو فارغ کر لوں گا اور بدھ (۲۳ رجب) کو بالاکنڈ پہنچ کر آٹھ دن میں کام سے مکمل فارغ ہو جاؤں گا. اغیار کا حال حسب سابق ہے. مقصد اصلی کے بارے میں سید و شریف میں کچھ بھی گفتگو نہیں ہو سکی تھوڑا بہت اس کا اظہار ہوا ہے. تکلفات بہت ہیں. پشاور سے احوال ارسال خدمت کر دئے

جائیں گے.

تیسرا خط نواب غلام محمد میاں نے ۲۶ رجب ۱۳۴۸ (۲۸ دسمبر ۱۹۲۹) کو تحریر کیا:

آپ کا ۱۸ رجب کا تحریر کردہ خط ملا آپ میری طرف سے مطمئن رہیں. اس جگہ سے بالا کنڈ اور سیدو اور نوشہرہ وغیرہ سے آپ کی خدمت میں خطوط بھیجے گئے تھے آپ کے خط سے معلوم ہوا کہ صرف کاغذات ہی آپ کو مل پائے. یہاں کا کام ختم ہونے کے قریب ہے. عنقریب روانہ ہو جاؤں گا. آپ کے سسر صاحب (بی بی جان، سیدہ زہرہ بیگم کے والد) کی وفات کا علم ہو کر دکھ ہوا. میری طرف سے تعزیت قبول فرمائیں. اللہ انہیں جوار رحمت میں جگہ اور آپ سب کو صبر جمیل عطا کرے. آمین

ان خطوں سے معلوم ہوتا ہے کہ پٹھانوں کا اتحاد اور افغانستان کا استحکام بھی مولانا منصور انصاری کی تحریک آزادی کا حصہ تھا. اس معاملہ میں مصلحتاً وہ اپنے رفقاء سے کام لے رہے تھے جن میں نواب باجوڑ غلام محمد میاں کے علاوہ ایک محمد گل کا بھی پتا ہے جو اس وقت مہمند میں تھے ان کے خط سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس مشن میں شاید حاجی خاں کو بھی شامل کر لیا کیونکہ انہوں نے ۱۸ رجب ۱۳۴۸ھ (۲۰ دسمبر ۱۹۲۹) کو مہمند سے مولانا منصور انصاری کو جو خط لکھا اس میں انہیں مطلع کیا:

آپ میری طرف سے مطمئن رہیں. خیریت سے ہوں اور دین و مذہب اسلام کی خدمت میں مصروف ہوں. شاہ جی خاں کابل سے آ گئے. ان سے املاک کے بارے میں میں نے تاکید کر دی ہے. وثایق و دستاویز ریاست کی تنظیم و ترتیب میں گرفتار ہوں. انہیں بھی اپنے کاموں کے لئے میری مدد کی ضرورت ہو گی جس کے لئے میں تیار ہوں.

محمد گل. مہمند

مولانا منصور انصاری کے معتمد حضرات کی تحریریں اس امر کی نشاندہی کرتی ہیں کہ باجوڑ میں قیام کے دوران انہوں نے بچہ سقہ کے خلاف مقامی عوامی جذبات کو منظم کیا اور اس کے خلاف جنرل نادر خان کی مہم کو تقویت پہنچائی یہاں تک کہ بچہ سقہ کی حکومت کے خاتمہ کے بعد ریاست افغانستان نادر شاہ کے قبضہ میں آ گئی.

اس کے کچھ عرصہ بعد ہی مولانا منصور انصاری نے ریاست باجوڑ اور افغانستان کے وفادارانہ روابط کے ذکر کے ساتھ ان معاہدات کی تجدید پر توجہ دلائی جو باجوڑ کے نواب غلام محمد میاں کے ساتھ نادر شاہ نے کئے تھے اور انقلاب کے باعث جن کی تکمیل نہیں ہو سکی تھی. اب چونکہ حالات پر امن ہو گئے تھے اس لئے ضروری تھا کہ ان معاہدوں کی تجدید کی جائے. اس معاملہ میں مولانا منصور انصاری نے خود افغانستان کے نئے بادشاہ نادر شاہ کو ایک خط لکھا تھا:

شاہ افغانستان نادر شاہ کے نام خط

بحضور امیر المومنین امیر گاہ ملت دام اقبالہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ.

باجوڑ کی آزاد افغان اسلامی ریاست نے میری عاجزانہ خدمات کے ذیل میں امن وامان کے دور میں دولت علیہ (افغانستان) سے تعلقات کی بنیاد رکھی تھی. چنانچہ دولت علیہ نے داخلی آزادی اور خارجی متابعت کے اصول پر ریاست کو اپنے ساتھ مربوط کرنا فرما کر ایک عہد نامہ ترتیب دے کر اور ریاست کے وکیل (نواب غلام محمد میاں) کے دستخط سے پہچان کر سرحدی ریاست کے دفتر پر پہنچا کر محفوظ کرا دیا تھا.

دولت علیہ کی طرف سے موصوفہ ریاست کے وکیل کے لئے یہ عہد نامہ دیا گیا تھا کہ عالی جناب محترم نواب صاحب آزاد افغانی ریاست کے دستخط سے پہچان کر عام سرحدی

ریاست محترم کے دفتر میں پہنچا دے اور وظیفہ کا ایک حصہ بھی جملہ ۸۰ ہزار میں سے مرحمت فرمایا تھا. آزاد افغانی ریاست کے وکیل نے وظیفہ کو ہنڈی کیا تھا اور اس طرح عالی جناب محترم نواب صاحب کے ہاتھ میں پہنچا. چنانچہ اس کی رسید نواب صاحب کے دستخط سے صدارت عظمیٰ کی مخصوص ڈاک کے ذریعہ عام سرحدوں کی ریاست تک بھیج دی گئی.

لیکن خانہ خراب انقلاب (بچہ سقہ) اور راستوں کی بدامنی کی وجہ سے یہ ممکن نہ ہوسکا کہ عہد نامہ کو جو کہ دولت علیہ نے محترم نواب صاحب عالی قدر کے دستخط کے لئے ان کے سپرد کیا گیا تھا ان تک پہنچا دے.

اب آزاد باجوڑ کے نواب صاحب اسی عہد نامہ پر جو مفہوم کے اعتبار سے (دراصل) ان کے لئے کیا گیا تھا قائم ہیں اور اپنی ریاست کو دولت علیہ سے مربوط سمجھتے ہوئے یہ یقین رکھتے ہیں کہ نادری عہد نامہ میں بھی دولت علیہ کی سیاست میں آزاد افغانی ریاست کے متعلق کوئی تغیر پیدا نہیں ہوگا. یہی وجہ ہے کہ مذکورہ عہد نامہ پر دستخط کے لئے بھی وہ ہمہ وقت حاضر ہیں.

یہ عرض کنندہ بحیثیت آزاد افغانی ریاست کے وکیل کے اس واقعہ کو حضور مبارک میں پیش کر کے شرف حاصل کر رہا ہے تاکہ آپ کے مبارک دور میں حضور سے بھی مذکورہ اتحاد و روابط کی تصدیق کو حاصل اور دولت علیہ کی منظّم اثر والی ترقی کی بنیاد کو دیکھ کر اپنے زمانے کا مبارک و مسعود شخص ہونے کا شرف حاصل ہو سکے.

دونوں جہاں کے اقبال و کامرانی کا آفتاب تاباں و درخشاں رہے.

۲۸ ثور ۱۳۰۹ شمسی (۱۸ مئی ۱۹۳۰/ ۱۷ ذی الحجہ ۱۳۴۸)

باب/آفاق شمال

باجوڑ کی غیرت مندی

ریاست باجوڑ کی ترقی اور مملکت افغانستان کے ساتھ اس کے ارتباط پر مولانا منصور انصاری نے صدر اعظم کی خدمت میں ایک تحریری عرض داشت پیش کی تھی. اگر چہ اس پر کوئی تاریخ درج نہیں ہے لیکن قرین قیاس ہے کہ یہ ۱۹۳۰ کے کسی مہینہ کی ہے کیونکہ اس میں انہوں نے بچہ سقہ کی حکومت کے خلاف ریاست باجوڑ کے وفادارانہ کارناموں کا ذکر کیا ہے.

صدر اعظم کے نام تحریر

شہر کی ریاست کیا کر سکی؟

۱- باجوڑ کی آزاد ریاست نے ابھی دولت علیہ سے مربوطیت کے میدان میں ایک ناتمام قدم رکھا بھی نہ تھا کہ دولت علیہ ایک فلاکت خیز انقلاب میں گرفتار ہوگئی اور سقاوی محروسات میں گنی جانے لگی. غیور ریاست مذکورہ اصول کے ساتھ بے شرف والے سقاوی تحریکیوں کے باوجود سقاوی کے ساتھ ارتباط کو قبول کرنے والی نہ ہونے کے باعث شکریہ کی مستحق اور اعتماد کے قابل ہے.

۲- افغانستان چونکہ سقاوی کے قبضہ وتصرف میں ہونے کی وجہ سے بے سمتی کا شکار تھا اس حالت نے وطن کے غیرت مندوں کو حیران کر دیا تھا. اس طرح باجوڑ و ریاست دیر کے طاقتور ہجوم کا شکار بن کر وہاں کے غیور لوگوں کو سراسیمہ کر دیا تھا لیکن افغانستان کے مصلحین نے ہمت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا. ان کی متوکلانہ بے سروسامانی نے بے عزتی کے ہولناک ساز وسامان کو شکست خوردہ کر دیا. باجوڑ کے مصلح بھی ان کی غیرتمندانہ تقلید کی

برکت سے دیر کے زبردست اسباب کو تارومار کر کے کامیاب ہوئے. الحمدللہ.

۳- اگر چہ قاعدہ کے مطابق ضروری تھا کہ اپنے تعلق کو عام مرکزیت اور خاص طاقت پیدا کر لینے سے پہلے پوشیدہ رکھا جاتا لیکن افواہوں کے مسئلہ کی نزاکت نے ایک معمولی حرکت پر بے قابو ہو کر لوٹگرام اور باجوڑ کی قوموں کو مجبور کرنا چاہا کہ ریاست شہر کی کوشش سے ترکلانی اقوام سے جدا رہ جانے کی وجہ سے خود کو بے دست و پا اور ریاست اور حکومت کی قوتوں کے درمیان محصور دیکھ کر جلد ہتھیار ڈال دیں. اگر اللہ نے چاہا تو یہ خفیف حرکت تعلقات میں مضر نہ ہوگی اور علاقہ باجوڑ کے لالچی اور جاہل افراد کے باوجود دشمنوں کی یہ سازش کامیاب نہیں ہوئی. اسی بناء پر کہا جا سکتا ہے کہ یہ علاقہ فتنہ پردازوں کے جال میں نہیں پھنسے گا.

۴- شہر کی ریاست نے کوئی حرکت اس زمانہ میں جبکہ افغانستان کے مصلحین کو مہمند کی امداد کی ضرورت تھی نہ کی جس سے مہمندی طاقتیں مصلحین کرام کی امداد سے رکی رہیں بلکہ انہوں نے محض افغانستان کی نزاکتوں کی رعایت کرتے ہوئے اپنی اکثر ضروری کارروائیوں کو اس وقت تک تاخیر میں ڈال رکھا ہے. اگر چہ دولت علیہ کی طرف کے بعض لوگ آزاد اسلامی ریاست کی خدمات کو جو افغانستان کی تاریخ میں کوئی وجود نہیں رکھتیں اہمیت نہ دے کر خدام کی ہمت افزائی اور ان کی خدمت کے جذبات کی حفاظت سے سرد مہری کا اظہار کرتے ہیں، مگر فکر کے بلند مرکز سے میں توقع رکھتا ہوں کہ ہمارے بہادر نوجوانوں کے آغاز کو انتہائی اہمیت دے کر اپنے مآل کو حد سے زیادہ بہتر بنائیں گے.

۵- ریاست آزاد نے رمضان المبارک سے پہلے اپنے مرکز میں ابتدائی مدرسہ کا افتتاح کیا ہے اور وہاں کے رہنے والوں کے لڑکوں، بھتیجوں اور اولاد کے (۴۰ بچوں) کو اس میں داخل کر کے وطن کی تابناکی کی بنیاد قائم کر دی ہے.

آوارہ ہند منصور انصاری

باب/آفاق شمال

نادر شاہ کو مشورے

بچہ سقہ حبیب اللہ کلکانی کا تسلط افغانستان پر ۱۷جنوری سے ۱۳اکتوبر ۱۹۲۹ تک رہا.جنرل نادر خان کی کمان میں افغان فوج نے اسے شکست دی جس نے بعد میں انہی کو ملک کی زمام اختیار سونپ دی تو حالات میں بہتری آئی.مولانا منصور انصاری احباب کے اصرار پر باجوڑ سے کابل آ گئے تھے.ظاہری طور پر آلام و آزمائش کے وہ دن بھی دور ہو گئے تھے جن میں موت آنکھوں کے سامنے تھی. پھانسی کا پھندہ کھل کر گر چکا تھا.

جنرل محمد نادر خان درانی نے نادر شاہ کے لقب سے زمام اقتدار سنبھالی اور ملک میں امن و امان بحال ہو گیا..بحران کے زمانہ میں مولانا منصور انصاری کا نقطہ نظر ان کے سامنے تھا.مگر مولانا انصاری نے کوئی صلہ نہیں مانگا.انہوں نے اپنی ذات کے لئے کبھی کچھ نہیں کیا تھا.انہوں نے ریاست باجوڑ کی فلاح و ترقی کے لئے ضرور کوششیں کیں لیکن شاہ افغانستان سے بے انتہا قربت کے باوجود ان کا کوئی خط یا تحریر ایسی نہیں ملتی جس میں انہوں نے خاص اپنے لئے کوئی اعانت طلب کی ہو.وہ درویش صفت،قلندر مزاج،فقیرانہ زندگی کرنے والے دنیاداری سے مستغنی تھے.انگریزوں نے انہیں اپنے جاہ و اقتدار اور مال و دولت کے لالچ دیئے لیکن وہ ان کے جال میں نہیں پھنسے بلکہ گاہے بہ گاہے ان سازشوں کو بے نقاب بھی کرتے رہے.

.مولانا منصور انصاری نے نادر شاہ کے برسر اقتدار آنے کے بعد جو خط تحریر کیا تھا اس میں ان سازشوں کو بے نقاب کیا گیا.اس معاملہ میں صدر اعظم (وزیر اعظم) کے نام ان کی تحریر بھی تاریخی اہمیت رکھتی ہے.

صدراعظم افغانستان کے نام تحریر

خاطر عاطر مبارک ہمایونی پر یہ بات ظاہر ہے کہ انگریز ایک زمانہ سے ہماری آزادی کو سلب کر کے ہمارے وطن مقدس کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے قبضہ میں کرتے چلے جارہے ہیں اوراس زمانے میں ہمارے علاقے کو قبضہ میں لینے کے لئے انہوں نے بعض جاہ طلب، لالچی لوگوں کواپنا آلہ کار بنالیا ہے. چنانچہ سب سے پہلے یوسف زئی بیر وغیرہ کے سرسبز و شاداب علاقے کو میاں گل صاحب کے ذریعہ قبضہ میں کیا اس کے بعد خان شاہجہاں کواپنے راستہ پر لاکرنواب دیر بنادیا اوراس کے ذریعہ سے ملنیری کا زرخیز علاقہ ہضم کرلیا.اس دوران ذیل کی کوششوں کے ذریعہ انگریزوں نے چاہا (کہ باجوڑ مہمند کے) مقدس آزاد وطن کو حاصل کرنے کے لئے میں ان کے ناپاک ہاتھوں کا آلہ بن جاؤں.اس کے لئے اس نے مجھے طرح طرح کے لالچ دئے مثلاً

۱- نقد وظیفہ ناوہ گئی (بنیر کی ایک بستی) چونکہ چندسال سے انگریزی خزانہ میں بہت بڑی رقم جمع ہوگئی ہے.وہ ہم کو دے دیا جائے گا.

۲- ناوہ گئی پر حملہ کرنے کے لئے بندوق، جبہ خانہ، مشین بم اور تمام جنگ کے مصارف نیز از قسم راشن اور لشکر کی تنخواہ اور قوموں کے وظائف.

۳- ناوہ گئی پر قبضہ کے بعد نوابی کا خطاب اور وظیفہ برابر دیئے جائیں گے.

۴- قوت کے استحکام کے لئے لازمی امدادیں اور مہمند اور باجوڑ کے آزاد اقوام کو کام میں لانے کے لئے اسی طرح جیسے دیا جاتا رہا ہے، دیا جاتا رہے گا.

لیکن چونکہ میں نے ان کی راہ پر قدم نہ رکھا اور اپنے فائدے کے حصول کے لئے ان کے ساتھ میں نے معاملہ نہ کیا تو چندسال کے تجربہ کے بعد ہم سے مایوس ہوکر باجوڑ اور مہمند وغیرہ کا علاقہ حاصل کرنے کے لئے بھی نواب دیر کوانتخاب کیا.میں نے بھی اپنے وطن

کی حفاظت کی فکر میں پڑ کر دیر کی نوابی کے اس شوق سے جو جندول کے خاں محمد عالم زیب خاں اپنے دل میں رکھتے تھے اور اس دشمنی سے جو میاں گل صاحب والی صوات، دیر کے ساتھ رکھتے ہیں فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک قوت کو دیر کا مقابل بنادیا جس کی حلیف باجوڑ کی ریاست اور جندول اور سوات کی قوتیں اور باجوڑ کی آزاد اقوام (قبائل) تھیں.

میں نے اپنے ان حلیفوں کے اتحاد سے مغرور ہو کر دیر کی کامیابی کو ناممکن گمان کر کے یہ نہیں دیکھا کہ افغانی دولت علیہ کو اپنی داخلی ترقیات کے لئے جو ابھی نئی نئی سرگرم توجہ ہوئی ہے، ان وطنوں کی مدافعت کی سرپرستی کی زحمت بھی دے رہا ہوں. اس وقت جبکہ مسئلہ صرف دیر کا تھا میں بفضل خدا بے پرواہ اور کامل طور پر غالب تھا، لیکن آخر میں چونکہ انگریزوں نے میری قومی ترتیبات سے ڈر کر اپنی ترتیبات سے مجھے آخر تک خبر نہ ہونے دی اگرچہ میں ہمیشہ کوشش کرتا رہا کہ ان کے خیالات خصوصاً جندول کے بارے میں (میں دیر کی دست درازیوں کے مقابلہ میں ایک دیوار باجوڑ کی طرف فرض کئے ہوئے تھا) معلوم کروں کہ دفعتاً فرنگی، جندول پر دیر کے ذریعہ حملہ کر کے بے مقابلہ اور بغیر جنگ کے اس پر قابض ہو گئے. افغانی ریاست کے حلیفوں کو اس طریق سے بے وقوف بنایا کہ فرنگیوں نے دیر کے ان قلعوں کو جو صوات کی حدود پر واقع ہیں، اپنی افواج کے ہاتھ میں دے کر صوات سے کہا کہ تیسری جنگ دیر کے ساتھ، اعلان جنگ انگریزوں کے ساتھ اور ایران کی شاہی فوجوں پر ہوگی.

عالم زیب سے کہا گیا کہ فوراً جندول کا تخلیہ کرو ورنہ طیاروں کا ہجوم تیرے سر پر کیا جارہا ہے اور باجوڑ کی اقوام کو پول اور پیسہ کے ذریعہ نیز اس افواہ سے جو جندول مست خیل کے خانوں (سرداروں) کو دیا جارہا ہے، مست کر دیا اور قومیں اس خیال میں کہ جندول ملیزی کے قبضہ سے نکل کر خاں تر کانی کے قبضہ میں آرہا ہے، جنگ سے علیحدہ رہیں.

جب فرنگیوں کی سیاسی چال سے افغانی ریاست کے حلیف ایک ایک کر کے بیکار ہو گئے اور میں تنہا میدان میں رہ گیا تو اضطرار کی حالت میں کامل یقین حاصل ہوا کہ اس

مقدس قطعۂ زمین کی حفاظت بغیر اس غازی (نادرشاہ) کی شاہانہ توجہات کے جوافغانوں کی آزادی کی حفاظت کا شیدائی اور افغانستان کی دولت علیہ کے استقلال کا موجد ہو، ممکن نہیں ہے کیونکہ اپنی شخصی کوششوں میں ریاست افغانیہ خود کو فرنگیوں کے مقابلے میں قطعاً ناکام اور بے دست و پا پاتی ہے۔

اے آزادی کے محافظ متوالے، ریاست دیر نے جو کہ ہمارے مقدس وطن کی آزادی کو گم کرنے پر فرنگیوں کی طرف سے مامور ہے اجنبیوں کے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے مندرجہ ذیل طریقے استعمال کئے ہیں۔

۱- سالارزئی، ماموند اور اُتمان خیل کے آزاد قبائل کو تقسیم کرنے کے لئے بے پناہ رقم تقسیم کرنا شروع کی۔

۲- باجوڑ کی آزاد ریاست کو قوموں کے آپسی تصادموں اور ناوہ گئی اور کوٹکی جیسی انتہائی ضعیف طاقتوں کو تربیت اور بادشاہ گل پسر حاجی صاحب ترنگ زئی کو معاندانہ تحریکوں کے ذریعہ پریشان کر کے مجبور کر رہی ہے کہ دیر کے سامنے ہتھیار ڈال دے۔

وطن مقدس کے زار و نزار حالات و کوائف کو عرض کرنے کے بعد دو باتیں خدمت مبارک میں پیش کرنے کی آزادی رکھتا ہوں۔

اول: اگر اعلیٰ حضرت (نادرشاہ) غازی نے وطن کے خادموں کی سرپرستی فوراً قبول نہ فرمائی تو عنقریب بقیہ وطن بھی فرنگی استیلاء و اقتدار کے شکنجہ میں چلا جائے گا۔

دوم: یہ کہ خادم اپنے ضعف کے اقرار کے باوجود آخری امکان کی حد تک مدافعت کا عزم رکھتے ہوئے جہاد میں مصروف رہے گا۔ بعون اللہ تعالیٰ۔

اس معروضہ کے جواب کا منتظر ہوں کہ اعلیٰ حضرت غازی ذاتِ والا موجودہ وقت میں افغانی ریاست کی دستگیری کا کچھ امکان ملاحظہ فرماتے ہیں یا خدانخواستہ نہیں۔ اور اگر سرپرستی کا امکان ہے تو اس کی کیا شکل تجویز فرمائی جاتی ہے۔

باب/آفاق شمال

قبائل کی تنظیم

دوسری افغان انگریز جنگ (۱۸۷۸-۱۸۸۰) کے بعد معاہدہ گندمک کے مطابق افغانستان کے امیر عبدالرحمان خان (ح:۱۸۸۰-۱۹۰۱) نے ۱۸۹۳ میں برطانوی ایجنٹ مورٹمر ڈیورنڈ (Mortimer Durand) کی کھینچی ہوئی لکیر کو افغانستان اور ہندستان کے درمیان سرحد کے طور پر منظور کرلیا تھا. سرحد تو بن گئی مگر اس کے ساتھ انگریزوں نے اس علاقہ میں بدامنی پھیلا دی اور رشوت کا بازار گرم کردیا. مولانا منصور انصاری پہلے شخص تھے جنہوں نے نادرشاہ کو ایک مکتوب میں اس صورت حال سے باخبر کیا اور افغان حکومت کے سامنے جوابی اقدامات کی تجاویز پیش کی تھیں.

نادرشاہ کے نام تحریر

امیر عبدالرحمان خان نے ڈیورنڈ حدود کو افغانستان اور ہندستان کے درمیان خط فاصل منظور کرکے اپنی بلند تدبیروں کے ذریعہ ایک وسیع علاقے کو محفوظ کرکے اپنے محروسات کی مضبوط ڈھال بنا دیا تھا جس سے فطری طور پر دولت علیہ (افغانستان) اور حکومت برطانیہ کے درمیان ایک خاموش جنگ کا جاری ہونا لازمی امر تھا. برطانیہ نے آزاد سرحد کے فتح کرنے کے لیے شروع میں جارحانہ اقدام کیے اور نقصان برداشت کرکے ان اقدامات سے ہاتھ کھینچ لیا اور طے کیا کہ آئندہ سیاسی اقدامات کے ذریعہ اس علاقہ کو زیر کیا جائے گا.

برطانوی اقدامات اور مقاصد

۱- پیسہ کے ذریعہ (قبائل میں) دولت پیدا کرنا اور پول پرستی کی

بداخلاقی قوم میں پیدا کر کےان کوتباہ وبرباد کرنا.

۲- ایک سڑک دیر کے علاقہ سے چترال کے علاقہ کے بیچ بنا کر علاقہ کو دوحصوں میں تقسیم کرنااوراس سڑک کے ذریعہ کاٹے ہوئے علاقہ کواپنے کام کامرکز بنانا.

۳-ریاست اسلامیہ دیرکوروز بروزاپنے زیراثرلانا.

۴-باجوڑ اورمہمند میں بھی اپنے آدمی (حمایتی) پیدا کر کے موقع کا منتظر رہنا.اور مفتوحہ علاقوں کومرکزیت دے کراپنے قبضہ میں رکھنا (مقصد) رہا ہے.

دولت علیہ جواس علاقہ کی محافظ رہی تھی، وہی پورے وطن کی محافظ کی حیثیت رکھتی تھی.اس نے مندرجہ ذیل طریقوں سے دفاعی فریضوں کواپنے لیےضروری قرار دیا تھا.

اول: پیسہ کے ذریعہ اپنے دوست پیدا کرنا.

دوم: روحانی پیشواؤں (اخوندزادہ ملانجم الدین صاحب جوصاحب رحمہ اللہ کے نام سے مشہور تھے) کے ذریعہ سے قبایل میں جہاد کا جوش پیدا کر کے ان کو وطن کی حفاظت کے لیے کھڑا کرنا.

سوم: ممکنہ مواقع پراسلحہ اور کارتوس آزادسرحد میں پہنچانا.

دیکھا یہ جارہا ہے کہ برطانیہ کی ترقی اور پیشرفت والی سیاست ہماری مدافعت کے مقابلہ میں کامیاب ہے اور ہم دیر کی سڑک کے ذریعہ کٹے ہوئے علاقے صوات،بنیر،کوہستانات، پورن، چکیر،آلائی اورپکھلی وغیرہ کی حفاظت میں بالکل ناکام، دیرکی حفاظت میں نیم ناکام اور باجوڑ اورمہمند کے علاقوں میں کافی کمزور ہیں.

ہماری ناکامی کے اسباب یہ ہیں:

سب سے پہلے تو یہ کہ ہم نے اس بات پرغور ہی نہیں کیا ہے کہ پیسہ کے ذریعہ دوست پیدا کرنا، دوستوں اورقبایل میں ایک مہلک اخلاقی برائی (پول پرستی/ زرومال سے محبت) کی تولید کر کے کم دولت والے (لوگوں) کی بہت زیادہ دولتمند دشمن کے مقابلے میں

ناکامی کی بنیاد مستحکم کرنا ہے یعنی دشمن کے طریقے پر چل کر ہم نے خود اپنی قوم کو اس بات پر آمادہ کر دیا ہے کہ وہ خود کو دشمن کی گود میں ڈال دیں.

آج قبائل کے سرداروں کی پول (مال) پرستی نے بنیادی مذہبی عقیدوں کی جگہ لے لی ہے جس نے ان کا مذہب صرف پول پرستی اور ان کا کام دولتمندوں کے اشاروں پر ناچنے والا بنا کر انہیں عملاً دولت علیہ کا اصلی دشمن اور اپنے وطن کا تخریب کار بنا دیا ہے.

اس آوارہ کی ناقص رائے میں اگر دولت علیہ بکھری ہوئی (منتشر) اقوام میں صحیح تعلیمات کا سلسلہ بھی جاری فرماتی تو اس سے صحیح زندگی اور شایستہ جذبات پیدا ہو کر دشمن کی پیش رفت کی ناکامی کی بنیاد کو قایم کرتے اور حکومت قبائل کے اصلاح یافتہ احساسات کی برکت سے ان کی حفاظت میں کامیاب ہوتی.

دوسرے یہ کہ ہم پر لازم تھا کہ بالاکنڈ اور چترال کی سڑک کو، بہتر تھا کہ، ایک آن میں ویران کر کے آزاد علاقے کو ملا کر ایک کر دیتے اور برطانوی مقبوضہ (چترال) کو ان سے علیحدہ کر کے اپنے سے ملا لیتے اور صوات اور بنیر جیسے دور دراز علاقوں کو مدافعت کا میدان بنا کر دشمن کو ہمیشہ کے لیے (اس سے) محروم کر دیتے لیکن افسوس کہ دولت علیہ کی سیاست ان معمولی سی دفاعی ذمہ داریوں کے ادا کرنے سے بھی قاصر رہی جس کے نتیجہ میں آج اس علاقہ کو صوات کی منظم اور ترقی پذیر صورت میں برطانیہ کے قبضہ میں داخل دیکھ رہے ہیں.

تیسرے یہ کہ اسلامی ریاست دیر کی واپسی کے لیے کوئی صحیح اور بنیادی اقدام نہیں کیا گیا. آج وہ چترال کی سڑک اور چین و ہند کے اتصال کی حفاظت کا خادم بالاکنڈ اور چترال میں مقیم دشمن کی فوجی طاقتوں کے درمیان محصور ہو چکا ہے اور دشمن کے ہاتھ میں پڑا ہے. برطانوی سیاست نے سوات اور باجوڑ کی آزاد ریاست کے اتحاد سے دیر کی ریاست کو دوسری اطراف سے بھی گھیر کر اپنا قیدی اور محتاج بنا لیا ہے. آج دیر کا مسئلہ حکومت کے لیے بہت سخت (سنگین) ہو چکا ہے اور دیر بھی سیاسی نقطۂ نظر سے مکمل سقوط کے قریب ہے.

چوتھے یہ کہ باجوڑ اور مہمند میں بھی ہوس مال اور زر پرستی کی اخلاقی برائی پیدا کردی گئی ہے جو ہماری ناکامی کی بنیاد ہے اور سوائے چند دنیا دار روحانی پیشواؤں کے حاصل کرنے کے ہم نے کوئی قابل ذکر کام نہیں کیا ہے.

۱- سرحد آزاد کے روحانی پیشوا خود کو ہڈہ صاحب علیہ الرحمہ کا جانشین کہتے ہیں. خود ہڈہ صاحب علیہ الرحمہ نے اول تو اپنے جانشینوں کی کوئی تنظیم قطعاً کی ہی نہیں تھی جو حکومت کے کاموں کے لیے اولین شرط ہے. آج ان کے خلفا وحدت کے بجائے بکھراو اور خدمت میں اتحاد کے بجائے ایک دوسرے کی ضد اور مخالفت کو وطنی فریضہ بنائے ہوئے ہیں.

ہاں ان خلفا کے اخلاق اور اعمال کے اثرات نے قبائل میں بھی سرایت کر کے ایک (متحدہ) معاشرہ کو خلفا کی تعداد کے مطابق (گروہوں میں) تقسیم کردیا ہے یہ بات دولت علیہ کی سیاست کی ناکامی کے اسباب میں سے ایک ہے.

۲- ہڈہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے باوجود اپنے بلند کمالات اور مراتب کے، بجائے روحانی طاقت کے (ذریعہ) جمعیت (عوام) کو اپنی طرف مائل کرنے کے، مادیت (لنگر) اور شکم پرستی کو بنیاد بنایا. ہڈہ صاحب علیہ الرحمہ (کاش) اپنی ذاتی برکات اور حکومتی امداد سے اس بارگراں کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو سکتے. آج ان کے خلفا بھی اس ناقابل برداشت بوجھ کے نیچے پریشان ہیں اور لنگر کو جاری رکھنے کے لیے ہر اخلاقی، سیاسی اور مذہبی ذلت کو برداشت کرنے کے لیے خود کو مجبور پاتے ہیں.

مشایخ کے لنگروں نے اول تو بلند مرتبہ روحانیت کو مادیت کی پستی میں گرا کر ان کو بیکار بنادیا ہے. دوسرے یہ کہ روحانی قیادت نے لنگر کے کام کو نان دہی کی مجبوریوں میں گرفتار کر کے (خود کو) اس بات پر آمادہ بنادیا ہے کہ وہ دشمن سے بھی خواہش اور لالچ کا چہرہ نہ پھیریں (دشمن کے سامنے بھی ہاتھ پھیلائیں)

آیا تجربہ کار لوگوں کے لیے اس مصیبت کبریٰ سے چشم پوشی ممکن ہے؟

۳- وطن آزاد کے روحانی پیشواؤں کی سیادت لامرکزی قبائل کی ضروریات پر قائم ہے. وطن آزاد تنگ اور اس کے رہنے والے بہت زیادہ. اس واسطے کہ ایک خاندان کے گذارہ کے قابل زمین کا ایک ٹکڑا ان کے ہاتھ آ جائے وہ مجبور ہیں اور اس حد تک پہنچ گئے ہیں کہ ایک قطعۂ زمین کے لئے اپنے ایک بھائی کو قتل کر کے یا اسے (دور) بھگا کر وطن سے کم کر دیں. افغانی ملت کے دستور نے بھی تربوریّت (خالہ زاد بھائی کی دشمنی) کو ملت کے درمیان جاری کر کے اتحاد کے حلقہ کو تقریباً گم اور برادرانہ زندگی کو اجنبیت کارانہ عداوت میں تبدیل کر کے اُنس فطرت انسانوں کو حسرتناک وحشت میں گرفتار کر دیا ہے

.حیرت اور افسوس ہے کہ علما جو ہمارے کام کے مدبر اور ذریعہ ہیں، اپنی سیادت کی حفاظت کی غرض سے معذور نظر آتے ہیں کہ اس باہمی غیر انسانی اختلاف کی ممانعت کر کے اپنی سیادت کی بنیاد کو کمزور نہیں ہونے دیتے. یہی وجہ ہے کہ محترم ممدوحین نے لامرکز پرستی کی سیاست کو جو کہ انسانیت اور دین اسلام دونوں کے اعتبار سے قطعی حرام ہے اور آزاد سرحد کے مرکزوں کی مخالفت کو - جن میں چند افراد متحدہ زندگی گذار کر خطرہ پیدا کر رہے ہیں کہ کہیں باقی آزاد ٹکڑے (گروہ) بھی باہمی اتحاد کے بڑے مرکز کے زیر سایہ آ کر ان کی سیادت کو جڑ سے نہ اکھاڑ پھینکیں - اپنا مذہب بنا رکھا ہے.

۴- چونکہ تعلیم وطن میں اتحاد کا احساس پیدا کرتی ہے اس لیے ہمارے مقدس روحانی پیشواؤں نے کبھی بھی تعلیم و تربیت کے سلسلے کو ہاتھ نہیں لگایا ہے اور درسگاہوں اور مدرسوں کی مخالفت کو بھی وطن کے چھوٹے موٹے مرکزوں کی دشمنی کی طرح اپنی زندگی کے فرایض میں شامل کر لیا ہے، بلکہ ان کے مبارک اقدامات پر اگر ان کے درمیان بیٹھ کر غور کیا جائے تو جلد ہی ظاہر ہو جائے گا کہ یہ محترم حضرات دولت علیہ کو بھی اپنی سیادت کے حلقہ

میں اسی قدر اور اسی غرض سے دخل دیتے ہیں کہ وہ حکومت کے مرکز کے تابع ہو کر ان کے ہاتھ میں حکومت سے جلب منفعت کے اسباب میں سے ایک ہو جائے اور بس.

ممدوحین گرامی کی سیادت کی مرکزی قوت کو ہم سوال کرنے والی ایک قوت دیکھتے ہیں جو حکومت کی ضرورت کے وقت، سوال وزاری اور فانی حرص وطمع کے ساتھ پیسہ اور لوٹ کا مال وغیرہ اپنے ساتھ لے کر حاضر ہوتے ہیں اور حال یہ ہوتا ہے کہ ان کے لوگوں میں ربط ونظم کے بجائے مکمل بدنظمی اور بے ربطی ہوتی ہے اور ان کا ہر فرد اور افراد کا مجموعہ (خاندان) مکمل استقلال اور آزادی کا مدعی ہوتا ہے.

اس سبب سے خدام حکومت کے لیے کام کی راہ میں جو مشکلات یہ پیدا کرتے ہیں وہ روز روشن ہیں ان کی فضول تکرار سے میں سمع خراشی کی ضرورت نہیں سمجھتا.

اس انتہائی جزئی فائدے کو مبالغہ آمیز مصارف اور بے حد دماغ صرف کرنے کے بدلے خریدنے کو عقلمندی کا کام نہ سمجھتے ہوئے میں آرزومند ہوں کہ حکومت کی سیاست میں تبدیلی کر کے مفید اور ہوشمندانہ بنیادوں پر ان کو قایم فرما کر اس مقدس خطے میں وطن کی حفاظت کو حاصل کیا جائے. اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ہمارے بزرگ اسی راستہ پر چلے ہیں لیکن چونکہ ہم اس راہ پر چل کر اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوئے ہیں اور اس راہ کے غلط ہونے کا تجربہ کر چکے ہیں لہٰذا مناسب یہ ہے کہ خطائے بزرگاں گرفتن خطاست (یعنی بزرگوں کی غلطی کو اختیار کرنا خود غلطی ہے) پر عمل کر کے مہدیت (ہدایت دینے) کے مقام محمود پر سرفراز ہوں. وباللہ التوفیق.

اس آوارۂ وطن کی رائے میں طریقۂ کار یہ ہے کہ برطانوی سیاست کی پیروی کو خود انہیں کو شکست دینے کے لیے اپنا فرض سمجھا جائے (برطانوی حکومت کو شکست دینے کے لیے خود انہیں کی سیاست کو اختیار کیا جائے) تا کہ اس طرح ہم لوہے کو لوہے سے کاٹ سکیں. اس علاقہ میں اپنی کامیابی کے لیے برطانیہ کی بنیادی سیاست یہ ہے کہ وہ ایک علاقہ

میں اپنا اثر قایم کر کے اور وہاں ایک ''کام کا آدمی'' حاصل کر کے، ایک اہم علاقہ کا واحد منظّم مرکز بنا کر، اس کے ذریعہ دولت عُلیہ کے اثر اور اقدامات کو اس علاقہ سے زایل کر دیتے ہیں. چنانچہ صوات میں یہی صورت حال مشاہدہ میں آئی ہے اور چترال اور دیر میں بھی. (جواباً) ان جگہوں کے منظّم مراکز کو قبضہ میں کر کے برباد کرنے کے بجائے انہیں اپنے منصوبے کے مطابق کام میں لایا جائے.

والیان مراکز منظّم ہمارے روحانی علماء کے مقابلے میں زیادہ بلند مرتبہ خاندانوں سے تعلق رکھتے ہیں، شریفانہ ماحول کے تربیت یافتہ ہیں، ذاتی شرافت سے موصوف اور اپنے خاندان کے بنیادی مقاصد سے مربوط ہونے کی وجہ سے ایک حکومت سے علاقہ مندی، خدمت، محافظت اور شان وشوکت پیدا کرنے کے لیے زیادہ موزوں ہوتے ہیں. حکومت اول تو حکومت سے مستفید ہو سکتی ہے. دوسرے درجہ میں اس کا فائدہ اٹھانا اس کے غیروں سے خاص طور پر اس وقت جب کہ مرکزیت پرستی اور اس مسلک کی حفاظت کرنے والے ہوں، نہ یہ کہ غیر ممکن ہے بلکہ حکومتوں کی ہم نشینی بھی ان کے ساتھ کوئی خاص مناسبت نہیں رکھتی اور ان کی بالائی حکومت میں لامرکزیت والے جذبات کے سرایت کر جانے کا خوف ہوتا ہے. یہی وجہ ہے کہ برطانیہ نے اپنی ہم نشینی اور خدمات کے لیے والیان ریاست کو منتخب کر کے ان کے بل پر ہماری مدافعت کو بیکار کیا ہے.

ہمارے دنیادار روحانی پیشواؤں نے سوائے اس کے کہ بعض اسلامی مرکزوں کی تکفیر کریں یا اپنے مسلسل تکفیری گیتوں سے ملی حکومت کو مردان کار کے لیے اجنبی بلکہ مخالف بنا کر ناکامی کے کنویں میں دھکیل دیں، اور کوئی کام آگے نہیں بڑھایا.

مجھ آوارہ نے بہت غور کیا ہے کہ برطانوی سیاست کی تقلید کو اپنے مقاصد کی حفاظت کے لیے چسپاں کیا جائے.

موجودہ حالات میں صوات کی ریاست کا حاصل ہونا تقریباً ناممکن ہے اور

ریاست دیر کو بھی میں نے دیر کی سڑک اور اس کے چاروں طرف سے محصور ہونے کی وجہ سے کچھ زیادہ مفید مطلب نہیں پایا. شہر (باجوڑ) کی آزاد ریاست اگر چہ دیر کی بہ نسبت چھوٹی ہے لیکن اول تو بہ سبب آزادی اور آزاد اقوام کے درمیان واقع ہونے کے، دوسرے اس کی اسلامیت، عزم و ہمت، اقبال و تجربہ کاری کے سبب، تیسرے اس کے دولت علیہ کے ساتھ مربوط ہونے کے انتہائی شوق اور ملت اسلامی کی خدمت کے سچے جوش کے پیش نظر میں نے تجویز کیا ہے کہ دولت علیہ کے ساتھ اس کا تعارف کرا کے سفارش کی جائے کہ تقویت اور تربیت کی ہمت اس کے لیے صرف کر کے اقوام لامرکزی (قبائل آزاد) کو جس طرح کہ برطانیہ نے صوات کے چاروں طرف جمع کیا ہے افغانستان اس کے گرد اگرد مربوط کر دے. چنانچہ دولت علیہ اس آوارۂ وطن کی درخواست اس اخلاص کے سبب جو وہ رکھتا ہے اور اس اعتماد کی بنیاد پر جس نے للّٰہی خدمات کے نتیجہ پر اس کو اس پر آمادہ کیا ہے، توجہ کر کے باجوڑ کی آزاد ریاست کے دولت علیہ کے ساتھ مربوط کرنے کے ارادے کو محل اجرا میں لائیں، جو دفتر ریاست معمولات عمومی سے معلوم کیا جا سکتا ہے، دولت علیہ نے اس وقت اپنا ارادہ اس طرح ظاہر فرمایا تھا کہ

۱- چمرکنڈ وغیرہ کی سرحد تک سڑک بنائی جائے گی.

۲- قبائل مہمند، باجوڑ اور اُتمان خیل کے وظیفے ریاست شہر کے ہاتھ سے تقسیم کیے جائیں گے.

۳- اس کے علاوہ بھی اپنے اثر ورسوخ کو صرف فرمائیں گے تا کہ مذکورہ برمرکزہ قبائل متحد اور ایک وجود والے (متحد) ہو جائیں.

۴- سیر (علاقے کا نام) کا مرکز اپنے علاقہ میں دولت علیہ کے حدود تک منظّم سڑکیں تیار کرے گا.

مذکورہ مراکز کی تعمیر سے دیر اور صوات کو مرعوب بھی کیا جا سکے گا اور دیر کو اپنے

ساتھ مربوط بھی کر سکیں گے. اور موقع دیکھ کر صوات، دیر کی سڑک شہر، دیر، صوات کی متحدہ طاقت سے یا محض سیر و دیر کو متحد کر کے کٹے ہوئے علاقہ کو دوبارہ ملا سکیں گے. یہ بڑا مقصد ان مصارف سے جو دولت کی طرف سے مہمند، باجوڑ اور دیر وغیرہ کے لیے جاری کیے جائیں گے، حاصل ہوگا اور اگر ہم غور کریں، تو یہ (مصارف) اس (کے) منافع کے مقابلہ میں کوئی اہمیت نہیں رکھتے.

جب برطانوی سیاست ایک متحدہ دیر، چترال، صوات کی تعمیر اور باجوڑ کے قبضہ کرنے پر متوجہ ہو کر (اپنا ایک مضبوط مرکز) افغانستان کے حدود میں افغانستان کو بے سپر اور بے سہارا بنانے کے بعد تشکیل دے رہی ہے، تو اس وجہ سے باجوڑ کی حفاظت اور برطانیہ کی کچھ اہم طاقتوں (دیر وغیرہ) کو افغانستان کے وجود کی حفاظت کے لیے جذب کرنا فطری طور پر لازم ہونے کے سبب دولت علیہ کے پیش نظر تھا.

یہ وہ خیالات اور طریقے ہیں جو کہ خالص دولت علیہ کے منافع کی بنیاد پر قایم ہو کر مقبول ہوئے ہیں. میری نظر حکومتی معاملات میں اپنے اور اپنوں کے شخصی منافع کی حفاظت سے قاصر ہے. میں پہلے بھی ہر بات بلا رو و رعایت صاف صاف عرض کر چکا ہوں اور اب بھی صاف عرض کر رہا ہوں اور اس پر اس قدر اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ عہد حاضر میں بھی حق اعتماد کو حسب سابق اپنے اوپر اور اپنی نیت پر رکھتے ہوئے حکومت کی خیر کے لیے دولت علیہ اور ریاست اسلامیہ کے میثاق کے اجرا کو ضروری سمجھتا ہوں، کیونکہ آزاد طاقتوں (قبائل) کو منظّم کرنا حکومت کے لوازم اور فرایض انسانی اور ان حدود کی افواج کی حفاظت اور تعمیر کی ضروریات میں سے ہے.

فقط.

۳۱ ثور ۱۳۰۹ھ ش (۲۰ ذی الحجہ ۱۳۴۸ھ/ ۲۱ مئی ۱۹۳۰)

باب/آفاق شمال

امامت کی ضرورت

مولانا محمد میاں منصور انصاری امامت کو ایک بنیادی سیاسی اصطلاح کے طور پر استعمال کرتے تھے جس کے قرآنی معنی سردار ہیں: ''جس دن ہم بلائیں گے ہرفرقے کو ساتھ ان کے سردار کے - بِاِمَامِهِمْ'' (القرآن. بنی اسرائیل ۱۷:۷۱. شاہ عبدالقادر محدث دہلوی. موضح القرآن. ایچ ایم سعید کمپنی. کراچی. ۱۹۹۵) .اسی لئے نماز کی جماعت کا سردار امام کہلاتا ہے. ملت کی سرداری کو اسی بنا پر امامت کبریٰ کہا جاتا ہے. مولانا منصور انصاری کی مندرجہ ذیل تحریر کا یہی پرمنظر ہے.

آج عالم اسلام میں امامت نہیں رہی. مسلمان امام وقت کو نہ جاننے کی وجہ سے برے انجام والے معلوم ہوتے ہیں.

جو اپنے زمانے کے امام کو نہیں جانتا وہ جاہلیت کی موت مرتا ہے (حدیث)

اس سبب سے ہر مسلمان پر فرض ہے کہ امام کو تلاش کر کے ظاہر کرنے (اس کی سربراہی کو برپا کرنے) کے لئے جہاد کرے.

امام کو ہم کس طرح ڈھونڈ ھ نکالیں؟

جاننا چاہیے کہ امام خدا تعالیٰ کی طرف سے مبعوث نہیں ہوتا بلکہ وہ بہتر شخص جس کو جمہور امت اسلام اور امت کی خدمت کے لئے انتخاب کر لیں وہی شخص خدائے ذوالجلال کے دربار میں بھی منظور و معتبر ہو جاتا ہے. لہٰذا مسلمانوں پر فرض ہے کہ علاقہ کے معتبر لوگ جمع ہو کر ایک شخص کو جو نیکی اور ملک وملت کے چلانے کی قابلیت رکھتا ہو، اپنے درمیان سے انتخاب کر کے اپنا بڑا بنالیں اور اس کے ساتھ جمع ہو کر مشورہ کے ذریعہ اسلامی خدمات و ذمہ داریوں کو اپنے وطن میں جاری کریں تاکہ اختلاف دور ہو اور جنگ وجدل قوم سے برطرف

ہوکر سب کا کلمہ ایک ہو جائے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ تم میں سے ہر شخص راعی ہے (چرواہا ہے) اور ہر ایک اپنے ریوڑ کے بارے میں جواب دہ ہے.

جب ایک وطن میں مرکز بنالیا جائے تو اس مرکز کو چاہیئے کہ دوسرے وطن (ملک) میں مناسب طریقے سے اتحاد پیدا کرے اور اسی پر قیاس کر کے مسلسل یہاں تک کہ عالم اسلام کا ایک مرکز وجود میں آجائے.

سرحد آزاد کا وطن چونکہ (انگریزوں سے) آزاد (خود مختار) ہے اس کے لئے ممکن ہے کہ اپنے ممالک (قبائلی خانات) میں مناسب مرکز پیدا کر کے ان مراکز میں اتحاد و اتفاق پیدا کر کے سب کو ایک اتفاق اور ایک رائے پر جمع کرلے. اس علاقہ کے دانشوروں پر یہ اقدام فرض ہے تاکہ یہ علاقہ شریف ایک حکومت کے مرتبہ کو پہنچے.

آزاد سرحد کے بہت سے وطن (قبائلی خانات) ہیں اور اس کا ہر علاقہ ایک علیحدہ رنگ و روش کا حامل ہے. ہم اس وقت صرف مہمند صوات کے علاقہ تک سلسلہ کو لے رہے ہیں اس کے بعد دوسرے ممالک کے معاملات لئے جائیں گے. مہمند یہ میں جرگہ موجود ہے. چارمنگ. ماموند، سالارزئی میں بھی جرگہ ہے. کوٹکی، شہر، جندول، دیر، صوات وغیرہ خانی مراکز ہیں.

لہٰذا ضروری ہے کہ ان علاقوں میں جہاں جرگہ ہے، جرگہ کو اتنا مضبوط اور طاقتور کر دیں کہ کوئی شخص بیرون (انگریز وغیرہ) معاملات میں اپنے طور پر کوئی اقدام (فیصلہ) نہ کر سکے اور کوئی معاملہ دوسری قوموں کے ساتھ بغیر اپنے علاقہ کے جرگے کی رائے اور اجازت کے نہ ہو سکے. جب یہ علاقہ جرگہ میں اتنی قوت پیدا کریں گے تو ایک مرکز پر جمع ہو جائیں گے اور ان کے اندر استقلال پیدا ہو جائے گا.

مثلاً مہمند کے خصوصی جرگہ سے دس نفر منتخب کئے جائیں، اسی طرح چارمنگ کے جرگہ سے دو نفر، جرگہ ماموند سے چار نفر، سالارزئی کے جرگہ کی طرف سے چار نفر اور خانی

شہر، خانی صوات اور خانی دیر سے ان کے ملک جس قدر مناسب سمجھیں وکیل (نمائندے) آئیں اور کسی ایک جگہ "مرکز مراکز" (ہیڈکوارٹر) مقرر کر کے جمع ہوں اور خارجی اقدامات کے لئے مشورہ اور اتفاق سے کارکریں.

اس لوئی جرگہ کے لئے ضروری ہے کہ اپنے پڑوسیوں (انگریز وغیرہ) سے حکومت کے اصولوں پر تعلق رکھیں اور ہر کام میں جس قوم یا خانی کا فائدہ نظر آئے اس کے لئے اسی کو اجازت دیں اور اتفاق واتحاد کے ساتھ گذارہ کریں.

اس جرگہ کو چاہیئے کہ اندرونی اختلاف کو بھی ختم کرے اور ہر قوم اور خانی کے حدود معلوم (طے) کر کے اس حد سے تجاوز کے بارے میں آپس میں عہد کرلیں کہ اس حد سے تجاوز نہ کریں گے بلکہ ایک دوسرے کے مددگار بن کر باہر والوں سے فائدہ اٹھائیں گے.

اگر خدا تعالیٰ نے یہ نعمت دے دی تو پھر اتحاد اور تیراہ وغیرہ کے ساتھ متحد جرگہ پیدا کرنا بھی آسان ہو جائے گا، لیکن اس کے لئے بے غرضی، اخلاص اور ہوشمندانہ روش پہلی شرط ہے. تحریک کے ان لوگوں کے لئے جو اس خدمت کے لئے پہلے کھڑے ہوتے ہیں جرگہ کی ترتیب چاہیئے کہ عمومیت (عام نمائندگی) کی شکل میں ہو. لوئی جرگہ کا رئیس فی الحال ایک سال کے لئے عام لوگوں میں سے انتخاب کیا جائے یا ان نمائندوں میں سے چنا جائے جو موجود ہوں. چاہیئے کہ ایک قوم یا ایک خانی کے منافع کے خلاف کوئی پابندی عاید نہ کی جائے اور ہر قوم اور ہر خانی کو خارج کے لئے اجازت دی جائے کہ فائدہ حاصل کر کے خود کو اسلام کی خدمت کے لئے طاقت ور بنائے. اور یہ بھی فرض ہے کہ لوئی جرگہ ہر قوم اور ہر خان کے داخلی معاملات میں غیر جانبدار رہے. ہر ملک کے داخلی معاملات خود اس کے عوام اور ان کا جرگہ یا ان کا خان جانے اور موجودہ زمانے کی طرح ان کے داخل (داخلی معاملات) کو آزاد چھوڑ دیا جائے تا کہ اختلاف اور مخالفت وضد دور ہو.

درجلال آباد. یکم ذی الحجہ ۱۳۴۵ھ/۲ جون ۱۹۲۷ء

ملت کا جمود

پہلی عالمی جنگ میں ترکی اور جرمنی کو شکست ہوئی تھی اور اتحادی ملکوں (برطانیہ، فرانس) کی ایک پرانی مہم کی تکمیل کا موقعہ آیا تھا جس کے ماتحت سلطنت عثمانیہ کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے تقریباً ۴۰ نئی قوموں میں بانٹا گیا تھا. انہی میں یونان بھی تھا جس کی سرپرستی سلطان عبدالحمید ثانی کی مخالفت میں برطانیہ اور روس کرتے آرہے تھے. برطانیہ کی شہ پر یونان نے اناطولیہ میں ترکی کے صوبہ سمرنا (موجودہ ازمیر) پر ۱۵ مئی ۱۹۱۹ کو فوجی قبضہ کر کے مقامی ترکوں کے خلاف ظلم وتشدد کا بازار گرم کر دیا تھا. ترکوں کا قتل عام ہو رہا تھا اور ان کی املاک کی لوٹ مار جاری تھی. اس کے جواب میں کمال پاشا کی سالاری میں ترک فوج نے پیش قدمی کی جس سے خوف زدہ ہو کر ۹ ستمبر ۱۹۲۲ کو یونانی فوج وہاں سے فرار ہو گئی. اس کے ساتھ ہی یونانی باشندوں میں بھی بھگدڑ مچی جنہوں نے فرار ہوتے ہوئے اپنے محلوں اور املاک کو نذر آتش کر دیا تاکہ ترک فوج اور عوام ان سے فائدہ نہ اٹھائیں. بہرحال اناطولیہ سے مکمل اتحادی اور یونانی انخلا ہو گیا اگرچہ اتحادیوں نے روایتی عیاری سے بحیرۂ ایجین کے تمام اناطولی جزائر یونان کے قبضہ میں دے دئے. یہ غیر منصفانہ فیصلہ تھا مگر استعماری ممالک اس لفظ سے ناواقفیت کا ثبوت دیتے آئے ہیں.

فتح سمرنا کا بڑا جشن منایا گیا جو ترکوں کا حق تھا. اس موقعہ پر جو عظیم الشان اجلاس ہوا تھا اس میں مولانا منصور انصاری نے افغان سفیر کی حیثیت سے تہنیتی خطاب کیا تھا.

اسی زمانے میں اسلامی حمیت رکھنے والے ممتاز ترک قائدین کاظم قرہ بکر پاشا، احمد جمال پاشا، رؤف بے اور علی شکری بے وغیرہ سے مولانا منصور انصاری کے دوستانہ مراسم ہو گئے تھے. یہ ترک قائدین کمال پاشا کے سیاسی نظریات سے متفق نہیں تھے. کاظم قرہ

بکر پاشا خلافت اسلامیہ کے خاتمہ کے حق میں نہیں تھے اور کمال پاشا ذہنی اور تربیتی طور پر ترکی کے لیڈر کی حیثیت سے خلافت کے منصب کے اہل نہیں تھے. اس لئے دونوں فوجی افسروں کے مابین اختلاف کی خلیج وسیع ہوگئی جس کے نتیجہ میں کمال پاشا نے انہیں قید میں ڈال دیا اور ان کی تاریخی تحریروں کو نذر آتش کرنے کا حکم دیا. یہ ایک الگ داستان درد ہے.

نوجوان ترک تحریک کے دست و بازو اسمٰعیل انور پاشا اور احمد جمال پاشا مجلس اتحاد و ترقی کے لیڈر اور سلطنت میں مغربی جمہوریت کے حامی تھے. ان کا نقطۂ نظر تھا کہ سلطان کے مطلق اختیارات ختم کرکے اسے برطانوی اور دیگر یورپی بادشاہوں کی طرح معاشرہ کا عضو معطل بنا دیا جائے. وہ نظام خود یورپ کے لئے کس قدر مفید یا مضر تھا یہ الگ بحث ہے جس کا ذکر یہاں بے محل ہے، لیکن وہ نظام بہرحال یورپ کے اپنے تلخ معاشرتی، سیاسی اور اقتصادی تجربات کا نتیجہ تھا اور ایشیا یا افریقہ کے عوام یا مسلمانوں کے وہ تجربات نہیں تھے. اکثر مشرقی دانشوروں اور مدبروں کی طرح انور پاشا اور جمال پاشا نے بھی ان باریک امور پر نظر نہیں کی جس کے نتائج خوشگوار نہیں نکلے. فلسطینی مدبر اور سفارت کار رفیق نتشہ کے بقول دونوں نے آخر میں محسوس کیا کہ ان سے تجزیہ میں غلطی ہوئی تھی مگر یہ احساس بعد از وقت تھا جس کی تلافی نہیں ہوسکتی تھی.

ترکی میں رہتے ہوئے مولانا منصور انصاری نے عالم اسلام کے دیگر رہنماؤں اور تحریکات آزادی کے زعماء سے ملاقاتیں کیں اور ان سے گہرے تعلقات قائم کئے. ان میں طرابلس الغرب (موجودہ لبیا) کے انقلابی قائد شیخ احمد سنوسی اعظم، کرد قائد محمد سعید کردی، مصری قائد حریت شیخ عبد العزیز شاویش، باغی ہندستانی فوجی کرنل مظفر پنجابی، مولانا عبد المنان امرتسری اور ترکی توپ خانہ کے انچارج مولا بخش بجنوری وغیرہ کے ساتھ مل کر ایک خفیہ کونسل بنائی جو غلام قوموں کی آزادی کے سلسلہ میں مشورے کرتی تھی.

اب مولانا منصور انصاری کے ذہن میں صرف ہندستان کی نہیں بلکہ ہر محکوم قوم کی

آزادی کا تصور تھا.

چونکہ انہیں بھی کمال پاشا کے سیاسی نظریات سے اتفاق نہیں تھا تو سرکاری دباؤ کے باعث سفارت کوتو خیر باد کہہ دیا مگر کابل کی ہدایت پر اناطولیہ کا قیام ترک نہیں کیا. یہ واضح نہیں کہ انگورہ (انقرہ) یا اناطولیہ میں یہ قیام کہاں تھا.

مولانا منصور انصاری کے نام ۸ سرطان ۱۳۰۰ھ شمسی (۲۹ جون ۱۹۲۱/۲۲ شوال ۱۳۳۷) کے ایک سرکاری خط سے اشارہ ملتا ہے کہ جون ۱۹۲۱ میں وہ اناطولیہ میں موجود تھے. اس زمانہ میں خراسان (ایران) میں سیاسی انقلاب رونما ہوا جس میں برطانیہ کی شہ پر اور حمایت سے رضا خان نے احمد شاہ قاچار کی حکومت کے خلاف بغاوت کی اور ضیاء الدین طباطبائی کو وزیر اول مقرر کر کے نئی حکومت قائم کی جو پہلوی خاندان کی بادشاہت کا مقدمہ ثابت ہوئی. مولانا منصور انصاری نے اس انقلاب کی تفصیلات سے حکومت افغانستان کو باخبر کیا. اس خط کے جواب میں وزارت خارجیہ حکومت افغانستان نے مزید تفصیلات کے لیے ۱۵ ستمبر ۱۹۲۱ کو خط تحریر کیا.

قدیم جغرافیہ کے مطابق خراسان شمالی ایران اور شمال مغربی افغانستان کو کہتے ہیں، لیکن یہاں اس سے مراد موجودہ ایران ہے، اگر چہ جغرافیائی خراسان کے شہروں میں مرو، بلخ، ہرات شامل ہیں اور اس کے مشرق میں بخارا ہے.

مولانا منصور انصاری کو ۱۸ اکتوبر ۱۹۲۱ کو بخارا میں واقع افغان سفارت خانہ کی طرف سے بخارا آنے کی دعوت دی گئی جن میں ہندستان سے متعلق کچھ خفیہ امور پر ان کا مشورہ سرکاری طور پر درکار تھا. وہ اس وقت بخارا گئے یا نہیں اس کی تفصیلات نہیں ملتیں. البتہ اکتوبر ۱۹۲۱ ہی کا ایک اور سرکاری خط ڈاکٹر عابد اللہ غازی کی دستاویزات میں محفوظ ہے. جس کے مطابق مولانا انصاری اکتوبر کے آخیر تک اناطولیہ میں ہی تھے اور افغانی حکومت کی نمائندگی کر رہے تھے.

یہ خط ۲عقرب ۱۳۰۰ھ شمسی (۲۴اکتوبر ۱۹۲۱/ ۲۱ صفر ۱۳۴۰ھ) کا تحریر کردہ ہے.اس کے لکھنے والے عبدالشکور نے القاب میں انہیں ''کاتب سفارت جلیلہ اناطولیہ دام عزہ'' تحریر کیا ہے،اور لکھا ہے کہ

ایک عدد پرچم سفارت عالیہ افغانستان سیاسی قاصد کی روانگی کے وقت تیار نہیں تھا،اب تیار ہو گیا ہے اور بذریعہ پارسل آپ کی خدمت میں روانہ کیا جا رہا ہے. براہ کرم وصول کر کے ہمیں رسید روانہ فرمادیں تا کہ وقت پر کام آئے.

مولانا محمد میاں منصور انصاری نے ایک تحریر ۲۴ میزان ۱۳۰۰ھ شمسی (۱۶ نومبر ۱۹۲۱/ ۱۵ ربیع الاول ۱۳۴۰) نظارتِ خارجیہ کے نام ارسال کی جس میں مسلم ممالک کے ایک فتنہ پرداز دشمن تقی خاں کے قتل پر مبارک باد پیش کی گئی ہے نیز انگریزوں کی سیاسی عیاریوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا ہے کہ

''انگریز کی شعبدہ باز جیب میں صد ہزار تقی خاں چھپے ہوئے ہیں''.

مسلم دنیا میں یہ حالت آج سو سال بعد بھی اسی طرح برقرار ہے.عجیب بات ہے کہ تاریخ میں جتنی بار اور جتنی آسانی سے مسلمان اشخاص مسلم دشمن طاقتوں کے ہاتھوں میں بکتے دیکھے ہیں ایسا معاملہ دیگر قوموں میں نظر نہیں آتا.بے شک اور قوموں کے لوگ بھی بکتے آئے ہیں مگر وہ کسی ذاتی مالی مفاد کے لئے نہیں بلکہ یا سیاسی مفاد یا کسی قومی غرض کے حصول کی خاطر بکتے دکھائی دئے ہیں.نصیرالدین طوسی،ابن علقمی،میر جعفر،میر صادق سے شریف حسین،احمد چلبی تک نہ جانے کتنے لوگوں نے اور کیوں مفادات ملت کا سودا کر کے تاریخ میں بدنامی کا داغ اٹھانا پسند کیا.ایسا لگتا ہے کہ یہ فقط ایمان کی کمزوری کا نتیجہ نہیں بلکہ انسانی شرف میں کسی پیدائشی خامی کا شاخسانہ ہے.

مولانا منصور انصاری نے افغان نظارت خارجیہ کے نام ۲۴ میزان ۱۳۰۰ھ شمسی (۱۶نومبر ۱۹۲۱) کے متذکرہ بالا خط میں یہ بھی تحریر کیا تھا کہ

خراسان وایران میں ہمارے اسلامی و مملکتی حقوق بدستور موجود ہیں اور ہم پر مشہد مقدس اور اس کے علاقہ کے لیے مدافعانہ کاروائی ہمیشہ لازم ہے.

بہرحال کمال پاشا کی سیاسی مخالفت اور مسئلہ خلافت پر اس سے اختلافات کے باعث مولانا منصور انصاری ترکی سے افغانستان واپس آ گئے تھے. سفارت کے تجربات ان کو اپنے کام سے روک رہے تھے. انہوں نے انقرہ سے ۱۵ شوال ۱۳۴۰ (۱۱ جون ۱۹۲۲) کو افغان سفارت کا رسردار عبدالہادی خان کو جوار دو زبان میں ایک خط میں تحریر کیا تھا:

انگورہ (انقرہ) شام وعرب اور استنبول کے مقابلے میں کام کرنے کا اچھا مرکز ہے. مگر یہاں کی حکومت اور ہماری سفارت دونوں استفادہ کی قابلیت نہیں رکھتیں. حکومت تو مشغولِ جنگ بھی ہے مگر ہم ماشاءاللہ ناقابلیت کے خالص پوٹ ہیں.

بندہ کھاتے کھاتے اور سوتے سوتے تنگ آ گیا ہے. بیکاری کو دور کرنے کے لیے مضمون ''الامانت والجہاد'' شروع کیا تھا مگر روحانی مشغولیت کے ہاتھوں وہ بھی ناتمام ہے. . . ہمارے تعلقات ہندستان، ترکستان، ایران کے ساتھ اول دن سے قائم ہیں اور اب ترکیہ سے بھی قائم ہو رہے ہیں. بندہ چاہتا ہے کہ استخلاصی مقامات کے لیے عرب کو دیکھنا اور عرب قوم کو اس کام کے لیے تیار رکھنا ضروری ہے، اور چونکہ میدان خالی ہے اس طرف اقدام نہایت ضروری ہے. اس لیے چند چیزوں کا بندہ محتاج ہے اور وہ سب حکومت کی مہربانی سے ممکن ہے.

یہ اقتباس ہے ایک طویل خط کا جو جز و عالم اسلام/ باب بلادعرب میں نقل کیا گیا ہے (ص ۳۱۸ دیکھئے)

اس مکتوب میں مولانا منصور انصاری نے جو تجاویز رکھی ہیں ان میں سب سے

پہلے سفارتی ذمہ داریوں سے سبکدوشی کی درخواست تھی.

سب سے اول میں متبوعہ حکومت کی اماریت حاضرہ (سفارتی ذمہ داریوں) سے سبکدوشی کا محتاج ہوں.

یہ جاہ ومنصب سے ان کے استغناء کی ایک مثال ہے. افغان سفارت کاری کے واسطہ سے وہ یکسوئی کے ساتھ آرام کی زندگی بسر کر سکتے تھے اور مراسم کا فائدہ اٹھا سکتے تھے. لیکن وہ ایک مرد مجاہد تھے جو اپنی خدا رسیدہ اہلیہ سے وعدہ کر کے گھر سے نکلے تھے کہ زندگی کی اس مہم میں مقصد اللہ کی خوشنودی ہے، متاع دنیا نہیں. وہ بڑے سے بڑے حکمراں کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر غلطیوں کی نشاندہی کرنے کی جرأت رکھتے تھے لیکن ظلم کے آگے جھکنے کو تیار نہیں ہوئے. انہیں کسی عہدہ کی خواہش بھی نہیں تھی. شہرت و ناموری سے بھی دلچسپی نہیں تھی. وہ عمل پر یقین رکھتے تھے. یہی ایک لفظ ان کی مکمل داستان حیات ہے.

باب/ عالم اسلام

ترک سیاست کا تجزیہ

مولانا منصور انصاری کمال پاشا اتاترک کی قیادت کو مسلمانوں کے حق میں مضر تصور کرتے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کمال پاشا انگریزوں اور یورپی عیسائیوں سے متاثر تھا اور یہ مرض ترکی تک محدود نہیں تھا اور ہر اس ملک میں وبا کی طرح پھیلا جہاں انگریزوں نے مقامی معاشروں کو اپنے مقابل شدید احساس کمتری کا شکار کیا تھا۔ مولانا منصور انصاری نے ترکی میں قیام کے دوران سفارتی وسائل سے نئے ترک لیڈروں کے بارے میں قیمتی معلومات حاصل کی تھیں اور اسی لئے وہ کمال پاشا کو انگریزوں کا ایجنٹ تصور کرتے تھے۔

ہندستان میں کمال پاشا کی حمایت میں جو تحریکیں چلائی جارہی تھیں انہیں بھی وہ پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ اس مسئلہ پر ہندستانی رہنماؤں اور امت کے دانشوروں کے نام جو تحریر ارسال کی تھی اس کے الفاظ میں ان کا کرب آج سو سال بعد بھی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ اس تحریر پر تاریخ درج نہیں ہے، لیکن اس کے مندرجات سے ثابت ہے کہ یہ خط ۱۹۲۲-۱۹۲۳ کے دوران لکھا گیا تھا۔

ہندستانی رہنماؤں کے نام خط

آوارۂ بیکار منصور انصاری

بخدمت عالی درجت معظم نیاز مندان رہنمایان و دانشمندان امت دامت افضالکم ومجدکم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

عرض یہ ہے کہ عرصہ سے بندہ عرض حال کرنا چاہتا تھا مگر گونا گوں افکار کی وجہ سے

تأمل رہا. ہر چہ باداباد کہ کرآخر قلم ہاتھ میں لے کر توکلت علے اللہ عرض کرتا ہوں.

محترم! بندہ حالت عین ناتجربہ کاری میں وطن سے آوارہ ہوا. دنیا کے ایک حصہ میں رنگارنگ حالتوں میں پھرا عزتیں دیکھیں. ذلتیں اٹھائیں. بیابانوں، پہاڑوں کی پیادہ منزلیں کاٹیں. ریگستانوں کو گھوڑوں کے پیروں سے روندا. اچھے، بڑے، چھوٹے بڑے لوگوں کو دیکھا. مسلمانوں کی بڑی چھوٹی دور ونزدیک قوموں کا ان کے اندر رہ کر تجربہ کیا. ملکوں کے انقلابات عروج وزوال اپنی آنکھوں سے دیکھے. بلند آہنگ دعوے سنے اور پھر مدعیوں میں رہ کر ان کے دعووں کو پرکھا. علے الخصوص اس قوم کو جو عالم اسلام کی مرکز المراکز ہے جا کر دیکھا نہ صرف جا کر دیکھا بلکہ مدتوں اس کے اندر ایک اس کے ذاتی فرد کی حیثیت سے گھس کر دیکھا اور اس قدر زریں تجربات کے مواقع عطا ہوئے کہ کسی دوسرے کو نصیب نہیں ہوئے. ماسکو سفارت فوق العادہ افغانستان میں ایک معتمد کی حیثیت سے پہنچا. انقرہ میں بھی رسمی عضو سفارت تھا بلکہ ایک ماہ سے زائد وکیل سفیر رہا. وہاں کی پارٹیوں میں اس کے اعضا کی طرح مقبول رہا. بخارا، تاشقند، فرغانہ، باشقر وترکستان سے تعلق رہا. آج رئیس بخارا اور ترکستان کے سرگرم خفیہ کارکن اس آوارہ کے شخصی دوستوں میں سے ہیں. قفقاز (آذربیجان اور داغستان) کے غیور مسلمانوں سے سابقہ رہا. اعلیٰ حضرت شیخ (احمد) السنوسی کے سے بے نظیر خادم اسلام کی ذات سے راز داری رہی، اور اس وقت بھی یاغستان (مہمند، باجوڑ، دیر، سوات) میں دوست رکھتا ہوں اور افغانستان میں بھی یہاں کی پارٹیاں بفضلہٖ عزت واعتماد کی نظر سے دیکھتی ہیں.

اس تمام افضال خداوندی کے باوجود چونکہ بے سُرہوں عالم اسلام کی خدمت کے ہاتھ پاؤں نہیں رکھتا، انا للہ وانا الیہ راجعون، اِنَّمَا اَشکُوا بَثِّي وَحُزنِی اِلَی اللّٰہِ.

اگرچہ جناب ترکیہ میں تشریف لے گئے ہیں اور جناب کی وہ سیاحت مفید ہوئی ہوگی، مگر بیجا نہ ہوگا اگر دو کلمہ وہاں کی نسبت عرض کروں.

ترک ملت اپنی صفائی حال میں عام اسلامی ملتوں جیسی پاکیزہ ہے. اس کی نیک نہادی، اس کا حسن اعتقاد، اس کا عدیم النظیر ایثار، ثبات، اس عظیم الشان عسکریت میں کوئی شک نہیں. مگر جس قدر اس کے یہ جوارح صحیح سالم ہیں اس سے زیادہ اس کا دماغ ماؤف ہو چکا ہے، اور یہ عام اسلامی ملتوں کا حقیقی مرض ہے کہ جس قدر ان کے عوام اچھے ہیں اس سے زیادہ ان کے رہنما برائیوں کے مجسمے ہیں.

اس وقت ترک ملت کے رہنما اسلام کے لیے ایک سیاہ داغ کا حکم رکھتے ہیں مگر اس میں ملت کا کوئی حصہ نہیں ہے؛ جو کچھ سیاہی ہے وہ صرف مصطفیٰ کمال کے گلیڈ سٹونی (برطانوی وزیر اعظم William Gladstone) دل کی ہے. اس میں شک نہیں ہے کہ ہم نے ہمیشہ کاغذی یا زبانی پروپیگنڈوں میں آتے رہ کر اسلام کی آستین میں سانپ پالے ہیں، اور یہ سانپ بھی کچھ کچھ اسلامی ہندستان کا دودھ پی کر پلا ہے. اس کے علاوہ اگر مجموعی ہندستان کی مساعی کو دیکھا جائے تو اس کی نظائر بھی کم نہ ملیں گی کہ ہمارے بعض خود ساختہ لیڈروں نے اس کے اقداماتِ گلیڈ سٹونی میں ہم آہنگی کر کے ترکیہ میں اسلام کو مغلوب کیا ہے. مسلم ہند کی یہ بے نظمی ایک بدترین لعنت ہے جو اس کو کبھی سرسبز نہ ہونے دے گی اور جس سے عالم اسلام کے دوسرے قطعات میں بھی کفر استفادہ کرنے میں کامیاب ہوتا رہے گا.

کمالستیوں کے علاوہ (ترکی کے) مدعیان خدمت اسلام (رؤف، رافت، علی احسان، عدنان وغیرہ) محسن الملک کے درجہ کے لوگ ہیں. البتہ کاظم قرہ بکر، نورالدین، یعقوب سوقی میں سے بعض کو سرسید اور بعض کو وقارالملک کا مرتبہ دیا جا سکتا ہے. مگر ان کے ہاتھ سے کام نکل چکا ہے، اور جس وقت تک یہ کامیاب ہوں گے اس وقت تک ملت کی اکثریت کی روح بدل چکی ہوگی. بالفاظ دیگر یہ کہ یا کامیاب ہی نہیں ہوں گے یا بیکار کامیابی کے مالک ہوں گے.

ترکی میں اسلام کی جگہ قومیت نے لے لی ہے. اور اس وقت عام ملک کی پرورش

نہایت خلوص، بے حد تن دہی اور انتہائی اہتمام کے ساتھ صرف قومیت کے مفکورہ (نظریہ) پر ہو رہی ہے. اسلام ایک مخرب آلہ ترکوں کے لئے سمجھا جاتا ہے جس کا نام لینا ان کی حکومت حتیٰ کہ ان کے وجود کے لیے قطعاً مہلک ہے. اس لیے حتی الامکان کوشش کی جاتی ہے کہ جلد سے جلد عام قوم اسلام کے مفکورہ سے ہٹ کر قومیت کی طرف پلٹ جائے. اور اس میں شک نہیں کہ ایک شخص جذباتی قوم کو قابو میں رکھ سکے. ترکی میں ایک طائفہ ہے جس کو سعید حلیم پاشا (شہید/ ۱۸۶۵-۱۹۲۱) صدر اعظم (۱۹۱۳-۱۹۱۷) نے (انجمن اتحاد و ترقی کے مقابل) ترتیب دیا تھا. یہ نہ صرف صحیح جذبات اور خالص اسلامی اصول کا پابند رہنا چاہتا ہے. اس میں بڑے بڑے دل و دماغ کے لوگ شریک ہیں مگر ابھی تک وہ بہت ضعیف ہیں.

حاصل یہ ہے کہ بحالات موجودہ ترکی ہمارے درد کی دوا نہیں ہو سکتی. اس کا تنزل حکومتی سچ پوچھئے تو ہمیں مضر نہیں، مگر اس کی قوت ترکی مسلمانوں کے لیے مہلک ہے. اگر موجودہ حکومت کو کفر لے لے (یعنی کوئی کافر حکومت قبضہ کر لے) تو نام کے اعتبار سے ہولناک واقعہ ہوگا، مگر حقیقت کے اعتبار سے اس سے زیادہ نہ ہوگا کہ ہندستان میں برطانیہ کی بجائے امریکہ کی حکومت ہو جائے؛ بلکہ شاید اجنبی حکومت عقائد اسلام کو اس قدر تیزی کے ساتھ ترکیہ سے مٹانا فرض نہ سمجھے جتنا کمالی سمجھ رہے ہیں.

یہ باقی دولتوں (ملکوں) کے لیے مشتے نمونہ از خرمن ماداری ہے. جس جگہ انسان حقیقت تک پہنچتا ہے ایک ہی حقیقت دیکھتا ہے. ایک آدمی اسلام کے لیے آنسو بہاتا نظر آتا ہے. اس کا دل معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے غم سے بھرا ہوا ہے. مگر تھوڑے سے تجربہ کے بعد معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ سب فریب کاری ہے. بلکہ اگر یہ کبھی لمبا سجدہ کرتا ہے تو ناپاک ہوتا ہے، امامت کرتا ہے تو جنابت کی حالت میں اور اس سب سے عوام کو ایک مدت تک دھوکہ میں رکھنا مقصود ہوتا ہے کہ وہ اسلام کی دشمنی کے افعال اگر اس سے دیکھ کر متوحش ہوئے ہیں تو پھر اپنے توحش میں مذبذب ہو جائیں اور اس کو اسلام پر کاری ضرب لگانے کی ترتیبات

کے لیے فرصت ہاتھ آ جائے.اس کے خلاف سب اخباری بیانات خالص پروپیگنڈا ہوتے ہیں جن پر لاکھوں کروڑوں روپیہ صرف کر کے نشر کئے جاتے ہیں.

آپ کو تعجب ہوگا کہ ترکیہ میں جو ملت سے روپیہ منظور کرایا کہ یورپ میں پروپیگنڈے پر صرف کیا جائے گا وہ بیشتر ممالک اسلامیہ میں محض اس مد میں صرف ہوا کہ کمال کی شقاوت پر مخالفت نہ ہو.مصر اور شام میں اخبارات جاری ہیں اور اس کے لئے بہت سے عربی اخبارات کو خطیر رقومات دی گئیں، یمن میں ترتیبات قائم ہیں اور ان کا وظیفہ کمالیوں کے لئے پروپیگنڈا کرنا ہے اور کسی کو اس کی اطلاع نہیں کہ یہ ترکی اخبار ہیں اور کمالیوں کے نمائندے ہیں.اس لئے دوسرے ممالک کے آدمی ان کو بے طرف (غیر جانبدار) سمجھ کر ان کا اعتبار کرتے ہیں.

ایک صدی پہلے کی اس تحریر سے کمال پاشا اور ترکی کے حوالے حذف کر دئے جائیں اور آج کے عالم اسلام پر ادھر سے ادھر تک ایک نظر دوڑائی جائے تو لگتا ہے جیسے یہ تحریر ابھی کل ہی سپرد قلم کی گئی تھی.

البتہ اسی کے ساتھ یہ خیال رہے کہ ترک عوام اور خواص الخواص نے اسلام کو ترک نہیں کیا تھا اور ساٹھ سال کی جاں گسل سیاسی جدوجہد کے بعد آخر کار انہوں نے اپنی اور اپنے دین کی بازیافت کر لی ہے.

ہندستانی رہنماؤں کے نام اس خط میں مولانا منصور انصاری مزید لکھتے ہیں:

۱- میں ہندستان سے دردمند دل لے کر نکلا اور ترکستان، روس اور ترکیہ و افغانستان و سرحد آزاد وغیرہ میں ایسے حالات دیکھے جن کے دیکھنے کا شان و گمان بھی نہ تھا.

آج کی انسانیت انس اور انسانیت سے عاری ہے.متمدن قومیں تک بھی بدترین درندوں سے زیادہ وحشی اور ہلاکت کے چوٹی کے دیوتا ہیں.تمام متمدن اقوام اپنی پوری دماغی اور جسمانی، مالی اور فنی قوتوں کو اس ایک شرمناک مقصد اور وحشیانہ ہدف نظر پر وقف

کئے ہوئے ہیں کہ دنیا، اس کے اہالی، اس کی آبادی اور سرسبزی کو جلد سے جلد تباہ و برباد کرنے کی کیا صورت ہے۔

اکیسویں صدی میں ارضی گرمی میں اضافہ، دنیا بھر میں موسمی بے ترتیبی، کئی کئی برس لگاتار چلنے والی مہلک اور لاعلاج نت نئی وبائیں، وسیع پیمانوں پر انسان کشی کی طویل مہمات اور خونریز جنگیں، ملکوں ملکوں عام جنسی وحشتنا کی جیسے سنگین عالمی تجربات سوسال پہلے کی اس تحریر کی صداقت کا ثبوت ہیں۔

میرے درد بھرے دل نے مجھے آمادہ کیا کہ اس انتہائی نکبت وزوال بشری کے ازالہ کی تدبیر سوچی جائے۔ دل کی آواز سے متنبہ ہو کر گہری سوچ کے بعد نظر آیا کہ اس بے سابقہ بربریت کی یگانہ علت قومیت پرستی کے فتنہ انگیز فلسفہ کی حاکمیت ہے۔ اس کے بعد میرے قلب پر وارد کیا گیا کہ اس عالم تباہ زہر کا تریاق صرف وصرف حکمت حکومتی قرآنی کی تدوین اور اس کی تبلیغ میں ہے۔ اس لئے میں خود کو سلطنت قرآنی کے ایک مبلغ کی حیثیت سے اپنے سید حبیب کی خدمت میں معرفی کرتا ہوں۔

سیدی حبیبی۔ اگر میری طرح جناب کو بھی میری تالیفاتی معروضات میں انگریزی دان طبقہ اور انگریزی زبان بنی نوع کے لئے کوئی قابل تبلیغ نور اور خدمتکارانہ صلاحیت نظر آتی ہو تو آپ انہیں ترجمہ انگریزی کے ذریعہ سے ان برگزیدہ طالبان سعادت کو ان کے حضور میں رسائی کی عزت پانے کے قابل بنادیں اور اگر ان میں یہ صلاحیت نہ ہو تو کالای زبوں بریش خاوند۔

دوسرے یہ کہ اس صورت میں اس کے سوا کیا عرض کرسکتا ہوں کہ
مائیم ورفیق ماغم ما

۲- فلسفہ حکومت الٰہی جمہوریت، اشتراکیت اور فسطائیت وغیرہ جیسا ایک دولتی نظریہ یہی نظریہ عالم انسانی کے بلندترین شرف کا محافظ اور اس کے حلقہ کے امن

وسلام کا ضامن ہے اور اس کے سوا تمام دولتی نظریات جیسا کہ اس وقت بشریت کے شرف وامان کے لئے سم قاتل ہیں. تجربات سے ثابت ہو چکا ہے لیکن اس کے باوجود عالم انسانی نے اسے بھلا کر اور دوسرے نظریات کا پرستار بن کر اپنے حلقہ میں ذلت افزا ہڑبونگ برپا رکھنے کا خود سامان کر رکھا ہے اور صحیح نظریہ دولتی سے بے خبری کے ساتھ وہ اس اپنی بربادی کے یقینی سامان کی حفاظت پر مصر بھی ہے، لیکن یہ زبردست نظام حضرت سید (احمد بریلوی) صاحب کی شہادت کے ساتھ ساتھ تقریباً برہم ہو گیا، اور آپ کے بعد حضرت مولانا ولایت علی صاحب وغیرہ کی مساعی اس کے احیاء میں بالکل بیکار ثابت ہوئیں.

عمل اور نظام عمل کا اتنے جلدی محو ہو جانا بالخاصہ جب کہ اس کا منبع حضرت شاہ ولی اللہ صاحب جیسے زبردست مجدد کا علم قرآن و حدیث ہو اور اس کے علمبردار حضرت سید (احمد شہید) صاحب، مولانا عبدالحی صاحب، مولانا اسمعیل ساحب، مولانا ولایت علی صاحب، مولانا محمد علی صاحب وغیرھم جیسے عدیم المثال مجاہد ہوں ایک نہایت حیران کن امر ہے. یہاں قابل غور و دقت صرف یہ امر ہے کہ اس نظام عمل کے اس کی کامیابی سے پہلے ناکام بلکہ محو ہو جانے کے عامل واسباب کیا ہیں.

ایک ناکام تحریک اور ناکام جماعت کی تاریخ اور ناکام رہنما کے سوانح حیات میں اگر اسباب ناکامی پر پوری روشنی نہ ڈالی جائے تو اس سعی تاریخی وسوانح کو ناکام تصور کرنا پڑے گا.

تحریک اُخوت ایمانیہ

عالم اسلام کے تیزی سے بدلتے حالات اور ایران وعراق سے اناطولیہ، الجزائر اور مراکش تک پھیلے ہوئے مسلم وعرب ممالک پر استیلا کے لئے بلادِ یورپ کی شبانہ روز کوششوں اور نت نئے فتنوں پر مولانا منصور انصاری کا ذہن بیدار تھا. وہ مستقل اس کے لیے کوشاں تھے کہ مفادامے میں کام کرنے والے سیاست دانوں اور مجاہدین کی کوئی ایسی جماعت تیار ہو ہر محاذ پر برسر پیکار ہو جو ان فتنوں کی سرکوبی کے لیے جانوں کا نذرانہ پیش کر سکے. وہ جہاں ایک طرف ہندستان کی آزادی کے لئے سربکف تھے وہیں دوسری طرف انگریزوں کے نوآبادیاتی جال سے تمام مسلم وغیر مسلم محکوم ومظلوم ایشیائی اور افریقی ممالک کی آزادی کے لئے سرگرم تھے. انہوں نے عالم اسلام کے کئی انقلابیوں سے مراسم بڑھائے تھے جو انگریزوں یا ان کے ایجنٹوں سے نبرد آزما تھے. اس مقصد کے لیے انہوں نے عالمی پیمانہ پر ایک تنظیم اخوت ایمانیہ قائم کی جو ترکی کی خلافت کی بقاء کے لیے بھی جدوجہد کر رہی تھی اور دیگر مجاہدانہ امور پر بھی نظر رکھے ہوئے تھی.

برصغیر جنوبی ایشیا کے دوسو سال کے سیاسی تجزیہ وتجربات اور مسلم مشرق کے غایر مشاہدات نے مولانا منصور انصاری پر یہ حقیقت واضح کر دی تھی کہ دنیا کی سیاسی وحشتنا کی، اقتصادی بدحالی، معاشرتی بے راہی، تعلیمی بےمقصدیت، علمی کھوکھلے پن کا بنیادی سبب انگلستان اور انگریز تھا.

تاریخی حقیقت یہ ہے کہ نت نئے فلسفیانہ افکار کے ہجوم بے امان میں خود انگریز اور باقی استعماری یورپ خود بھی قومیت کی مختلف اور جغرافیائی حدود میں بند تصور کا قیدی

تھا.اس عام تہذیبی بے راہ روی کو مطلوبہ استعماری مقاصد کے ماتحت سادہ لوح عوام کے دماغوں کو مسموم کرنے کی غرض سے اٹھارویں صدی میں در پردہ بھونپو ابلاغیہ وجود میں آ گیا تھا جس کو یورپ کے ہر ملک اور ہر سیاسی فلسفہ اور ساز مان نے گزشتہ دو صدیوں میں ڈھٹائی سے استعمال کیا اور اب تک کیا جا رہا ہے. اس ابلاغیہ نے یورپ کے عوام کو فکری لشکریت (regimentation) کے تابع کیا اور پھر وہی لشکریت خوبصورت پوشاکوں میں باقی دنیا کا سیاسی جبہ قرار پائی. اس مقصد کے لئے استعمار میں دبے ہوئے ہر ملک میں مقامی مصلحین تیار کئے گئے اور ان کو استعماری ابلاغیہ کی پشت پناہی اور پرشور پروپیگنڈا مہیا کیا گیا تا کہ اپنے معاشروں میں وہ قابل قبول اور قابل اتباع مقصود و محمود بن جائیں.

یہ تھا وہ پس منظر جس کے پردہ پر مولانا انصاری نے کمال اتاترک کی شخصیت کا چہرہ دیکھا تھا. اور اسی وجہ سے انہوں نے ایک اور خط ترکی میں سفیر افغانستان سردار عبد الہادی خان کے نام یکم ستمبر ۱۹۲۳ (۱۹ محرم ۱۳۴۲) کو تحریر کیا تھا جس میں انہیں ان سازشوں سے باخبر رہنے کا مشورہ دیا جو اسلامی ممالک کے خلاف انگریز استعماری کر رہے تھے. یہ علانیہ لوزان معاہدہ (Treaty of Lausanne) کی طرف اشارہ ہے جس پر ترکی کی عبوری قومی حکومت نے ایک سال پر پھیلے ہوئے ''مذاکرات'' کے نتیجہ میں سال بھر بعد ۲۴ جولائی ۱۹۲۳ کو دستخط کئے تھے.

عبدالہادی خان کے نام خط

مولانا منصور انصاری نے ۴ ستمبر ۱۹۲۲ کو سردار عبدالہادی خان کو لکھا:

کیا یہ خاموش بیٹھے رہنے کا وقت ہے؟ کرزن اور لائڈ جارج کوشش کریں گے کہ مفلوک الحال بے چارہ ترکی اپنی فتوحات کے ثمرات ونتائج سے بہرہ مند نہ ہو سکے. اس سلسلے میں جہاد عظیم فرض ہے.

اس زمانہ میں لائڈ جارج (Lloyd George) برطانیہ کا وزیر اول اور لارڈ کرزن (Curzon) برطانیہ کا سکریٹری آف سٹیٹ (وزیر خارجہ) تھا. یہ دونوں شخص دنیا سے نیک نام نہیں گئے.

مولانا منصور انصاری کا منشا تھا کہ دنیا کے مسلمان بطور امت ان استعماری خطرات کا مقابل کریں. وہ چاہتے تھے کہ افغانستان حکومتی سطح پر تحریک اخوت ایمانیہ کی امداد کرے. یہ تحریک جسے حسب توقع مسلم دنیا میں پذیرائی نہ ملی اس عہد میں ملی استحکام کی بقا اور استمرار کی ضرورت تھی. مگر مسلم دنیا میں کوئی نہیں رہ گیا تھا جو یورپی ٹکڑوں پر نہ پلتا ہو اور جو امت کے تصوری وجود کو بھی دل سے مانتا ہو. بے شک افغانستان بڑی حد تک آزاد تھا مگر وہاں عوام کی اکثریت بے علم اور حکومت عالمی یا ملی امور میں بے حقیقت اور بے اثر تھی.

امت کے وجود پر مولانا منصور انصاری کا اصرار بے وجہ نہیں تھا. پہلی عالمی جنگ کے استعماری فاتحین - برطانیہ، فرانس اور اٹلی - مسلمانوں کے عالمی اجتماعی وجود کی عمارت کو ڈھانے کے لئے ایک نیا منصوبہ سامنے لائے. ترکی سے خلافت اسلامیہ کے خاتمہ کو منوانے اور ترکی کو ایک عالمی بڑی طاقت کے بجائے علاقائی فقیر قوم قرار دینے کے لئے ۲۱ نومبر ۱۹۲۲ کو سوئزرلینڈ کے قصبہ لوزاں (Lausanne) میں مذاکرات شروع ہوئے تھے. اس سے دو ماہ پہلے ۴ ستمبر ۱۹۲۲/ ۲۱ محرم ۱۳۴۱ کو مولانا منصور انصاری نے ترکی میں افغان سفیر سردار عبدالہادی خاں صاحب کو ایک مکتوب ترکی کے انقلابی رہنما سید توفیق بک کے سلسلہ میں تحریر کیا تھا. اس میں لوزان مذاکرات کی بابت لکھا تھا:

> ترکی کی کامیابی کے بعد انگریز اور یورپ کوشش کریں گے کہ ثمرات سے ان کو محروم کر دیں. افغانستان، خلافت اور اخوت اس کے مقابلے میں جہاد کریں گے اس لیے مجاہدین اسلام یعنی اخوتِ ایمانیہ کے لئے خلافت کی بنیاد پر حکومتِ افغانستان سے امداد اور شخصی طور پر حکمراں طبقہ کی اس جہاد میں

موجودگی لازمی ہے.

سید توفیق بک کے بارے میں تفصیلی معلومات فراہم نہیں ہوسکیں. مجاہد انقلابی کے ایک خط سے اتنا پتہ چلتا ہے کہ توفیق بک استنبول میں قیام پذیر تھے اور مجاہدین کے درمیان رابطہ کا کام کرتے تھے. جب انقرہ کے مجاہدین کی ڈاک خفیہ، پولس سے محفوظ نہیں رہی تو سید توفیق بک کے پتہ پر خطوط جانے لگے. انہوں نے مولانا منصور انصاری کو اپنے خطوط کے جواب نہ پانے کی وجہ سے خطوط کے محفوظ ہونے پر شبہ کا اظہار کیا تھا. مجاہد انقلابی نے یہ خط ۲۹ دسمبر ۱۹۲۲ کو لکھا تھا لیکن ۱۲ فروری ۱۹۲۳ کو ارسال کیا گیا تھا. اتنی تاخیر غالباً اس بنا پر ہوئی کہ ان صاحب نے پہلے ڈاک کے محفوظ ہونے کا راستہ توفیق بک صاحب کے ذریعہ تلاش کیا، انہیں اعتماد میں لیا اس کے بعد خط روانہ کیا. خط کی پیشانی پر ۲۹ دسمبر ۱۹۲۲ تحریر ہے لیکن نیچے جہاں توفیق بک کا حوالہ دیا گیا ہے وہاں ۱۲ فروری ۱۹۲۳ درج ہے.

خط کا انداز بتا رہا ہے کہ مولانا محمد میاں ان دنوں انقرہ پہنچ گئے تھے اور استبول میں انقلابی مرکز بنانے کے خواہشمند تھے لیکن سلطنت عثمانیہ کے خاتمہ کے بعد نئی قومی حکومت کا قیام بڑے انتشار کا زمانہ تھا اور نئے حکمراں عثمانی خاندان اور خلافت اسلامیہ کا نام تک سننے کے روادار نہیں تھے. یہی حال شام، لبنان، عراق اور نجد وحجاز کا تھا جہاں اسلامی وحدت پر یورپی قومیت کے فلسفہ کو ترجیح حاصل ہوچکی تھی. مسلم دنیا سے عمل کی قوت مفقود ہوچکی تھی اور ہر جگہ ردعمل کی سیاست کا دور دورہ تھا. عرب اپنے تمام مسائل کا سبب ترکوں کو سمجھتے تھے. عرب بغاوت اور ترکی سے کھلی دشمنی کی وجہ سے ترکی کے نئے حکمرانوں کو نہ عربوں سے دلچسپی رہی تھی اور نہ اسلام سے.

ان حالات میں مولانا منصور انصاری کے لئے نئے ترکی میں کام کرنا ممکن نہیں رہ گیا تھا. وہاں اول تو کوئی ان کا ہمنوا نہیں تھا اور جو تھے ان کے پاس کچھ کر دکھانے کی قوت تھی، نہ حوصلہ، نہ امکان. وہ ایک شدید بحرانی زمانہ تھا جس میں مثبت اقدامات کی راہیں

دھندلا گئی تھیں. دنیا کے مسلمانوں میں ایک دوسرے کے خلاف شکوک وشبہات کی فضا تھی جس کے لئے یورپی سیاست داں اور فوجی سالار ایک مدت سے کوشاں تھے. باہمی بے اعتمادی کا یہ گرد وغبار باران فراست کے بغیر بیٹھنے والا نہیں تھا مگر آسمان شعور پر دور دور تک بادلوں کا پتا نہ تھا. عناد کی اس فضا سے بددل ہوکر مولانا منصور انصاری نے ترکی کو مستقبل کے کسی موہوم زمانہ کے حوالہ کر کے خیر باد کہہ دیا.

باب/ عالم اسلام

انقلاب ترکی

خلافت عثمانیہ کے ملبہ پر ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۳ کو جمہوریہ ترکیہ کی عمارت اٹھائی گئی. بظاہر یہ ایک طویل بحران کا نقطۂ اختتام تھا جو سہ شنبہ ۲۷ اپریل ۱۹۰۹ کو سلطان اعظم عبدالحمید خاں ثانی کی جبری معزولی کے ساتھ زیادہ سنگین ہو گیا تھا.

اس واقعہ کے پانچ سال تین ماہ بعد ۲۸ جولائی ۱۹۱۴ کو پہلی عالمی جنگ کا پہلا گولہ داغا گیا تو زوال کی ڈھلان پر یورپ نے پہلا قدم رکھا اور دنیا ایک بڑی تباہی کی راہ پر نکل گئی.اس عالمی بحران سے باہر نکلنے کے لئے ترکی کو ایک انقلاب کی ضرورت تھی.ترکی کی سیاست سے پہلے وہ انقلاب دماغوں میں آچکا تھا.ایرانی امریکی عیسائی مورخ یحی ارمجانی نے ترکوں کے تاریخی مزاج کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ

> اسلام سے ترکوں، خصوصاً ترکان اناطولیہ، کا تعلق ''عقلی سے زیادہ جذباتی تھا'' اور ان کے ہاں اسلام سے غیر مشروط وفاداری کو اسلام کے فہم پر فوقیت حاصل تھی. Armajani, Yahya, Middle East - Past and Present, New Jersey, 1970, p 136

سلطان عبدالحمید خاں ثانی کے دور حکومت میں فرانس وغیرہ کے عیسائی مدارس میں تعلیم پانے والے جدت پسند ترکوں کا اسلام سے تعلق ''جذباتی سے زیادہ عقلی'' ہو گیا تھا اور ''اسلام کے فہم کو اس سے 'غیر مشروط وفاداری'' پر ترجیح حاصل ہو گئی تھی. چنانچہ عقل کا تقاضا تھا کہ جنگ عظیم میں ترکی کی شکست کے بعد اس عظیم مملکت کو ممکن حد تک بچانے کے لئے سیاسی انقلاب ناگزیر بھی تھا اور اس کے لئے میدان بھی ہموار کیا جا چکا تھا.البتہ یہ انقلاب عالم

اسلام میں ایک نئے بحران کا نقیب تھا اور اناطولیہ سے افغانستان تک مسلمان اس عالمی آشفتگی کا شکار ہوئے جس میں بہترین ملی عقلیں چرخ ہوگئیں. تاریکی بڑھتی جارہی تھی، راستے ناپید تھے، منزلیں موہوم تھیں.

جنوبی ایشیا میں علی برادران کی خلافت تحریک خود خلافت عثمانیہ کے ساتھ تاریخ کا حصہ بن چکی تھی اور نئے ترکی کے بارے میں خیالات کی کشمکش نمایاں تھی تحریک آزادی اور تحریک خلافت کے محاذ جامعہ ملیہ اسلامیہ کو بند کردینے کی خبریں بھی گشت کررہی تھی. ان حالات میں مولانا منصور انصاری نے کابل سے دہلی میں اپنے ایک دوست ماسٹر محمد شعیب قریشی کے نام ایک خط میں بہت سے عالمی مسائل کا تذکرہ کیا تھا.

محمد شعیب قریشی کے نام خط

۱۹ رجب ۱۳۴۳ھ/۱۳ فروری ۱۹۲۵

محترمی ومکرمی جناب بھائی ماسٹر محمد شعیب قریشی صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ! مسرور ہوں کہ اولین نامہ جناب کی خدمت میں اپنے ایک خاص دوست کے تعارف کے لیے لکھ رہا ہوں. عالی جناب محترم مرزا باز محمد خان صاحب (مدیر شعبہ ہند، وارد وزارتِ جلیلۂ خارجیہ کابل) آپ کے یہاں افغانی قونصل ہو کر تشریف لاتے ہیں. میں امید کرتا ہوں کہ آپ ان سے مل کر نہایت مسرور ہوں گے. جناب موصوف کابل میں ہندستانیوں کے خاص معاون اور مہربان رہے ہیں.

پرسوں جناب خواجہ عبدالحیٔ صاحب شیخ التفسیر جامعہ ملیہ علی گڑھ کے نامۂ گرامی سے جامعہ ملیہ کے بند کرنے کا فیصلہ معلوم ہو کر بہت افسوس ہوا. انا للہ وانا الیہ راجعون.

مہاتما گاندھی کی غیر متوقع پسپائی حسرت افزا ہے، البتہ اس کے مقابل مسلمانوں میں تنظیم کی ابتدا (غالباً جمعیۃ علماء ہند کے قیام کی طرف اشارہ ہے) جس سے اشک شوی

ہوتی ہے. زندگی کا یہ واحد راستہ ہے.

روس و جاپان کا اتحاد اور چین کا اس اتحاد کا یقینی آلہ ہونا جن متوقعہ آنے والی ذمہ داریوں کا ہمارے لئے اعلان کرتا ہے مدبرین اور جانفروش مسلمانان ہند اس سے غافل نہ ہوں گے. اِن شاء اللہ تعالیٰ.

میں دس سال افغانستان کے علاوہ یاغستان، بخارا، تاشکند، سمرقند، روس، قفقاز، ترکیہ میں خوب پھرا. ڈیڑھ سال سے کابل میں قیام پذیر ہوں. میری آوارگی کا حاصل صرف ایک خیال ہے کہ سو سال سے جو ہم نے کیا وہ تضیع وقت اور خلاف واقعہ خوش اعتقادیوں کا پروپیگنڈا تھا. اور یہ کہ اسلامی بقا اور ترقی کے لئے اول تنظیم داخلی اور پھر تنظیم صحیح خارجی ہے جس کے زور سے ہم اپنے برداران یوسف میں رہ کر مغرب سے خلاصی پا سکیں اور مشرقی خطرات کے مقابلہ میں مغلوب نہ ہو سکیں.

وفد ہلال احمر ترک کے ہمراہ سید توفیق بک بصری اول آئے تھے اور اب بھی بطور ترجمان (دہلی) آنے والے ہیں. وہ ایک راستباز ترکی جماعت کا خاص آدمی ہے. آپ اس پر ترکی مسائل میں اعتماد فرمائیں. شاید پہلے سفر میں ہندستان گیا ہے جو دوبارہ آرہا ہے. سید توفیق بک کو میرا سلام بھی فرما دیجئے.

کیا میں آپ سے سوال کر سکتا ہوں کہ آپ ان تصریحات کے بعد جو کمالیوں نے کر دکھائیں کب تک اپنا پاک سرمایہ لگاتے رہیں گے. میں اس سوال کی جرأت زیادہ تر اس لئے کرتا ہوں کہ ان کے زمانہ میں بندہ انگورہ (انقرہ) میں تھا.

میرا عرصہ سے ارادہ رہا کہ جناب سے خط و کتابت کروں لیکن اپنی بدنامی کی وجہ سے متأمل رہا کہ اس کا کوئی برا اثر مرتب نہ ہو.

میں نے انگورہ (انقرہ) میں رہتے ہوئے بہت سعی کی کہ مسلمانان عالم کی مرکزیت کو کرزنی (Lord Curzon's) ٹھوکر سے پاش پاش نہ کیا جائے لیکن سود مند نہ

ہوا. کیونکہ ایسا کرنا حکومت (ترکیہ) کے غیر متغیر اصولوں میں داخل ہو چکا ہے. کمالیوں کی بیہودہ کاری اور اسلام کشی سے خود عوام ترک نالاں ہیں مگر ان کے ہاتھ میں نہ اب کچھ ہے اور نہ بعد میں کچھ آنے کی امید. یہ میرا پختہ خیال ہے. کمال، (علی) فتحی (اوکیار ۱۸۸۰-۱۹۴۳)، عصمت (انونو ۱۸۸۴-۱۹۷۳) کو اگر اپنے زوال کا احتمال ہوا تو محض اس لئے کہ رؤف بک، کاظم قرہ بکر پاشا (۱۸۸۲-۱۹۴۸)، نورالدین (ابراہیم) پاشا (۱۸۷۳-۱۹۳۲) کی ہمتیں دوسری طرف مصروف ہو کر ضائع ہو جائیں اور ترکیہ کو کسی غیر متوقع جنگ میں دھکیل دیں گے. نعوذ باللہ.

میرے خیال میں کمالیوں کی بربادکن مردانگی نے ہم کو اس قابل بنادیا ہے کہ ہم سوچ سکیں کہ سب سے اول ہم کو اپنے لئے قوت کا پورا سامان کرنا چاہیے. ہنود کا رویہ، جاپان چین اور بلشویزم کے مہیب خطرات بھی اس کے پرزور دواعی ہیں. ہر زمانہ میں مادہ پرست عناصر قوت اور صرف قوت کے سامنے سربسجود ہوئے ہیں، تو آج کہ خالص مادہ پرستی کا عالم ہے اور حق پرستی کا کال، (تو) اس کے خلاف کیسے ہوسکتا ہے. لہٰذا تنظیم کا خیال مبارک ہو. آپ تنظیم کے بعد ہی داخل اور خارج میں بات کرنے کے قابل ہو سکتے ہیں. امید ہے امور لائقہ سے یادوشادماں فرمائیں گے.

آخر میں حضرت معظم مولانا شوکت علی صاحب (یسیر) کی خدمت میں سلام عرض کرتا ہوں اور جناب بھائی حکیم سعید صاحب گنگوہی و جناب مولوی حکیم محمد ابراہیم صاحب جودھ پوری کی خدمت میں تبلیغ سلام کی تکلیف دیتا ہوں.

فقط والسلام مع الاکرام. سائر رفقائے کار بندہ کا سلام مسنون قبول فرمائیں.

آوارۂ ہندوستان ابوالحامد محمد میاں انصاری عرف منصور

میرا نشان: کابل. وزارت جلیلۂ معارف. منصور انصاری

(مجھے یہاں کوئی اصلی نام سے نہیں پہچانتا)

خلافت اور مسلمانان ہند

پہلی عالمی جنگ کے بعد وہ جسے بعد میں مسلم دنیا کا عزت مندانہ لقب دیا گیا ایک بے راہ و بے منزل انبوہ تھی. مسلمانوں کی اجتماعی سیاست کا باب بند ہو چکا تھا اور اس ہجوم سے ابھر کر آنے والی قومیتیں سب جنگ کے یورپی فاتحین و مفتوحین کی حلقہ بگوشی پر مجبور اور اکثر نازاں تھیں. ہندستان کے مسلمان اس عالمی انتشار سے متاثر تھے.

ترکی سے مسلمانان جنوبی ایشیا کی محبت کچھ خلافت تحریک کا نتیجہ نہیں تھی، بلکہ تحریک خلافت اس محبت کے اظہار کا ایک طریقہ تھی جو اس خطہ کے مسلمانوں کو ترکوں سے تھی. اس لئے خلافت عثمانیہ کے خاتمہ کے بعد وہ گومگو کی کیفیت میں تھے. سقوط خلافت سے وہ غم زدہ بھی تھے اور نئی ترک حکومت کو محبت کی اسی نظر سے دیکھتے تھے جو صدیوں سے ان کی روایت تھی. نئے ترکی کا داخلی انتشار ان کے سامنے نہیں تھا.

تحریک خلافت میں مسلمانان ہند کی پر جوش شمولیت کو وقت کی اہم ضرورت سمجھتے ہوئے مولانا محمد میاں منصور انصاری کا خیال تھا کہ اس مسئلہ پر عجلت میں نہ کوئی فیصلہ کیا جائے اور نہ بیانات دئے جائیں کیونکہ امت کی صفوں میں ایک طبقہ موجود تھا جو بظاہر اس تحریک میں لگا ہوا تھا لیکن اس کی ہمدردیاں کمال پاشا اور ان کے رفقا کے ساتھ تھیں. اس لئے مولانا منصور انصاری کی رائے تھی کہ مسلمانان ہند سوچ سمجھ کر حالات کی نزاکت اور وقت کے تقاضوں کو نظر میں رکھتے ہوئے دور اندیشی سے فیصلے کریں.

اس موضوع پر انہوں نے ہندستان کے ملی اخبارات کو ایک مقالہ مذکورہ بالا عنوان سے بغرض اشاعت بھیجا تھا. اس تحریر پر ۲۵ نومبر ۱۹۲۳ کی تاریخ ہے. اس میں انہوں

نے اشاروں میں ان سازشوں کی نشان دہی کی ہے جو کچھ ہندستانی رہنما در پردہ کمالیوں کے لئے انجام دے رہے تھے. حالات اور شخصیات پر طنز و مزاح کا پیرایہ اس خط کی خوبی ہے.

اس مقالہ میں ایک اہم نکتہ بار بار بیان میں آتا ہے کہ ہندستان سے مسلمانوں نے کمال پاشا کی خدمات کی تحسین کرتے ہوئے ان کو ایک مرصع تلوار اور دو عدد طیارے تحفے میں بھیجے تھے. مرصع شمشیر پر تو ایسا خرچ نہ آیا ہوگا کہ ۱۹۲۳ میں غلام ہندستان کے نادار مسلمانوں کی قوت برداشت سے باہر ہو، لیکن دو عدد طیاروں کی خرید ضرور قابل توجہ ہے.

مولانا منصور انصاری اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

مسئلۂ خلافت

مجھے افغان شہری ہونے کی وجہ سے قانوناً ہندستانی معاملات میں دخل دینے کا حق نہیں ہے اور نہ ہی میں اس قابل ہوں کہ اخباری دنیا میں خود کو پیش کروں. میں گمنامی کی زندگی بسر کرنے والا ایک آدمی ہوں اور اس لئے کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا کہ ہندستانی مسلمانوں پر میری ان چند معروضات (جو کہ محض اسلامی عمومی فائدہ کے نظر سے لکھی گئی ہیں اور جن کے لکھنے کا ہر مسلمان کو حق ہے) کیا اثر پڑے گا.

آج کل ہندستانی اسلامی اخباروں میں خلافت کا مسئلہ موضوعِ بحث ہے. میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اس نازک موقع پر ایک مسلمان کی حیثیت سے یہ عرض کروں.

اس وقت جرائد میں قابل دقت چند امور ہیں جن پر میں الگ الگ مگر نہایت مختصر اور اشارات کے طور پر عرض رائے کروں گا.

مسلمانان ہند اور بے اقتدار خلافت

مسلمانان ہند کی عظیم الشان امدادوں کے بعد مجھے سخت تعجب تھا کہ مصطفٰے کمال پاشا نے ان کی رائے کو ٹھکرا کر کیوں اقتدار کو خلافت سے چھین لیا مگر میرا تعجب جناب منیر بک

مشاور قانونی وکالت (وزارت خارجیہ) انقرہ کی ملاقات کے بعد دور ہوکر معلوم ہوگیا کہ خلافت کی بے اقتداری میں مسلمانان ہند کی امداد بھی مصطفٰے کمال پاشا کی پشت پناہ رہی ہے.

جناب منیر بک مجلس لوزان(Lausanne Conference 1922-23) میں عصمت (انونو) پاشا کے ساتھ مشاور قانونی کی حیثیت سے آخر تک شریک رہے ہیں. عصمت پاشا، جبکہ مجلس اول لوزان کے (اجلاس) میں تشریف لے گئے تھے تو یہی منیر بک ہمارے لندن سے جانے والے مسلمان ہندستانیوں کے ترجمان بھی رہے تھے. جب وہ انقرہ سے لوزان کی دوسری کانفرنس میں جارہے تھے تو میں نے ان سے اثنائی (باہمی) ملاقات میں کہا کہ حکومت کمالی نے خلافت کو بے اقتدار کردیا ہے. یہ ٹھیک نہیں ہوا اس سے ہندستان میں بہت برا اثر پڑے گا.

منیر بک نے میرے اس فقرہ پر حیرت کا اظہار کر کے کہا کہ ہم پیرس میں مسلمانان ہندستان سے (جو کہ لندن سے آئے تھے) مفصل گفتگو کر کے فیصلہ کر چکے ہیں. مسلمانان ہند نہ صرف خلافت وسلطنت کی تفریق کو نہایت گرم جوشی کے ساتھ سراہتے ہیں بلکہ وہ اس مسئلہ میں مصطفٰے کمال پاشا کی امداد کا آخری دم تک وعدہ بھی کرتے ہیں.

میں ہندستان کے تازہ افکار سے واقف نہ تھا۔ نہ مجھے ہندستانی مسلمانوں کی افکار کی ترجمانی کرنے کا کوئی حق حاصل تھا، اس لئے میں صرف شخصی طور پر اس قدر کہہ سکا کہ گمان کرتا ہوں کہ یہ لندن والے ہندستانی مسلمانوں کا ذاتی خیال ہے. آپ اس پر ذرا سوچ سمجھ کر اعتماد کریں. میں اپنی سابق معلومات کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ اب تک مسلمانان ہند نے جو کچھ بھی مسئلہ خلافت میں ترقی کی ہے کمالی حکومت ضرب لگا کر اسے پاش پاش کر رہی ہے.

وفد ہند انقرہ کو

ہندستان سے ایک وفد مسئلہ خلافت پر گفتگو کرنے کو انقرہ جانے والا بتایا جاتا ہے جو مصطفٰے کمال پاشا کے لئے شمشیر مرصع اور حکومت کے لئے دو طیارے بھی لے جائے

گا.اس موقع پر اول میں وفد کی کامیابی کے متعلق ایک نہایت موثر تدبیر عرض کر دینا اپنا فرض خیال کرتا ہوں.

یہ محترم ومقدس وفد مصطفٰے کمال پاشا کی حضور میں بھی (لارڈ کرزن کی طرح) خلافت کو اقتدار دینے کے لئے عریضۂ عبودیت پیش فرمائے گا، اس لئے ضروری ہے کہ وفد اول لندن کی وزارت خارجیہ کے ایک کلرک سے مصطفٰے کمال پاشا کی محترم بی بی لطیفہ خانم کے لئے ایک سفارشی چٹھی حاصل کرے. اگر ایسا کیا گیا تو کامیابی یقینی ہے اور اگر خدانخواستہ لندن کی وزارت خارجیہ کی پالیسی خلافت کے متعلق وہی معلوم ہوئی جو پہلے تھی تو سفارتی چٹھی نہ مل سکے گی اور وفد کے لئے انقرہ بھی لندن ثابت ہوگا. وہاں یہ خوف ضرور ہے کہ ہندی وفد کے بعض فنافی العبودیت ارکان غازی اعظم (کمال پاشا) کی سحر ازیوں کی تاثیر سے لندنی سیاست کے لئے بارگیر بن کر ہندستان میں داخل نہ ہوں.

ہدیۂ شمشیر مرصع

منجی خلافت (خلافت سے نجات دلانے والا) غازی اعظم مصطفٰے کمال پاشا کے لئے مسلمانان ہند ہدیۂ شمشیر مرصع تجویز فرماتے ہیں. بے شک پاشا موصوف کے عظیم الشان جہاد نے ترکیہ سے خلافت کو نکال کر ایک خالص ترکی حکومت قائم فرمالی ہے. اس حیرت انگیز کارنامہ پر لاریب انہوں نے خلافت مبینہ کو دنیاوی خرخشوں سے نجات دے کر اپنی ذات کو نہ صرف منجی خلافت اور غازی اعظم جیسے مدہش (حیرت انگیز) خطابات کا مستحق ثابت فرمایا ہے، بلکہ وہ شمشیر مرصع کو عالم اسلام کی طرف بطور خراج تحسین وآفریں وصول کرنے کے بھی قابل ہو گئے ہیں.

مگر سخت ناانصافی ہوگی اگر برادران ہند اس موقع پر مجدد الوقت، منجی خلافت غازی شریف حسین کی اسی قسم کی عظیم الشان خدمات کو فراموش کر کے ان کی بارگاہ اقدس میں بھی عریضۂ عبودیت کے ساتھ ایک شمشیر مرصع تقدیم (پیش) نہ فرماویں گے.

شاہ حجاز (حسین، شریف مکہ) تو، اس وقت کہ مصطفٰی کمال پاشا کو اس قسم کا خواب وخیال تک نہ آتا تھا، عظیم الشان جہاد فرما کر عرب کو خلافت سے نکال چکے ہیں اور ایک ہاشمی دولت (ریاست) قائم فرما کر نہ صرف حجاز کے بار سے بلکہ عراق، یمن، عسیر، نجد، سیریا (شام) وفلسطین وغیرہ کے جھگڑوں سے خلافت مبینہ کو نجات دلا چکے ہیں.

مصطفٰی کمال پاشا کو ہم متمم نجات خلافت کہہ سکتے ہیں مگر اس وصف میں شاہ حجاز مجدد الوقت اوران سے کہیں اسبق (بڑھ کر) ہیں اور **والفضل للمتقدم** قانون عطا اور بخشش ہے، پس کوئی وجہ نہیں کہ مصطفٰی کمال پاشا کو تو شمشیر مرصّع ہدیہ دی جائیں اور شاہ حجاز اس سے محروم رہیں.

حضرات!

وہی فتنہ ہے لیکن یاں ذرا سانچے میں ڈھلتا ہے

دو عدد طیارے

حکومت مستقلہ (آزاد) ترکیہ کے لئے (جو مصطفٰی کمال پاشا کی عرق ریزیوں کا حاصل ہے) مسلمانان ہند دو طیارے ہدیہ لے جانے والے ہیں، مگر حیرت ہوتی ہے کہ اس قسم کی بخششوں میں دولت مستقلۂ عربیہ (آزاد عرب ریاست) کا نام بالکل نہیں آتا (جو ایک آل رسول کی جانفشانی کا حاصل ہے). بلا شبہ شریف حسین نے خلافت سے بعد از بیعت خلافت اور عرب کو جدا کر کے خلافت کو اس سے نجات دلائی ہے اور اس نجات دہانی میں خونریزی بھی ضروری ہوئی اور شریف نے کافروں سے بھی اس مسئلہ میں مدد لی ہے. ان میں سے کوئی بھی ایسی بات نہیں ہے جس میں ہمارے غازی اعظم شریف (حسین) صاحب سے پیچھے رہے ہوں.

غازی اعظم (شریف حسین) خلیفہ عبد المجید خاں (اول-۱۸۲۳-۱۸۶۱) کی خلافت پر بیعت رکھتے ہوئے ترکیہ کو ان کے ہاتھ سے نکال کر خلافت کو اس سے نجات

دلاتے ہیں اور ان کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو یونان کے ساتھ خونریز جنگ صرف اس لئے نہ تھی کہ ترکی سے یونان کا اخراج ہو بلکہ اس جنگ میں ایک مقصد مہم یہ بھی مضمر تھا کہ ترکی سے خلافت کا اخراج بھی یونان کے ساتھ ساتھ کیا جائے اور چنانچہ ایسا کیا گیا اور اس کے لئے غازی اعظم (شریف حسین) نے اول اول (اس وقت انگلستان ان کو منہ نہ لگا تا تھا) اس پر اٹلی اور فرانس سے امدادیں لیں اور جس وقت کہ انگریز چشم شفقت سے ان کو دیکھنے لگے تو وہ فوراً لارڈ کرزن کی گود میں جا بیٹھے. اور اب وہ پرانے یاران طریقت کو بھول کر بھی یاد نہیں فرماتے.

اس تشریح کے بعد کیا ہم یہ نہیں یہ کہہ سکتے ہیں کہ، حضرات

وہی فتنہ ہے لیکن یاں ذرا سانچے میں ڈھلتا ہے

ہاں یہ ممکن ہے کہ یہ طیارے مقام خلافت اور یا ذات حضرت کی حفاظت کی خاطر حکومت مستقلہ ترکیہ کو دیئے جا رہے ہیں. لیکن جبکہ کمال پاشا نے خلافت اسلامیہ کو لارڈ کررزن کے فتوٰی کے موافق قائم کر کے قسطنطنیہ کو مقام خلافت قرار دیا اور مجلس سابق نے اصرار کیا کہ خلیفہ عبدالمجید (ثانی) آفندی کا مجلس سے بیعت لینے کے لئے انقرہ آنا ضروری ہے تو مصطفٰے کمال پاشا نے اس خوف سے کہ خلیفہ رئیس مجلس ہو جائے گا ان کو کسی طرح سے آنے نہ دیا. ادھر درۂ دانیال کو کہ جس کے سر پر مقام خلافت واقع ہے بے پناہ منظور فرمالیا تو اس سے تصریح ہوتی ہے کہ اب مقام خلافت کے لئے کوئی خطرہ خارج سے نہیں ہے ورنہ پاشائے موصوف (ہندستانی اعتقادات راسخہ کے مطابق) ضرور یا تو خلیفہ صاحب کو قسطنطنیہ بلا لیتے یا درۂ دانیال کی حفاظت کا کوئی سامان فرماتے تو اس غرض کے لئے (جو کہ حاصل ہے) طیارے دینا ضرور عبث ہے. اور اگر طیارے تقدیم (پیش) کرنے کا یہ مقصد ہو کہ کہیں خلیفہ معظم اپنی بے اقتداری سے بے محل متاثر ہو کر حکومت مستقلۂ ترکیہ کے خلاف کوئی حرکت فرما کر خائن اسلام نہ بن بیٹھیں، یہ وجہ بظاہر معقول تو ہے مگر لاعلمی احوال پر مبنی

معلوم ہوتی ہے. میں مسلمانان ہند کو یقین دلاسکتا ہوں کہ غازی اعظم (کمال پاشا) نے جو فوج خلیفہ کے احترام کے نام سے ان کے گرد رکھی ہے وہ ان کے شر سے حفاظت کے لئے بالکل کافی ہے. اس فوج کے ہوتے ہوئے حضرت خلیفہ کوئی حرکت کرنا تو کجا پاشا کے خلاف ایک صحیح حرف تک فرمانے کی مجال نہیں رکھتے.

علاوہ ازیں غازی اعظم (کمال پاشا) کے دور میں تدبر نے جنگ یونان کے زمانہ میں ہی ملت ترک سے اس بہانہ سے اسلحہ ضبط فرمالئے تھے کہ ان کی حکومت کو یونان کے مقابلہ کے لئے ان کی احتیاج ہے. عام ملت ترک جو (غازی اعظم کے خیال میں) اپنی کہنہ مغزی اور بدقسمتی کے باعث خلافت کی دلدادہ رہنے کی گمراہی میں رہ کر قصر تنزل کی طرف چلی جارہی ہے وہ آج ہندستان کی طرح نہتّی ہے.

رہا فوج کا معاملہ تو اس کو آج سے دس سال پہلے کی ہندستانی فوج کا نمونہ سمجھ لینا چاہئے. اگر اس وقت وہ اسلحہ لینے کی اصلی غرض کو سمجھے بھی تو سوائے تن بہ تقدیر رہنے کے اور کیا کر سکتے ہیں. غازی اعظم (کمال پاشا) نے اس میدان میں بھی پوری طرح حفظ ماتقدم کا ثبوت دیا ہے. جس کا ملخص یہ ہے کہ جس طرح ہوسکا سب کی آنکھوں میں دھول جھونک کر فوج کے قائد اعظم کا رتبہ حاصل کیا اس کے بعد علی احسان پاشا (۱۸۸۲-۱۹۵۷/ جنگ موصل کے بعد انگریزوں نے عراق کے اس عثمانی سالار کو مالٹا میں نذر زنداں کر دیا تھا) جیسے زبردست اور ہردلعزیز جرنیل کو فوج سے نکالا اور اب یعقوب پاشا اور نورالدین پاشا جیسے جرنیلوں کو جو فتوحات کے روح رواں اور حسّ اسلامیت رکھنے کے مجرم تھے خانہ نشین کر دیا گیا ہے، اور عصمت (انونو) پاشا جن کے ہاتھ میں عمومی کمان تھی فتوحات کے بعد فوراً خارجی کاموں کے لئے موزوں ثابت ہوئے. اس لئے اب کسی طرف سے بھی کی گئی کوئی کوشش ان کو سودائے اقتدار دنیاوی کی طرف مائل نہیں کرسکتی. اس لئے مسلمانان ہندستان بالکل غم نہ فرمائیں اور اپنے دوطیاروں کا محل خرچ دوسرا مقرر کریں.

میرے بھائی (ہندستانی) یقیناً میرے کہنے سے یہ طیارے دولت مستقلہ ہاشمیہ کواس کے سابقیت کے عظیم الشان رتبہ کی بنا پر نہ بخشیں گے، لیکن میری اس عرض سے اگر وہ اتنا ہی قائل ہوسکیں کہ ترکیہ کے لئے یہ طیارے دینے بے کار ہیں تو میں سمجھوں گا کہ خالی جوش کی بات نہیں بلکہ ان میں کچھ نہ کچھ سمجھ بھی باقی ہے.

مولانا آزاداور جمہوریہ ترکیہ

فخر مسلمانان ہند حضرت مولانا ابوالکلام کی بے حد حرمت میرے دل میں ہے اور اس لئے لازم ہے کہ ان کے گول مول فتویٰ کو جو جمہوریت ترکی کے لئے انہوں نے صادر فرمایا ہے قبل از تحقیق عجلت اور دور بیٹھی ہوئی عقیدت کا محصول دیکھ کر مولانا معظم کی خدمت میں عقیدت مندانہ کچھ عرض کروں.

لفظ جمہوریت کی تشریح کے متعلق عرض ہے کہ ایک جمہوریت تو اسلامی تعلیم سے خلق کو معلوم ہوئی جس کے رئیس اول رسولؐ علیہ السلام کو یا حضرت ابوبکر صدیقؓ کو کہہ سکتے ہیں، اور ایک جمہوریت آج کل امریکہ فرانس روس وغیرہ میں معمول بہا ہے.

جمہوریت اسلامیہ میں قانون اسلام اس کا اساسی قانون ہوتا ہے. اس جمہور کے اختیارات اسلامی احکام کے ساتھ الی الابد مقید ہیں. مگر دوسری جمہورتیں اس قید سے بالکل آزاد ہیں. جمہوریت کی ان دونوں قسم (جمہوریت مقید اور جمہوریت غیر مقید) کے علاوہ ایک تیسری بھی قسم ہے. جس کو جمہوریت شخصی کہنا زیبا ہے. جس کے سمجھنے کے لئے ایک واقعہ عرض کرتا ہوں.

چند سال پہلے پانچ ہندستانی حضرات کا ایک وفد کسی مملکت کی تحقیقات پر مامور ہوا. اس وفد نے اپنے اندر سے ایک محترم ذات کو امیر سفر منتخب فرمالیا. اتفاق سے امیر صاحب سفر میں اکثر اپنے یاروں سے مخالف رہا کرتے، اور ایسے مواقع پر بھی کہ ان کے چاروں

رفیقان سفر کسی معاملہ میں متفق الرائے ہوتے وہ ہمیشہ شکایت فرماتے تھے کہ آپ صاحبان جمہور کی رائے کا لحاظ نہیں کرتے. بالآخر شریکان سفر مجبور ہوئے اور امارت کے ساتھ ان کی تنہا ذات کو جمہور کا خطاب بھی دے دیا.اور اس کے بعد ہر مشورے میں جبکہ ان کی شخصی رائے مطلوب ہوتی تھی تو ان سے یوں سوال کیا جاتا تھا کہ فرمائیے اس میں جمہور کی کیا رائے ہے؟

اب میں حضرت مولانا ابوالکلام صاحب کی خدمت میں آزادانہ عرض کرتا ہوں کہ حضرت نے آیا پوری تحقیق فرمالی ہے کہ جمہوریہ ترکیہ ان تینوں قسموں سے کون سی قسم کی جمہوریت ہے.

شاید بعض حضرات قانون اساسی جمہوریہ ترکیہ پیش فرما کر فرمائیں کہ یہ جمہوریت اپنا مذہب اسلام لکھتی ہے، یا معاہدہ لوازن (Treaty of Lausanne) میں انہوں نے ترک کے معنی مسلمان کے منوالئے ہیں، تو ایسے حضرات کو معلوم رہے کہ دکھانے کے دانتوں سے آپ کھانا نہیں کھا سکتے.

اگر دنیا میں مسلمانوں کو واقعی جینے کی تمنا ہے، اگر وہ درحقیقت اپنی بات کو حقیقی اساس پر تعمیر کرنا چاہتے ہیں، اگر ان کی خواہش ہے کہ کل کو وہ اپنی غلط کاریوں کے یقینی مکافات سے بچیں، اگر وہ یہودیوں بلکہ مسلمانان اسپین کی طرح منقرض (تتر بتر) نہیں ہونا چاہتے تو کم از کم ان کے چوٹی کے علماء کا یہ فرض ہے کہ وہ سنی سنائی پر اعتماد نہ فرمائیں بلکہ اسلاف جیسے ایک محقق کی طرح وہ ہر انجمن اور ہر کام کی جگہ میں مدتوں گھسے رہ کر تحقیق فرمائیں اور پھر وہ حقیقی معلومات امت کے لئے دلیل راہ بنائیں.

حضرات، دولتوں (ریاستوں، قوموں) کی نسبت رائے دینا ان سے معاملہ کرنا، ان کی خوشامدوں اور چکنی چپڑی باتوں پر کان رکھنا اس وقت ہمارے لئے مفید راہ نجات ہو سکتا ہے کہ ہم ان کے خالص اسرار سے باخبر ہوں. اسرار لندن، اسرار پیرس وغیرہ حیرت انگیز ناولوں سے کہیں بڑھ چڑھ کر اسرار انقرہ کا ناول ہے. اول اس کا کشف فرمانے کا

بندوبست ہونا چاہیے جس میں خیانت ، فریب، لالچ دھوکہ دہی اخفائے مقصد اصلی کے نایاب ٹوٹکے سب ہی موجود ہیں اور یہ ایسے اسرار ہیں کہ ان کو ہمارے اخباری نمائندے، معزز سیاح، محترم ارکان وفد قیامت تک کشف نہیں فرما سکتے. ایسے حضرات چند شریکان جرم دھوکہ دہی ایجنٹوں کی مدد سے قوم وملت کو نقصان پہنچانے کے در پے رہتے ہیں جن سے ہوشیار رہنے اور احتراز کی ضرورت ہے.

من نگویم این مکن آں کن
مصلحت بیں کار آساں کن

فقط

محمد میاں منصور انصاری

کابل

بلادعرب

پہلی عالمی جنگ کے بعد عالم اسلام شدید بحران اور بے سمتی کا شکار ہو گیا تھا.سلطنت عثمانیہ میں سلطان اعظم عبدالحمید خان ثانی کی نظر یورپی سازشوں پر تھی جو عراق اور خلیج فارس میں تیل کے ذخائر پر قبضہ کرنے کی غرض سے اس خطہ میں قوم پرستی کا جادو جگا رہے تھے.اس فضا میں سلطان عبدالحمید جنگ کا خطرہ محسوس کر رہے تھے اور اس کی ممکنہ تیاری کر رہے تھے مگر سلطنت، بالخصوص پایہ تخت استنبول میں بیرونی سازشوں اور اندرونی غداریوں کا جال پھیلا ہوا تھا جس کے نتیجہ میں عالمی جنگ میں ترکی کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا عربوں کی حالت زیادہ خراب تھی.ان کے سارے سبز خواب نذر سموم ہو چکے تھے.اس وقت ان علاقوں کو تعمیر نو سے زیادہ تعبیر نو کی ضرورت تھی مگر اس کا احساس رکھنے والے مسلم دنیا میں غیر موثر تھے.

مولانا منصور انصاری اس زمانہ میں ترکی میں مقیم تھے اور اس خطہ کی صورت حال کا معروضی تجزیہ کر چکے تھے اور اس سلسلہ میں کام کرنے کے خواہشمند تھے.اس معاملہ میں انہوں نے ایک تفصیلی مکتوب ترکی میں افغان سفیر عبدالہادی خان کو لکھا تھا جس میں بلاد عرب میں جا کر کام کرنے کی خواہش اور اس کے لئے کم سے کم انتظام کی درخواست کی تھی.نہ وہ درخواست کسی گوش شنوا پر پڑی نہ وہ سفر ہو سکا جو شاید کچھ نتیجہ دے جاتا اور عربوں میں تھوڑی بہت بیداری پیدا ہو جاتی.ویسے حقیقت یہ ہے کہ مولانا انصاری کو اس سفر و قیام کی سہولت مل بھی جاتی تو شاید نتیجہ وہی نکلتا جو آج ہے.

مولانا منصور انصاری سے پہلے مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے بھی ایسی ایک کوشش کی تھی.وہ ۱۸۵۷ کے بعد ہجرت کر کے مکہ مکرمہ میں مقیم تھے.ان کو معلوم ہوا کہ انگریز کی نظر

کویت سمیت سارے عالم عرب کے تیل پر تھی اور عراق و کویت کے تیل کے ذخائر پر قبضہ کے لئے وہ کویت کے شیخ کو ورغلا رہے تھے. ایک دشوار گزار سفر کر کے مولانا کیرانوی مکہ سے کویت پہنچے اور شیخ سے ملاقات کی اور مشورہ دیا کہ انگریز کے دام میں نہ آنا، وہ اسی طرح حیلہ بہانے سے ہندستان پر قبضہ کر چکا ہے. کویت کے شیخ نے فرمایا، شیخ جی یہ سیاست ہے. ہم سیاست جانتے ہیں. تم ٹھہرے مولوی، تمہیں کیا خبر سیاست کیا ہوتی ہے. یہ واقعہ امداد صابری نے مولانا کیرانوی کی سوانح **آثار رحمت** میں لکھا ہے. مولانا منصور انصاری کو بھی اسی انداز کا جواب مل سکتا تھا. بہر حال وہ بھی اپنی آرزو میں مخلص تھے.

ترکی میں متعین افغان سفیر عبدالہادی خان کے نام ان کا خط درج ذیل ہے.

عبدالہادی خان کے نام خط

انقرہ شام و عرب عالم اور استانبول میں کام کرنے کا اچھا مرکز ہے، مگر یہاں کی معلومات اور ہماری سفارت دونوں استفادہ کی قابلیت نہیں رکھتیں. حکومت تو مشغول جنگ بھی ہے مگر ہم ماشاءاللہ نا قابلیت کے خالص پوٹ ہیں.

بندہ کھاتے کھاتے اور سوتے سوتے تنگ آ گیا ہے. بیکاری کو دور کرنے کے لیے مضمون ''الامت والجھاد'' شروع کیا تھا مگر روحانی مشغولیت کے ہاتھوں وہ بھی ناتمام ہی پڑا ہے. بیکاری نئی نئی مزیدار معلوم ہوتی تھی. اب اس سے بھی جی بھر گیا. نکما پڑا رہنا اب عذاب الیم ہے، بمقابلہ حقوق متعددہ صرف نان خوری افغانستان کے قائم شدہ متبو اند. اس کے علاوہ اس تھوڑے سے عرصہ میں تجربہ ہو گیا ہے کہ مامور دولت کی حیثیت کام کرنا جس قابلیت کو چاہتا ہے اس سے میں محروم ہوں. اس لیے اب یہ شعر پڑھا کرتا ہوں.

رخصت اے زنداں جنوں زنجیرِ در کھڑ کائے ہے
مژدہ خارِ پشت پھر تلوا مرا کھجلائے ہے

اس لیے حکومت متبوعہ کی خدمت میں ایک درخواست اور آن محترم کی خدمت میں اپنی حالت ورائے روانہ کر کے منتظر مہربانی وامداد ہوں.

ہمارے تعلقات ہندستان، ترکستان، ایران کے ساتھ اول سے ہیں. بندہ دیکھتا ہے کہ استخلاصِ مقامات مقدسہ کے لیے عرب کو دیکھنا اور فرقہ ہا اور قوتہائے عرب کو اس کام کے لیے تیار کرنا لازم ہے، اور چونکہ یہ میدان خالی ہے اس طرف اقدام نہایت ضروری ہے. اس لیے چند چیزوں کا بندہ محتاج ہے. اور وہ سب حکومت متبوعہ (افغانستان) کی مہربانی سے ممکن ہے.

۱- سب سے اول میں حکومت متبوعہ کی ماموریت حاضرہ (ملازمت) سے سبکدوشی کا محتاج ہوں.

۲- دوسرے حکومت سے ایسے وثیقہ کا کہ جس کے ہوتے ہوئے مسلمانوں کی بدظنی سے بچ سکوں.

۳- (تحریک) اخوت (ایمانیہ) سے (اور اگر اخوت سے ممکن نہ ہو تو ہندستان میں موجود تحریکِ خلافت کے ذمہ داران سے) اس قدر مصارف کا محتاج ہوں کہ ان کے ذریعہ سے میں عرب وغیرہ کے احوال مرکز یا مراکز کو پہنچنے اور رہنے کا بندوبست کر سکوں.

۴- بچوں کی تعلیم اور میرے عائلہ کے معمولی کفاف کا بندوبست اخوت کرے. اور وہ ممکن ہو تو (میرے اہل وعیال ہندستان سے) افغانستان میں چلیں آئیں. اگر افغانستان میں نہ آسکیں تو کفاف وتعلیم کے بارہ میں اخوت سے درخواست نہیں ہے.

بندہ کا یہ سفر بلکہ عرب کا قیام ایک غیر مامور دولت تبعۂ افغانستان کی حیثیت سے ہوگا. اور میرا تعلق جب کہ خلافت کمیٹی میرے مصارف برداشت نہ کرے صرف اخوت سے ہوگا. اور اگر مصارف برداشت کرے تو اس صورت میں خلافت کمیٹی کو بھی احوال روانہ کروں گا، بشرطیکہ اجازت ہو.

خلافت کمیٹی سے امداد لینے کا بندوبست (اگر ضرورت ہو) آپ فرمائیں گے.
کوشش کروں گا کہ اس سفر میں کم از کم ایک رفیق بھی ساتھ ہو.

وثیقہ آپ کی وزارت مختاری سے یا وزارت خارجہ دولت متبوعہ سے (نجد میں حایل کے) امیر ابن الرشید و (درعیہ میں) امیر ابن سعود کے نام پر مخصوص مکاتیب اس مضمون کے ہوں کہ

> حامل وثیقہ فلان شخص کہ بر سینہ داغ بزرگ سوختگی دارد آدم بے ضرر و خیر خواہ مسلمانان است و اگر این در علاقہ شما باشد بر آن سوءظن نشود، و اگر این بکدام طرف از علاقۂ شما حرکت بخواہد انتظام نمودہ شود کہ امراء آں طرف بر آن و ہمراہیانش سوء ظن نکردہ برادر اسلامی و خیر خواہ بدانند.
>
> (ترجمہ) اس دستاویز کا حامل شخص جو اپنے سینہ پر (غم ملت کی) سوزش کے آثار رکھتا ہے یہ آدمی نقصان پہنچانے والا نہیں بلکہ مسلمانوں کا خیر خواہ ہے. اگر یہ آپ کے علاقے میں آئے تو اس پر بدگمانی نہ کی جائے، اور اگر یہ کسی وجہ سے آپ کے علاقے سے دوسرے علاقے میں جانا چاہے تو آپ اس علاقے کے حکمرانوں کو یہ تاکید فرمادیں کہ وہ اس پر بدگمانی نہ کریں اور اسے اپنے خیر خواہوں میں جانیں.

ایک وثیقہ حکمرانوں کے نام اور ایک وثیقہ اسی مضمون کا عام شیوخ عرب کے نام ہونا چاہیے کہ وقت ضرورت کام میں لایا جا سکے. وثیقے عربی زبان میں ہونے چاہئیں. اگر مطلوبہ وثیقے خلاف سیاست دولت سمجھے جائیں تو تذکرہ (ٹکٹ) و پساپورت (passport) پر اکتفا کروں گا. ماموریت سے سبکدوشی اور سفر کی اجازت کے لیے صرف آپ کا حکم کافی ہوسکتا ہے یا وزارت خارجیہ کے امر کی ضرورت ہوگی. اس کا فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے.

عالمی تحریکات پر نظر

مولانا محمد میاں منصور انصاری ایک ہوشمند مدبر تھے. وہ دنیا کے حالات میں رونما ہونے والے تغیّرات، عالم اسلام اور ملّت اسلامیہ پر ان کے اثرات کا نہایت باریکی سے مشاہدہ کرتے تھے. بیسویں صدی کے نصفِ اوّل کے آخری حصّے میں جاری چند تحریکات کے تعلق سے ان کے تجربات ومشاہدات کے چند اقتباسات مولانا منصور انصاری کے فکر کی وضاحت کرتے ہیں.

لادینیت

تحریک لادینی ایک عالمگیر اور عالم سوز آتش ہے. انگارے اس کی جزء لایتجزیٰ کے درجہ کی چنگاری ہے.

یورپ کا مذہب، خدا تعالے کی طرف سے اس عصر سعادت کے لیے ناکافی ہونے کی وجہ سے منسوخ کردیا گیا تھا. عقلاء یورپ کی آنکھ نے اس کی عدم کفایت کا توصیح ادراک کیا مگر دنیا کی بدقسمتی سے اس کے نعم البدل کو نہ پہچان سکے اور مذہبیت اور عبدیت الٰہی کی قید سے لادینی اور لاقیدی (آزادی) کے گڑھے میں جاگرے.

یورپ اس نامعقول حریت میں اس قدر ترقی کرچکا ہے کہ اس کی ایک پست ترین قوم کے اندر انکار وجود خالق کا باطل ترین خیال رسمی عقیدہ بن کر آتشیں اور پروپگنڈے کے مہیب اور عصری آلات سے مسلح ہوکر عام مذاہب علے الخصوص اسلام کو (جو ہمارے اسلام نام نفاق کی وجہ سے انتہائی ضعف میں مبتلا ہے) مٹا ڈالنے کی دھمکی دے رہا ہے.

مسلمان اور اشتراکیت

منحوس اشتراکیت نے اپنے حلقۂ اقتدار میں اسلام کو عملاً مٹادیا ہے اور عیسویت اور موسویت وغیرہ مذاہب کے ساتھ بھی یہی معاملہ کیا ہے. یہ واقعہ ہے. لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی واقعہ ہے کہ مدعیان اسلام میں اس (اشتراکیت) کے ماننے والوں اور اس سے متاثر ہونے والوں کا بھی بالکل کال نہیں ہے. انا للہ وانا الیہ راجعون.

مغربی ممالک

اشتراکیت کی قوت نے اول مزدوروں کا علم بلند کر کے مزدوروں کے ممالک (مغربی یورپ) کی طرف رخ کیا، ان کو وثوق تھا کہ یورپ کے مزدوران کے جھنڈے تلے جمع ہو کر مشرق پر بھی اپنا پھریرا اُڑا سکیں گے. مگر (یورپی قوموں نے) لینن. . . کی رہی سہی امیدوں کو بھی مغرب کی زمین میں دفن کر دیا (اور) مغرب کے قلب کو اس آتش جہاں سوز سے بچالیا، تو اس نے مغرب کا لوہا مانا اور فوراً اپنے ہجوم اور تجاوز کا رخ مشرق کی طرف پھیر دیا. چنانچہ ماسکو نے اپنی حزب کے بہترین فرد (لیو- L e o) قرا خان ارمنی (۱۸۸۹-۱۹۳۷) کو چین روانہ کیا، اور مسٹر (ایم این) رائے (۱۸۸۷-۱۹۵۴) اور (پنجابی زبان کے شاعر ملک) خوشی محمد (و: ۱۹۲۷) وغیرہ کو ہندستان کے ہندو مسلم کو دام تزویر میں لانے کے لیے پوری طرح مسلح کیا، راجہ مہندر پرتاب کے ذریعہ سے غدر پارٹی کا مرکز افغانستان میں قائم کیا اور اس کا تعارف روسی سفارت سے کر کے اس کو افغانستان، فرنیٹر، ہندستان میں اشتراکی انقلاب کے لیے وقف عمل بنایا اور اس مقصد کے لیے کروڑوں پونڈ اور لاتعداد انسان چین، افغانستان، سرحد آزاد، اور ہندستان کے لیے صرف کیے اور کیے جارہے ہیں.

مشرق بعید

چین کے پہلو میں جاپانی قوت نے دیکھا کہ اس کے سرمایہ کے لیے چین کی اشتراکیت مہلک ہے، اوراس کے مضبوط قواء کے حق میں چین کے اندر روسی کامیابی نہایت خطرناک، تو وہ بڑھے اور ایک ضرب میں اپنے منافع کی حفاظت کی ضمانت حاصل کر لی.

جاپان کی دانائی اور ہمت یورپ سے کسی درجہ میں کم ثابت نہیں ہوئی. اور آج ہم مسرور ہیں کہ وہ خطرہ جو ہندستان کو اشتراکیت سے تھا کہ مغرب یا مشرق کے گھوڑوں پر سوار ہو کر اس تک پہنچے گا اٹلی، جرمنی اور جاپان کی کامیابیوں سے رفع ہو گیا ہے.

باب/ جواہر علمی

قرآن اور متمدن دنیا

شکر ہے کہ وہ بداخلاقی، عالم تباہی دنیا سے دور ہوئی اور انسانوں کی انسانیت پھر آہستہ آہستہ عود کررہی ہے، میں بھی چاہتا ہوں کہ اس مبارک دور سے کچھ استفادہ کروں.

قرآن حکیم کی پوری اسکیم یہ ہے کہ پوری انسانیت کو اپنے اعلیٰ و برتر نظام دولت پر جمع فرما کر دنیا سے اس آئے دن کی سر پھٹول کو دور اور امن وسلام عمومی کو قائم فرمائے.

آج کی انسانیت اپنے تجربوں سے ملیت پرستی کو ترک کر کے تمام ملل کے عالم شمول اتحاد کی ضرورت کو بالا تفاق قبول کر چکی ہے. جامع بین المملل (League of Nations) جنیوا کے بعد متحدۂ بین الاقوامی (United Nations) سان فرانسسکو کا قیام اس مقصد کی مبارک اور عملی دلیل ہے. اس لئے اب ہمارا (مبلغین حکومت الٰہی) کا کام آدھارہ گیا ہے. یعنی یہ کہ دنیا کے ان سمجھداروں کو سمجھایا جائے کہ وہ دنیا میں امن وامان عمومی قائم کرنے کی مقدس ترین خدمت بجا لا سکتے ہیں بشرطیکہ متحدۂ ملل کے لئے قانون انسانوں کی جگہ خالق الانس کے اعلیٰ واقدس شاہانہ دربار سے لیا جائے.

ہم متمدن دنیا کو اس کامیابی کی طرف تجربہ کی راہ سے بلاتے ہیں. اس نے قرآن عظیم کی آدھی اسکیم کو اپنے تجربہ سے اور بلا تبلیغ قبول کرلیا ہے. اب باقی آدھے کے متعلق بھی تجربہ کرلے اور جب وہ تجربہ سے ثابت ہوجائے تو قبول کرلے.

حکمت قرآنی کی رو سے یہ واقعہ پایۂ ثبوت کو پہنچ چکا ہے کہ انسان، انس ومحبت کا پتلا ہونے کی علت سے حیوان عاشق ہے اور اسی عشق خانہ آباد کی برکت سے وہ اشرف کائنات ہے. اس عاشق کی اس بلند شرافت کا تقاضہ ہے کہ اس کا محبوب ضرور ہو. اور وہ

محبوب اس سے اشرف واعلیٰ اور اجل واکبر ہو، یعنی مساوی اور اس سے پست نہ ہو، کیونکہ مساوی اور پست میں وہ کون سی رمزیت ہے جو ایک سمجھدار انسان اسے اپنا دل دے کر خود کو اس سے دوسرے نمبر کی ہستی بنائے اور اس کی رضا پر اپنی پوری ہست و بود بھی نثار کرڈالے.

انسان اور انسانیت سے بلند خالقِ انسانیت کے سوا کون ہے جسے انسان اشرف اپنا اکیلا اور مخمور شرافت دل دے. اے انسان سوچ، اور قرآنی فلسفہ کی قیمت معلوم کر. قرآن عظیم (آل عمران ۳:۳۱) انسانیت کے اسی طبعی عشق و محبت کا واسطہ دے کر رسول محبوب کی تابعیت کی ناقابل انکار ضرورت پر نہ ماند پڑنے والی روشنی ڈالتا ہے

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِىْ

(مابدولت کے قاصد، مابدولت کے عشاق انسانوں سے)

کہہ دو کہ اگر تمہیں واقعی اللہ سے محبت ہے تو میری تابعیت کرو (القرآن. آل عمران ۳:۳۱)

الحاصل قرآنی فلسفہ میں انسانیت کا مفہوم عشق الٰہی ہے اور انسان وہ زندہ جان جو عاشق الٰہی ہو اور اللہ کو اپنا یگانہ محبوب مالک جان وتن (یعنی بلا قید و شرط مطاع اور غیر مسؤل پادشاہ اعتقاد کر کے ہمہ تن مانتا ہو اور قانوناً خود کو اس کے سامنے تسلیم بھی کر دیا ہو.

البتہ عشق و غرض میں نور و تاریکی جیسا بیر ہے. جہاں عشق اثر انداز ہوتا ہے وہاں سے غرض کافور ہو جاتی ہے. اور جہاں عشق نہیں رہتا وہاں غرض کالی گھٹا بن کر چھا جاتی ہے. اس لئے جس آدم زاد میں عشق الٰہی نہ دیکھا جائے اسے حیوان مغرض (غرضمند) ہی ماننا پڑے گا.

حیوان انسانوں کے کام آتے ہیں. ان میں افادیت ہے، پاکی ہے، اس لئے قرآن حکیم عشق الٰہی سے خالی آدمیوں کو شیطان کا لقب دے کر حیوان کی مفید اور پاک صفت تک سے نکال باہر کرتا ہے.

شیطان کی حقیقت میں غرض زدگی داخل ہے. وہ نوعی اور شخصی غرض کا دیوتا بن کر

محبوب کائنات (اللہ) اوراس کے عشاق کی جماعت تمام انسانوں کے مقابل خم ٹھونک کر کھڑا ہے.لیکن اگر آپ عشق الٰہی سے محروم لوگوں کی غرض پرستی اور بندۂ (حرص و) ہویٰ ہونے کو اس سے بھی زیادہ عالم آشکار فرمانا چاہیں تو انہیں شیطان مغرض کا خطاب دے لیں.

قرآن حمید عمل اور عمل صالح کا داعی ہے.عمل صالح کیا ہے.وہی کہ اللہ کے عشق کا دعویٰ ہے تو اسی کی سلطنت کے قیام کی راہ میں عمل کیا جائے.اس عمل صالح کے لئے دوسری قرآنی اصطلاح جہاد فی سبیل اللہ ہے.یعنی قرآن مبین ان جھوٹے مدعیان محبت (خود ساختہ اور نمائشی صوفیوں) کو صالحیت کا سارٹیفکٹ عطا نہیں فرماتا جو تاریکی میں آنکھ بند کر کے تو خالق عالم کی محبت کی پینگیں مارتے ہیں اور روشنی میں نکل کر اس کے غیروں کی حکومت (فی سبیل الطاغوت) کے قیام کی راہ میں بھاری سے بھاری عملی فدویت پیش فرماتے ہیں.

جبکہ بنی آدم کی انسانیت کی یہ شرط ٹھہری کہ وہ اپنے حلقہ میں اپنے محبوب ہی کی شاہی قائم کرے تو آپ کیا فیصلہ دیں گے آج کی متمدن دول عالم کی نسبت جو (اطالوی سیاسی فلسفی مکیاولی (نکولو مکیاولی -Niccolò Machiavelli) کے فلسفہ کی اساس پر قائم ہیں اور جن میں محبوب العٰلمین کو اسی طرح میدان سیاست سے الگ کر دیا گیا ہے جس طرح وہ انسانی حکومتوں کو انسانی حلقہ سے طرد (دور) فرماتا تھا.

مکیاولی بظاہر بصیرانہ انداز میں کہتا ہے

دولت انسانی حیات کی سب سے اونچی منزل ہے اس لئے اس کی حفاظت ہی انسانیت کا بلند ترین وظیفہ ہوا.

وہ کہتا ہے کہ سیاسیوں کے عالم کے سامنے اپنے اعمال کی صالحیت کی سنجش (سمجھ) کے لئے صرف یہ معیار رہنا چاہیئے کہ وہ دولت وریاست کی خیر و بہبود کی خاطر کیا جا رہا ہے.

پہلی صورت نہایت آسان ہے.تن آسان اشخاص اس کو ترجیح دیں گے.دوسری صورت بے حد کٹھن ہے اور سخت کوش انسان اس کی طرف میلان ظاہر کریں گے.میں بھی

دوسری صورت کا حامی ہوں باوجودیکہ سمجھتا ہوں کہ کام نہایت لمبا ہے اور فرصت مفقود، اس لئے کامیابی بالکل موہوم ہے کیونکہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ تباہی کا گولا کس وقت چھوڑا جائے گا اور دنیا کو خاک سیاہ بنا ڈالے گا.

دوسری صورت کی ترجیح کی وجہ یہ ہے کہ آج دنیا میں اس صورت سے بڑھ کر کوئی نیکی نہیں اور نہ بنی نوع کی اس کے سوا کوئی صحیح خدمت کہ اس میں مصروف رہتے ہوئے جان دیں اور تباہ ہوں.

عصر حاضر کے تباہ کار سیاسی فلسفہ کے مقابل عالم آباد سیاسی حکمت کون سی ہے؟ یہ اس مبحث کا اہم سوال ہے جسے حل کئے بغیر عمل کا ایک قدم بھی نہیں اٹھایا جا سکتا. میں اس سوال کا جواب دوسری صحبت میں عرض کروں گا انشاءاللہ العزیز ملک الناس الکریم.

باب/ جواہر علمی

تصور انقلاب

دنیا کے حالات سے کبیدہ خاطر ہوکر اور عالم اسلام کی اصلاح کی خاطر مولانا محمد میاں منصور انصاری نے اپنا نقطۂ نظر تبدیل کیا اور سیاسیات قرآنی کو اپنے فکر کی اساس بنایا. ان کے ذہن میں حکومت الٰہیہ کا وسیع تصور قرآن وسنت کی بنیاد پر تھا. سیاسی جد وجہد اور سیاسیوں کے خیالات کے مطالعہ کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچے مسلم انحطاط کا علاج حکمت قرآن ہے اور جب تک عوام وخواص کے دل ودماغ میں قرآن کا پیغام سرایت نہیں کرے گا حکومت الٰہیہ کا منصوبہ کامیابی سے ہم کنار نہیں ہوگا. یہ کام وہ افغانستان آنے کے بعد شروع کر چکے تھے لیکن اسے وسعت دینے کی انہیں فرصت نہیں مل رہی تھی.

سفارتی ذمہ داریوں سے فارغ ہوکر افغانستان آنے کے بعد وہ قرآن کریم کے فارسی ترجمہ وتفسیر کے کاموں میں منہمک رہے جس کا اندازہ قاضی ریاست دیر وسوات وجندول کے اس خط سے ہوتا ہے جو انہوں نے مولانا محمد میاں کو لکھا تھا. اس کا اردو ترجمہ مندرجہ ذیل ہے:

قاضی سوات کا خط

خادم الاسلام ذو المجد والاکرام جناب معظم ومحترم خادم خلافت محمد منصور انصاری ایوبی زادمجدکم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا نامہ نامی اور صحیفۂ گرامی صحیح وقت پر پہنچا. اس کے الفاظ کے معانی ومطالب پر مطلع ہوا اور حرفاً حرفاً پورا خط جناب معظم (سوات کے) نواب صاحب کی

خدمت میں پیش کیا نواب صاحب موصوف اس تحریر پر آپ کے شکر گذار ہیں. صحیفۂ قیصری کی نقل کا مفسر و مفسرِ عربی و فارسی پوری وضاحت کے ساتھ جملہ بہ جملہ مطالعہ کیا ہے. بس اسے مدلل سمجھتا ہوں. اس سلسلہ میں آپ کی جو خواہش ہو نیاز مند کو اس سے مطلع فرمائیں، انشاء اللہ اس کی تعمیل کی ہر ممکن کوشش کروں گا. اور یہ فقیر خادم شریعت دین مصطفوی آپ کی خدمت میں آپ سے ملاقات کی راہیں نکال رہا ہے تاکہ دونوں کی دلی مراد پوری ہو سکے. زیادہ کیا عرض کروں. فقط

خادم الاسلام

مہر قاضی ریاست دیر وسوات وجندول

۲۱ ذی قعدہ ۱۳۳۵ھ (۸ ستمبر ۱۹۱۷)

دری/ فارسی زبان میں لکھے ہوئے اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا محمد میاں منصور انصاری ستمبر ۱۹۱۷ میں افغانستان کے کسی نامعلوم پہاڑی مقام پر قرآن حکیم کے کسی حصہ کی تفسیر میں منہمک تھے اور ان کی ان خفیہ قیام گاہ سے نواب دیر وسوات وجندول واقف تھے اور ان سے بلا وسطہ یا بالواسطہ خط وکتابت تھی. جب انہوں نے قرآن پاک کے کسی حصہ کی تفسیر کی تو اسے نواب دیر وسوات کے مطالعہ کے لئے روانہ کیا. نواب دیر نے قاضی ریاست کے ذریعہ قرآن مجید کے اس حصہ اور مولانا محمد میاں منصور انصاری کی تفسیر کا حرف حرف مطالعہ کیا اور قاضی ریاست کو حکم دیا کہ وہ مولانا منصور انصاری کو خط سے مطلع کر دیں کہ مذکورہ تفسیر کا مطالعہ کر لیا گیا ہے.

اس خط سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ ریشمی رومال تحریک آزادی کی ناکامی، ہندستانی سیاست کا بے راہ و منزل جمود، یورپی قوموں میں زرگری کی خاطر جاری پہلی جنگ عظیم، سلطنت عثمانیہ کے زوال و بحران، روس میں زار کی حکومت کے خاتمہ اور مارکسی خونی انقلاب نے دنیا کی جو تصویر کشی کر رکھی تھی اس میں مولانا محمد میاں منصور انصاری امت

مسلمہ کو نئے تعمیری رخ پر ڈالنا چاہتے تھے. ایک مہاجر فی سبیل للہ کے پاس وسائل کا فقدان تھا. سیاسی حالات ساز گار نہیں تھے. دنیا کا اقتدار ان کے پاس تھا نہیں. مسلم حکمراں بے شعور اور کم وبیش سبھی یورپی سیاست کے آلۂ کار تھے. ان حالات میں ایک مرد مومن کی پناہ اللہ کا کلام اور اس کے رسول کے اسوہ حسنہ ہی ہوتا ہے. چنانچہ مولانا محمد میاں منصور انصاری نے بھی اسی طرف توجہ لگا دی.

ان کی اس تازہ مشغولیت کا مقصد یہ تھا کہ قرآنی اسلوب پر عوامی ذہن سازی کر کے ایک ایسا انقلاب برپا کر سکیں جس کے نمونہ پر آخر کار کم از کم افغانستان میں حکومت الٰہیہ کے قیام کی راہیں ہموار ہوں.

وہ وقت آیا، اگر چہ مولانا منصور انصاری کے انتقال کے برسوں بعد آیا. اور افغانستان میں آیا.

اس امکان وانقلاب کی حمایت دنیا میں نہیں ہے. اس کا بنیادی سبب یہی ہے کہ فکر اگر فلسفہ کی سطح سے بلند ہو کر عمل میں دنیا کو نظر نہ آئے تو اس فکر کی اہمیت کو تسلیم نہیں کیا جاتا ہے. لیکن مولانا محمد میاں منصور انصاری نے سو سال پہلے امت کی کھیتی میں جو بیج بو دئے تھے ان کی فصل تیار ہونے لگی ہے.

باب/ جواہر علمی

جمہوریت کا مفہوم

عہد رواں کی جمہوریت بنیادی طور پر یورپ بلکہ انگلستان کے کئی صدیوں پر محیط سیاسی بحرانوں کا نتیجہ ہے. یہ درست ہے کہ عوامی رائے کا عنصر اس نظام کی ایک اہم خوبی ہے مگر مختلف قوموں کے تجربات ظاہر کرتے ہیں کہ برطانوی نظام کی من وعن نقل نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوئی. مولانا محمد میاں منصور انصاری نے جمہوریت کے نظریہ پر اپنے خیالات ایک ذاتی خط میں جمعیۃ علماء ہند کے روزنامہ الجمعیۃ کے مدیر (؟) کے نام لکھے تھے. مدیر الجمعیۃ نے وہ خط ایک تعارفی تحریر کے ساتھ اخبار میں شائع کردیا تھا. اس بناء پر مولانا منصور انصاری نے مناسب سمجھا کہ اس مسئلہ پر اپنے خیالات وضاحت کے ساتھ علماء اور امت کے سامنے پیش کردیں. اس مقصد کے لئے انہوں نے مدیر الجمعیۃ کے نام ایک تفصیلی خط میں اس مسئلہ پر مزید گفتگو کی تھی.

بدیہی طور پر اس خط میں جمہوریت کی مذمت پائی جاتی ہے جسے اس تحریر کے سو سال بعد اب مسلمہ طور پر دنیا کا وہ بہترین سیاسی نظام مانا جاتا ہے اور جس کے بارے میں یہ خیال ذہنوں میں راسخ ہے کہ صدیوں بادشاہتوں، شہنشاہیتوں اور آمریتوں کے عموماً دردانگیز تجربات کے بعد یورپی سیاسی دانشوروں نے دنیا کی فوز وفلاح کے لئے اسے دریافت کیا ہے. چنانچہ آج جمہوریت کی مذمت سیاسی اعتبار سے نادرست مانی جاتی ہے.
لیکن مولانا انصاری خود ایک ابتکاری سیاسی مفکر (political scientist) تھے، انہوں نے ہندستان کے علاوہ برسوں حجاز مقدس، صوبہ سرحد (اب پختون خوا) میں آزاد قبائلی یاغستان، افغانستان، خراسان، مغربی ترکستان، روس، ترکی میں جبری سیاسی سیاحت کی،

ان خطوں کے حریت پسند انقلابیوں سے راست ذاتی مراسم قائم کیے، ہندستان کے بزرگوں، روسی اور ترکستانی لیڈروں، اکابر سلطنت عثمانیہ، لیبیا (طرابلس غرب) کے شیخ احمد سنوسی اور مصر کے شیخ عبدالعزیز شاویش وغیرہ سے امت مسلمہ کے سیاسی مستقبل پر تبادلہ افکار کیا تھا. اس پس منظر میں ان کا سیاسی نظریہ مرتب ہوا تھا.

ان کے اس تصور سیاست پر اسی طرح علمی بحث ہوسکتی ہے جیسے فرانسیسی مفکرین مونٹسکو (م:۱۷۵۵ Montesquieu)، روسو (م:۱۷۷۸ Rousseay)، برطانوی مفکرین ہوبس (م:۱۶۷۹ Hobbes) اور لاک (۱۷۰۴ Locke) وغیرہ کے سیاسی نظریات پر علمی دنیا میں ہوتی ہے.

یہ الگ بات ہے کہ مولانا محمد میاں منصور انصاری کی توجہ کا مرکز مسلم دنیا تھی اس لئے مسلم دنیا اور باقی دنیا کی تعلیمی غلام گردشوں میں ان کے افکار کو توجہ کا مستحق نہ سمجھا جائے، البتہ اس بے نیازی اور تغافل کا سبب علمی تقسیم کے دونوں کناروں کے وہ اہل علم ہیں جو قرآن پر گہری تفسیری اور حدیث پر بسیط تشریحی اور سیاسیات پر ماہرانہ نظر رکھتے ہیں.

فکری جمود کا یہی اندیشہ مولانا منصور انصاری نے مدیر الجمعیۃ دہلی کے نام اپنے خط میں ظاہر کیا تھا. یعنی عہد رواں کے تمام مسلم سیاسی مفکرین یورپی جمہوریت کے بارے میں اسی جامد سوچ کے پابند ہیں جو علمی وقار کے منافی ہے. مولانا محمد میاں منصور انصاری نے اس خدشہ کا اظہار کرنے میں تکلف سے کام نہیں لیا تھا اور برملا کہا تھا:

> ہمارے نوجوان جو حکومت شرعیہ شورویہ کو جانتے ہی نہیں اور ان کے کان صرف یورپ ہی کے کارناموں سے آشنا کیے گئے ہیں. اس لفظ سے اس کے متعارف معنی یورپین جمہوریت سمجھ کر اسی کی طرف مائل ہوں گے.

بہر حال اس خط کے مندرجات ارباب سیاست اور معلمین سیاسیات کی توجہ کے مستحق ہیں.

مدیر الجمعیۃ کے نام مکتوب

یہ آوارہ کچھ دن کابل رہ کر آیا تو اپنا ایک شخصی عریضہ جو آں محترم کے نام لکھا تھا ۱۱ جمادی الاول (سنہ نا معلوم) کے الجمعیۃ میں چھپا ہوا پایا. اس لطف خاص پر مشکور ہوں.

اگر چہ ابتدا میں میرا ارادہ شخصی طریقہ پر اس مسئلہ میں تبادلۂ فکری تھا لیکن چوں کہ آپ کی عنایت سے اس آوارہ کا ناقص عریضہ شائع ہو کر امت کے ہاتھ میں پہنچ گیا ہے اور اس پر ایک مختصر نوٹ بھی سپرد قلم فرمایا گیا ہے اس لیے بے موقع نہ ہوگا اگر میں اس مسئلہ میں اپنے افکار کو کسی قدر وضاحت دے کر علمائے امت کے حضور میں تقدیم (پیش) کر کے فیصلہ کی خواہش کروں، کیوں کہ میری رائے میں یہ معاملہ اصولی ہے اور لفظی بحث کی حدود سے بہت بلند.

جناب من آپ فرماتے ہیں:

> 'جمہوریت سے ہماری مراد جس قسم کا نظام حکومت ہے اس سے پہلے ایک طویل سلسلۂ مضمون میں بیان کیا جا چکا ہے. جمہوریت کا لفظ صرف اس لیے اختیار کیا گیا کہ یہ شوروی انتخابی حکومت شرعیہ کے مفہوم سے زیادہ اقرب ہے، ورنہ یورپین جمہوریت کی کیفیت تو الحمد للہ ہم کو بھی خوب معلوم ہے اور اس کے فتنہ سے مسلمانوں کو بچانا یقیناً ہمارا فرض ہے.

آپ کے اس مختصر نوٹ کا حاصل یہ تین امور ہیں:

۱- الجمعیۃ یورپین جمہوریت کی کیفیت سے خوب واقف ہے اور اس کے فتنہ سے مسلمانوں کو بچانا اپنا فرض جانتا ہے.

۲- اس عنوان میں لفظ جمہوریت اس کے متعارف معنیٰ (یورپین

جمہوریت) کے لیے مستعمل نہیں.

۳-	اگرچہ حکومت شرعیہ جمہوریت سے غیر چیز ہے، مگر اقربیت مفہوم کے باعث لفظ جمہوریت نے ''شوروی انتخابی حکومت'' شرعیہ کی جگہ استعمال ہونے کا شرف حاصل کیا ہے.

ان امور پر اسی ترتیب سے یہ آوارہ بھی اپنے ناقص افکار عرض کرتا ہے.

☆اس میں مجھے کوئی شبہ نہیں کہ الجمعیۃ یورپین جمہوریت کی کیفیت سے کماحقہ واقف ہے. اور میرا یہ بھی عقیدہ ہے کہ جمعیۃ علماء کے مقدس ترجمان کا فرض ہے کہ اس کے فتنہ سے عالم اسلام کو بچانے کے لیے شایان شان اقدامات کرے.

سچ پوچھئے تو میری عرض اول کی علت بھی میرا یہی عقیدہ ہے کیوں کہ مری ناقص رائے میں اسلامی حکومت کی جگہ لفظ جمہوریت کا استعمال کرنا مسلمانوں کو یورپین جمہوریت کے فتنہ سے بچانے کے منافی ہونے کے ساتھ ہی ان کو اس فتنہ میں گرفتار کرنے کا باعث ہے اس لیے الجمعیۃ کے صفحات میں اس کا استعمال کسی طرح مناسب نہیں سمجھتا.

سبب یہ ہے کہ دنیائے اسلام میں میں نے جہاں تک آوارہ گردی کی ہے وہاں لفظ جمہوریت سے صرف ایک ہی معنٰی مراد لیے جاتے ہیں اور وہ صرف یورپین جمہوریت ہے.

اور میں سمجھتا ہوں کہ دنیا کے مروج ومتعارف لغات میں اس وقت تک جمہوریت کے اقسام میں '' حکومت شرعیہ شوروی انتخابیہ'' کا اندراج نہیں ہوا ہے. اس لیے اس لفظ جمہوریت سے تمام دنیا کے مسلمان صرف یورپین اختراع کی تائید وحمایت سمجھ کر اسی کی طرف مائل ہوں گے.

جس کو بالفاظ دیگر اس طرح سمجھنا چاہیے کہ اس عنوان سے ملل (اقوام) یورپ کی تائید ہوگی جو اپنی جمہوریت کا پروپیگنڈا نہایت وسعت کے ساتھ کر رہی ہیں اور جس کی

اشاعت کے لیے کروڑوں پونڈ اور لاکھوں بہترین دماغ وقف کردیے ہیں اور ان کا واحد نقطۂ نظر یہ ہے کہ جس طرح ہو سکے ہمارے نوجوانوں کو جو ہماری (مسلمانوں کی) کریہہ المنظر اور فاسد الحقیقہ حکومتوں (ملوکیتوں/ بادشاہیوں) سے قطعاً بیزار ہو چکے ہیں اداری اور حکومتی مسائل میں اپنے عقائد پر لے آئیں.

اور ہمارے نوجوان جو حکومت شرعیہ شورویہ کو جانتے ہی نہیں اور صرف ان کے کان یورپ ہی کے کارناموں سے آشنا کیے گئے ہیں اس لفظ سے اس کے متعارف معنی یورپین جمہوریت سمجھ کر اسی کی طرف مائل ہوں گے، یا یہ کہ ملل یورپ اور اس کے چالاک حامی اس موقع کو غنیمت سمجھ کر اس عنوان کو عوام اور سادہ لوح نوجوانوں کو گمراہ کرنے کے لیے استعمال کریں گے، اور اس کے بعد ان کے لیے آسان ہوجائے گا کہ مسلمانوں کے غافل نوجوانوں کو جو اپنی نامعقول حکومتوں (بادشاہتوں، آمریتوں) سے بالکل دل سرد ہو چکے ہیں حکومت شورویہ انتخابیہ شرعیہ سے روگرداں کر کے یورپین جمہوریت کا پرستار بنادیں.

آپ نے ضرور سعی فرمائی ہے کہ ظاہر ہوجائے کہ آپ کی مراد لفظ جمہوریت سے ایسا نظام حکومت ہے جس کو شوروی انتخابی حکومت شرعیہ کا مبارک عنوان دیا جاسکتا ہے. آپ نے اسی اظہار کے لیے ضرور کوئی سلسلۂ مضامین بھی تحریر فرمایا ہوگا لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ آپ کی یہ مساعی جمیلہ اس قدر محدود الاثر ہیں کہ ان کا دیکھنا خود مجھے بھی یاد نہیں حالانکہ میں الجمعیۃ کا خریدار ہوں اور اس کے ساتھ ہی آپ کا مخلص عقیدت کیش.

پس جس صورت میں کہ اس عنوان کو صاحبان عرض کے پہنچنا نصیب ہو (جو یقینی ہے) اور اس عنوان کے سر پر الجمعیۃ کا مقدس طغرا بھی لگا ہوا ہو تو وہ لوگ اس سے جس قدر بھی استفادہ کریں کم ہے.

آیا آپ مطمئن ہیں کہ یہ آپ کی ان تصریحات کو جو آپ نے کسی وقت ارقام

فرمائی ہوں گی اور جو کہ ان کے مقصد کے منافی ہیں کہیں اور کسی صورت میں ظاہر کریں گے.

☆اس لیے آپ کے نوٹ کے حاصل کا نمبر (۲)

کہ "اس عنوان میں لفظ جمہوریت اس کے متعارف معنے (یورپین جمہوریت) کے لیے مستعمل نہیں"، کوئی موزوں عذر یا جواب نہیں ہوسکتا.

مولانا، آپ مجھ سے بہتر واقف ہیں کہ ورثۂ انبیاء کا کام تصنیف لغات نہیں بلکہ ان کا وظیفہ متعارف لغات میں مسائل حقہ کی تفہیم وتبلیغ ہے

وَمَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوۡمِهٖ (القرآن.ابراہیم۱۴:۴)

اور ہم نے ہر رسول کو اس کی قوم کی زبان ہی میں (تعلیم کے لئے) بھیجا ہے

میں نے مانا کہ آپ کی مراد لفظ جمہوریت سے یورپین جمہوریت نہیں بلکہ حکومت شرعیہ ہے مگر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ اپنی مراد کو اسی لفظ سے کس طرح دوسروں کو سمجھا سکتے ہیں. دنیا تو جمہوریت کے لفظ سے یورپین جمہوریت ہی سمجھتی ہے.

جمہوریت کی ایجاد کا سہرا یورپ کے سر ہے اور اسلام کی تاریخ سے ثابت نہیں ہوتا کہ کسی عصر معتبر میں اسلام نے یہ بچہ جنا ہو. تو پھر کیسے ہوسکتا ہے کہ آپ یورپ کے حقیقی فرزند کو اس سے چھین کر اور اسلام کی گود میں دے کر باور کرانے لگیں کہ یہ اسلام کا صلبی مولود ہے.

ضرور آپ کا مقصد یورپین جمہوریت نہیں لیکن کیا مسلمانوں جیسی ترقی دیدہ امت کی قاموسیں اور مذہبی ذخائر بالکل ہی مفلس ہوگئے ہیں کہ آپ اس روح پرور عنوان کے لئے ایک اجنبی اصطلاح (جمہوریت) کے استعمال سے مستغنی نہ ہو سکے.

مولانا، حکومت شرعیہ شورویہ انتخابیہ کی بجائے لفظ جمہوریت کو استعمال کرنا اسلامی حکومت کی جگہ لفظ (جمہوریت) کا استعمال کرنا مسلمانوں کو یورپین جمہوریت کے فتنہ سے بچانے کے منافی ہونے کے ساتھ ہی ان کو اس فتنہ میں گرفتار کرنے کا باعث ہے، اس لیے الجمعیۃ کے صفحات میں اس کا استعمال کسی طرح مناسب نہیں سمجھتا.

باب/ جواہر علمی

اسلامی اقتصادیات

مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ دارالعلوم دیوبند کے ان مایہ ناز فضلاء میں تھے جنہوں نے آزادی ہند کے لئے قربانیاں دیں اور تقسیم کے وقت ہندستان میں رہ جانے والے مسلمانوں کی سماجی خدمت بھی کی اور سیاسی طور پر بھی ان تمام ناگہانی آفتوں کا مقابلہ کیا جن میں خوفزدہ مسلمانوں کو فرقہ پرست ہندو مبتلا کر رہے تھے. جمعیۃ علماء ہند اور انڈین نیشنل کانگریس کے پلیٹ فارم سے ان کی بے یار و مددگار مسلمانوں کی سماجی اور سیاسی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے. جمعیۃ علماء کے واسطہ سے ملک کی شدید جذباتی سیاست میں اترنے سے پہلے مولانا حفظ الرحمٰن اس اخوت اربعہ کا ایک ستون تھے جس نے اعلیٰ تحقیقی اور تدوینی معیار پر بلند پایہ علمی کتابوں کی اشاعت کے لئے ندوۃ المصنفین قائم کیا تھا. اس ادارہ کے ماتحت خود انہوں نے اسلام کا اقتصادی نظام اور قصص القرآن تحریر کیں.

مولانا محمد میاں منصور انصاری کے فرزند مولانا حامد الانصاری غازی بھی اس اخوت اربعہ کے رکن اور ندوۃ المصنفین کے بانیوں میں تھے اور مولانا حفظ الرحمٰن سے ان کے دوستانہ روابط تھے. اسلام کا اقتصادی نظام شائع ہوئی تو اس کی بحثیں اس فکر سے متصادم تھیں جو مولانا منصور انصاری نے قرآن وسنت کی روشنی میں اختیار کیا تھا. چنانچہ انہوں نے ایک مکتوب عام میں ان علمی پہلوؤں پر اختلاف کو واضح کیا. مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ کی تالیف اسلام کا اقتصادی نظام پر ان کا تبصرہ من وعن سے پیش کیا جا رہا ہے.

مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کے نام مکتوب

اسلام کا اقتصادی نظام پر تبصرہ

میں نے مولوی حفظ الرحمٰن صاحب کی گرانقدر تالیف ''اسلام کا اقتصادی نظام'' کا یہاں ایک دوست کی مہربانی سے مطالعہ کیا. اس کے تحقیقی حصہ سے مسرور اور علمی حصہ سے مغموم ہوا اور اناللہ وانا الیہ پڑھا.

ہمارے علمی رہنما پکی پکائی کھانا چاہتے ہیں جو ممکن نہیں ہے. ہر دولتی (سیاسی) نظام آغاز میں اور مرنے کے بعد ناقابل عمل ہوتا ہے. اگر ایک شخص کو اس کی صداقت پر یقین آجاتا ہے اور اس کا ایمان ہوتا ہے کہ بنی نوع کا اس میں بھلا ہے تو وہ صرف اسی پر عمل کی دعوت دیتا اور اس راہ کے کانٹے پا برہنہ عبور کر کے اس کو قابل عمل بنا چھوڑتا ہے. اور وہ ایسا نہیں کرتا تو قیامت تک وہ (نظریہ) قابل عمل نہیں بنتا اور اس کے ناقابل عمل رہنے کا گناہ مبلغ کی سستی کی گردن پر رہتا ہے.

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب اگر غور فرمائیں تو میری ہمنوائی فرمائیں گے کہ دولتی (ریاستی) معاملات میں اصول خوبی وبدی سے پہلے مرکز حکم کی نسبت جس سے کہ وہ اصول صادر ہوا ہے یقین حاصل کرنا لازم ہوتا ہے کہ اس کو اصول مقرر کرنے اور اس کو لوگوں کے سر مڑھنے کا حق بھی حاصل ہے یا نہیں. اگر ایک محقق کو اس کے اس حق کا اذعان (یقین) ہو جائے تو وہ اس اصول ساز کے ہاتھ میں خود کو سپرد کر دیتا ہے اس کے اصول کو بتمامہ مانتا ہے اور صرف اسی پر چلتا ہے اسی کی تبلیغ کرتا ہے. پھر وہ نہ تو اپنے مرکز مطاع کی حضور میں درخواست کرتا ہے کہ حضور اپنے اصول کو ایسا بنا کر مجھے عطا فرمائیے جو آج ہی جامہ عمل پہن سکے، اور اگر آپ ایسا نہیں فرما سکتے تو میں فی الحال آپ کو سلام کر کے رخصت ہوتا ہوں اور ایسے مرکز کی تلاش کرتا ہوں جس کا اصول عمل کا جامہ اپنے پرستاروں کی ہمت وغیرت سے پہننے کے قابل ہو.

عزیز من مولانا حفظ الرحمٰن صاحب، مسئلہ ہے خدا پرستی اور غیر پرستی کا اور یہ کہ ہمارا دولتی مرکز کون ہے. اگر ہمارا دولتی مرکز خدا ہے اور آپ کا تحقیق کردہ اسلام کا نظام اقتصادی اسی کا ناقابل انکار اصول ہے تو آیا یہ ممکن ہے کہ ہم اس کے غیر کا مقرر کیا ہوا نظام بھی اختیار کرلیں اور خدا ملک الناس کی رعیت میں داخل رہتے ہوئے اس کے باغیوں میں بھی شمار نہ ہوں. آپ لوگ اس مفہوم کو آج نہیں سمجھ سکتے کیونکہ خدا کی اجرائی تلوار صدیوں سے آپ کے سر سے دور ہے اور حضرت شاہ ولی اللہ کی سعی جمیل کے باوجود آج تک آپ میں سلیقہ پیدا نہیں ہوا کہ قرآن حکیم کو آپ دولتی نقطہ نگاہ کے مطابق تطبیق دے سکیں. آپ خدا پرست سے زیادہ وطن پرست ہیں. اور اس لئے آپ کو خدائی حکومت کے مفاد و اضرار سے زیادہ وطن کے مفاد و اضرار ہی اپیل کرتے ہیں، اور آپ کے عمل کی ناؤ اگر کسی وجہ سے آل انڈیا کانگریس کی چلائی ہوئی ہوا پر نہیں چل سکتی تو آپ اس مطاع مطلق کو چھوڑ کر اصلی خدا کو تو نہیں پوج سکتے اور اس کی پوجا کو ناممکن العمل تصور کرکے ہندستان کے بنے ہوئے دوسرے خدا کو ڈھونڈ نکالتے ہیں، بشرطیکہ اس کا لائحہ کار ممکن العمل اور انگریز کے مخالف ہو.

مجھے نہایت تعجب ہے کہ آپ حضرات کو جب خدا اور اس کی حکومت کے قیام سے سروکار نہیں اور سہولت کے پیچھے پھرتے ہیں تو انگریزی خدائی کے قبول کرنے کی کیوں نہیں سوجھتی کیونکہ انگریزی خدا بھی تو اپنے بندوں کو سودیشی خداؤں (کانگریس اور ہندستانی سوشلسٹوں) سے زیادہ اچھا رکھتا ہے اور اس کا اصول بھی سب سے زیادہ ممکن العمل ہے کیوں کہ آج ہندستان اسی کے ید قدرت میں ہے.

الحاصل اگر خدا سے علاقہ رکھنا ہے تو وہ تو اس کی غیر تمام قوائے حاکمہ سے توڑ کر ہی قائم رکھا جا سکتا ہے. توحید سے حقیقت مقدم ہے، سب دوسروں سے اول منہ موڑا جائے تبھی تو وہ ایک کی طرف پھر سکے گا. ابراہیم حنیفاً علیہ السلام انی بریٔ مما تشرکون کے بعد ہی انی وجھت کا توحیدی نعرہ لگا سکے تھے. باقی رہا دشمنوں سے استفادہ کا معاملہ یعنی

دولتی طریقہ پر ایک دشمن سے تعاون کر کے ایک مشترکہ دشمن کو پچھاڑا جائے سو وہ اپنی ذات کے لئے تو مطلوب نہیں کسی سیاسی مرکز بلکہ نظام اقتصادی اسلامی کے الٰہی مرکز کے لئے ہی ہوگا مگر جب تک وہ قائم نہ ہو جائے تو اس کے لئے استفادہ کا امکان کیا.

میری رائے استفادہ کے متعلق یہ ہے کہ وہ مکی زندگی میں جو عدم تشدد کی زندگی ہے ممکن نہیں کیونکہ تعاون کے لئے تشدد اور مدنی حیات کی قوت اور مستقل مرکز کی ضرورت ہے. رہا مقاطعہ قریش کے وقت بنی ہاشم کے کفار کا آپؐ سے معاملہ اس وقت کی خاندانی تشکیل کی حیرت انگیز قوت و ربط وضبط کا مظاہرہ ہے جس میں آنحضورؐ اور جماعت مومنین کی طرف سے بنی ہاشم کے سامنے دست معاونت دراز نہیں کیا گیا تھا بلکہ بنی ہاشم نے جماعت مومنین کی مدد خاندانی اصول پر کرنا لازم سمجھا تھا سو اگر آپ بھی اسلامی اقتصادی نظام کی علمبردار ایک جماعت بنالیں اور اس کو بنی ہاشم جیسا درد شریک خاندان یا قوم یا عبدالمطلب وابوطالب وغیرہ جیسے ہمدرد افراد مل جائیں تو ان کی ہمدردی قبول کرنے کے نبوی آئین کو آئین عمل بنایا جاسکتا ہے، لیکن یہ نہیں ہوسکتا کہ نظام اقتصادی الٰہی پر تنظیم خلق سے منہ موڑ کر سوشلستی کو آئین عمل قرار دے لیا جائے کیونکہ رسول علیہ السلام نے یہ ہرگز نہیں فرمایا کہ حالات کے ساز گار ہونے کے انتظار میں بنی ہاشم یا ابوطالب وعبدالمطلب کا مسلک معمول بنالو.

قرآن حکیم کی نظر میں ہر وہ قانون دولتی جس کو غیر خدا نے بنایا ہو فسق وظلم بلکہ کفر ہے اور کھلی بت پرستی اور حاکمیت طاغوت اور اس میں نظام سرمایہ داری اور نظام سوشلسٹی دونوں کا ایک ہی حکم ہے. اس لئے اگر نظام اسلامی کی بجائے نظام سوشلستی پر ہی کیوں نہ حکم کیا جائے کفر وحکومت طاغوتی ہونے میں وہ نظام سرمایہ داری سے کسی صورت میں بھی کم نہ ہوگا. مجھے حیرت ہے کہ آپ جیسے محقق سے ایسی لغزش کیسے ہوئی؟ مجھے امید ہے کہ آپ میرے معروضہ پر ٹھنڈے دل سے غور فرما کر اپنی دعوت عمل کی اصلاح فرماویں گے. اور خدا پرستی کو مسجد کی چار دیواری کی قید و بند سے نکال کر دولتی اور سیاسی اور اقتصادی نظامات تک

آمرانہ وسعت دیں گے. اور تعاون قوا و مراکز سیاسی غیر الٰہی سے پہلے مرکز سیاسی تنقیدی شاہی الٰہی اور اس کے نظام اقتصادی کی تبلیغی جماعت کے قیام کو فرض ایمان قرار دیں گے کیونکہ کسی کو مدد دینے اور کسی کی مدد قبول کرنے سے پہلے اپنے وجود کی تعمیر ضرور ہے. کسی کے گھر کی تعمیر میں مدد دینے سے اپنا گھر نہیں بن سکتا. اپنا گھر تو بنائے سے ہی بنتا ہے.

ہاں یہ میں مانتا ہوں کہ بحالات موجودہ گھر کا بنانا بہت ہی دشوار ہے اور ہمت فرسا درجہ تک دشوار ہے مگر وظیفہ گھر کا بنانا ہی ہے اور یہی وقت ہے جس کی نسبت ارشاد ہے **لیمیز الله الخبیث من الطیب**. ہاں، ہر شخص اپنے اقتدار کی حد تک مسئول ہوتا ہے. اگر آپ میں حضرت محمد رسولؐ اللہ جیسی تعمیری طاقت نہیں تو حضرت عیسیٰ روح اللہ کی بنائی ہوئی راہ پر چل کر مقربین بارگاہ الٰہی کی صف میں کھڑے ہو سکتے ہیں. **العلماء ورثة الانبیاء** کے ارشاد میں حضرت عیسیٰ بھی تو ایک نبی ہیں محمدؐ کے نہیں عیسیٰ کے وارث بنئے اور امت کی بگڑی اگر نہیں بنا سکتے تو اس کے بننے کی اساس ہی قائم کر کے چھوڑ یئے. یہ آپ کے لئے کافی ہوگا.

اگر منزل کٹھن ہے تو آپ کا والی اس کو آسان بنا دے گا. گھبرانے کی بات نہیں. دشمن اگر قوی است نگہبان قوی تر است.

> آپ کو سوشلسٹوں کی ہمت سے سبق لینا چاہیئے کہ انہوں نے انگریز اور کانگریس کے متحدہ حلقۂ اثر میں اپنے لئے جگہ نکال ہی لی. آپ کانگریس سے سبق لیجئے کہ اسے انگریز نے اپنی ضرورت کے لئے بنایا. اس نے انگریز کی سیاست وقت سے استفادہ کرنے میں نخوت کا اظہار نہ کیا، اسی عاقلانہ استفادہ کی برکت ہے کہ آج کانگریس حکومت ہند کے مقابل حکومت متوازی بن کر کھڑی ہوئی ہے. آپ بھی وقت سے استفادہ فرما کر پچاس سال کے بعد اس کا شاندار نتیجہ دیکھ سکتے ہیں. اور اگر آپ چاہیں کہ دوسروں کا پکا ہوا کھائیں تو یاد رکھیں دوسرے اپنا کھایا ہوا ہرگز آپ کو نہ کھانے دیں گے. بلکہ اپنی چکی کا

ہتّھہ آپ کے ہاتھ میں دیکر آپ سے پسوائیں گے اور آپ کا پیسا ہوا بھی خود کھا جائیں گے اور اس میں سے آپ کو نہ کھانے دیں گے. مطلب یہ کہ سیاسی اقتدار آپ کو بحیثیت پرستار نظام اقتصادی اسلامی ہرگز نہ حاصل ہونے دیں گے اور آپ کے ذریعہ سے مسلم عوام کو اپنے نظام میں مدغم کر کے آپ کی قوت کے امکان کو فنا کر دیں گے.

آپ کو موقع حاصل ہے کہ تبلیغ نظام اقتصادی اسلام کے لئے ایک سیاسی مرکز قائم کر کے مسلم مزدور اور دہقان اور صناعوں کو اس پر سوشلسٹوں کی طرح جمع کرنا شروع کریں اور اس کے بعد **لعل اللہ یحدث بعد ذلک امرا** پڑھ کر ظہور لطیفہ غیبی کا متوکلانہ انتظار فرمائیں.

آپ کی خیر خواہی کا جوش بہت کچھ لکھنے کا متقاضی ہے مگر قلم سست، حال وفکر پریشان مانع ہیں. تھوڑے لکھے ہوئے کو بھی بہت سمجھیں آپ حضرات کے لیے ہدایت وتوفیق کی دعا کرتا ہوں. میرے لکھے ہوئے مراقبۂ نماز کی مشق شروع فرمادیں اس سے **وانھا لکبیرۃ** کی عینی تفسیر کے ساتھ آپ حضرات پر وہ صراط مستقیم بھی منکشف ہو جائے گی جس پر چلنا آپ کا وظیفہ ہے.

چھوٹا منہ بڑی بات ہے مگر خیر خواہی کا تقاضہ ہے کہ عرض کروں کہ ہمارے تمام حضرات ابھی تک اس سیدھی راہ کی تعین سے محروم ہیں. اور وہ راہ صرف حکومت الٰہی قرآنی اور اس کے نظام اقتصادی کی تبلیغ میں جہاد وعملی اور اس کے لئے قیام مرکز ہے.

اللھم ھل بلغت! فتقبل منی انک انت السمیع العلیم وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین.

کابل ۲۰ ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ (اتوار ۱۹ جنوری ۱۹۴۱)

آفتاب وذرہ

ہماری زمین وآسمان کا آفتاب صرف اور صرف ایک ہی ہے یعنی کلام اللہ جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطہ سے ہم تک پہنچا اور حضرت ملک العلام کی حفاظت سے ہم میں محفوظ ہے. سنتِ نبوی وسیرت صحابہ رضی اللہ عنھم اجمعین اس کی نا قابل انکار شروح وتفاسیر ہیں بلکہ جز و سنتی. آپ اور ہم سب اس کے ایسے ذرات ہیں جن کے رخ توفیق الٰہی نے محض اپنے فضل سے اس آفتاب ہدایت کی طرف کر دیئے ہیں. کس قدر دلربا مساوات ہے اللہ اکبر! اسی پر ہم کو جم جانا چاہیے اور اسی کی حفاظت پر جان دینا چاہیے.

من وتو ہر دو خواجہ تاسانیم
بندۂ بارگاہ سلطانیم

فله الحمد علی ما وفقنا.

کل کی خبر نہیں اس لئے جلدی کرتا ہوں کہ

(الف) میری تسوید نہایت مجمل و ناکافی ہے. ضرور ایک اہل علم وقلم کی جماعت مرتب کر لی جائے جو اس اسلوب پر ایک شایان ضرورت مواد فراہم کر دے.

اسلوب سے میری مراد یہ ہے کہ یورپ کے حقوق کو اسلامی لباس پہنانے کے بجائے کتاب وسنت وسیرت شیخین سے اسلامی حقوق عصری ترتیب واسلوب پر مدون کئے جائیں. اور یورپین وغیر یورپین مخترعہ علم الحقوق (human rights) اور علم الحقوق الٰہی میں جو امتیازات ہیں ان کو انتہائی وضاحت کے ساتھ روشن کیا جائے.

(ب) علم حقوق الٰہیہ کی تبلیغ وحمایت کے لئے ایک منظّم جماعت جلد از جلد

وقف کار ہو جائے.

(ج) ۱-تمام قومی درسگاہوں (بشمول جامعہ ملیہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، حمایت الاسلام کالج لاہور.

۲-تمام عربی مدارس (دارالعلوم دیوبند، جامعہ اسلامیہ ڈابھیل، دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، مدرسہ امینیہ وغیرہ وغیرہ.

۳-سرکاری ہر صوبہ کے کالجوں اور اسکولوں میں مسلمان طلبہ کے لئے دستور اساسی امامت امت کی تعلیم داخلِ نصاب کرلی جائے تو ان مسائل کو سمجھنے میں سہولت ہوگی. **انصروا الله ینصرکم و یثبت اقدامکم.**

باب/ جواہر علمی

شعرالعجم کا ترجمہ

مولانا منصور انصاری کا ایک بڑا علمی کارنامہ علامہ شبلی نعمانی کی تحقیقی تصنیف شعرالعجم کا فارسی ترجمہ ہے.

شبلی نعمانی ایک عجیب وغریب شخصیت تھے جنہیں بجا طور پر ملت اسلامیان ہند کو دربار ربانی سے بطور انعام عطا کیا گیا تھا. اہل فکر کی مجبوری یا شامت ان کے اجتہادی خیالات وافکار ہوتے ہیں اور اسی لئے وہ کبھی کبھی معاشرہ میں تنقید، تنقیص تعریض وغیرہ کا نشانہ بنتے رہتے ہیں. شبلی کو بھی ان باتوں سے مفر نہیں تھا. لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کا دل ملت کے لئے دھڑکتا ہی نہیں تڑپتا تھا.

اٹھارھویں صدی کے آغاز سے غیر محسوس انحطاط جنوبی ایشیا پر سایئے پھیلا رہا تھا. سلطنت مغلیہ کی مرکزیت کو اگرچہ سارا ملک تسلیم کرتا تھا لیکن ملک کے روایتی انتشار پسند عناصر پھر سر اٹھانے لگے تھے اور حریص وبدباطن یورپی در پردہ ان عناصر کی سرپرستی کر رہے تھے اور ان کے خودغرضانہ عزائم کو اپنے تجارتی، معاشی اور سیاسی مفادات میں استعمال بھی کر رہے تھے. استحصال کا یہ بدبختانہ طریقہ بھی انہی احسان فراموش اور بے تہذیب یورپی بالخصوص برطانوی تاجروں کی ایجاد تھا. اسی فساد فکر سے یہ فریب بھی پھیلایا گیا تھا کہ انگریزوں کے آنے سے پہلے سرزمین ایشیا کے مسلمان جہالت کے مارے ہوئے تھے جنہوں نے کبھی نہ علم ودانش کی روشنی دیکھی تھی اور نہ کبھی تہذیب سے ان کا واسطہ رہا تھا. تمدن کے جو بیگاری یہ جھوٹ ہندستانیوں کے حلق سے نیچے اتار رہے تھے وہ لال قلعہ اور تاج محل کی دیواروں کے پھول بوٹوں سے جواہرات نوچ نوچ کر لندن کی تاریخ گلیوں میں اپنے کلبے بھی بنا رہے تھے.

اس زمانہ میں شبلی نعمانی کو سر سید نے علی گڑھ بلا کر عربی کا استاد مقرر کیا. وہاں بھی اس زہر پر شکر لپیٹ کر پیش کیا جاتا تھا شبلی نعمانی اس کیفیت کو برداشت نہ کر سکے اور کالج سے یکسوئی اختیار کر کے انہوں نے ''ہیروز آف اسلام'' کے عنوان سے تحقیق گرانقدر تحقیقی تصانیف کی مہم شروع کی. اس مہم کے ماتحت انہوں نے امیر المومنین عمر ابن خطاب، امام ابو حنیفہ، امام غزالی اور مامون الرشید کی سوانح الفاروق، النعمان، الغزالی، المامون کے علاوہ حیات خسرو، حیات سعدی، حیات مولانا روم، سوانح فردوسی، سوانح عالمگیر، سوانح زیب النسا بیگم کے عنوانات سے کتابیں تحریر کیں. موازنہ انیس و دبیر ایک اعتبار سے میر امن اور رجب علی بیگ سرور کی اساطیر کا علمی جواب تھا جو علامہ شبلی نے گلکرسٹ کو دیا تھا علم کلام پر الکلام بھی اسلامی تہذیب کی ایک اہم علمی خدمت کا تعارف ہے.

علامہ شبلی کی سب سے شاندار تحقیق سیرۃ النبی کی ایک مبسوط دستاویزی کتاب کا خاکہ تیار کرنا اور اس کی پہلی دو جلدیں تحریر بھی کرنا ہے. شبلی کے منصوبہ کے مطابق اس کی باقی چار جلدیں شبلی کے جانشین مولانا سید سلیمان ندوی نے تحریر کیں اور ساتھ ہی پہلی دو جلدوں پر نظر ثانی بھی کی. علامہ شبلی کی تمام تصانیف ایک طرف، اس میں شک نہیں کہ سیرۃ النبی ان کی شاہکار تصنیف ہے. اسے جو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی ہے وہ بے شک انعام ربانی اور شبلی نیز سید سلیمان ندوی کے مغفرت کے لئے کافی ہے.

اسی سلسلہ کی ایک اہم تصنیف شعر العجم ہے جس میں علامہ شبلی نعمانی نے ہزار سال سے زیادہ مدت کی فارسی شاعری اور شعرا کا ایک بیش قیمت ناقدانہ جائزہ لیا ہے. ادبی محاذ پر شعر العجم شبلی کی دوسری شاہکار تصنیف ہے.

قیام افغانستان کے دوران مولانا محمد میاں منصور انصاری نے یہ کتاب دیکھی تو اسے افغانستان اور قبائل آزاد میں اپنی تعلیمی مہم کے لئے مفید پایا. فارسی، جو افغانستان میں دری کہلاتی ہے، صدیوں سے اس خطہ کی علمی زبان تھی، مگر ملی انحطاط کی تاریکی ماحول پر

اتری تو وہ ماضی ذہنوں سے بھی محو ہو گیا. دری بولنے والے افغانیوں میں علم کا ذوق پیدا کرنے کے لئے انہیں یہ بتانا ضروری تھا کہ ان کی تاریخ وقیع علم اور فکر انگیز ادب سے لبریز ہے اور علم وادب ان کی متاع کم گشتہ ہے. اس مقصد کے لئے مولانا منصور انصاری نے اس کتاب کا ترجمہ کرنے کی ٹھانی.

مولانا منصور انصاری کا یہ ترجمہ غالباً شائع نہیں ہوا اور قطعی طور پر یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ فارسی ترجمہ کی یہ کتاب مکمل بھی ہوئی تھی یا نہیں. البتہ اپریل ۱۹۲۵ کے افغانستان کی وزارتِ معارف کے ایک خط سے اتنا اشارہ ملتا ہے کہ ترجمۂ شعرالعجم کے کچھ مسودے مولانا منصور انصاری کے پاس رہ گئے تھے جنہیں بھیجنے کا تقاضا کیا گیا تھا.

ممکن ہے اپنی گونا گوں سیاسی، سفارتی، علمی اور تعلیمی مشغولیات کی وجہ سے وہ خود اس ضخیم کتاب کا ترجمہ نہ کر سکے ہوں اور کسی دوسرے شخص کو اس کام مامور کر دیا ہو. تحقیق سے اس قدر معلوم ہوا ہے کہ ۱۹۲۷ میں افغانستان میں برہان الدین خان کشلکی نے کم از کم چوتھی جلد کا فارسی ترجمہ کیا تھا جو بازار میں ملتا ہے. یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ برہان الدین خان نے یہ ترجمہ مولانا منصور انصاری کی ایماء پر کیا تھا یا اس کا کوئی سبب تھا. ایران میں تقی فخر داعی گیلانی کا ترجمہ بھی رائج ہے.

بہرحال یہ معاملہ شبلیات اور منصوریات دونوں میں تحقیق طلب ہے.

باب/حکومت الٰہی

انقلاب فکر و نظر

دنیا میں خواب غفلت میں رہنے والوں کی تعداد جاگنے والوں سے کہیں زیادہ رہی ہے. اور جگانے والوں کی تعداد تو ہمیشہ آٹے میں نمک سے بھی کم رہی ہے. اس آخری جماعت کے بزرگ ترین افراد انبیاء و رسل تھے. ہزاروں انبیا و رسل میں سے چند ہی کا ذکر ہماری دو چار آسمانی کتابوں میں آیا ہے، اور جن جاگنے والوں کا ذکر آیا ہے ان کو سونے والی قوموں نے کس قدر تنگ کیا ہے اس سے بھی کم از کم مسلمان - اور کم تر درجہ میں یہودی اور عیسائی - واقف ہیں. مگر حیرانی کی بات یہ ہے کہ ہم مسلم، یہودی اور عیسائی اس کے باوجود اوروں کو جگانے اور خود جاگنے پر خواب غفلت کو ترجیح دیتے ہیں اور جگانے والوں کی باتوں پر کان نہیں دھرتے.

ابتدائی دور کے انبیاء برسہا برس کی جدوجہد کے بعد اپنی قوم کے لئے اللہ سے وہ مانگ لیتے تھے جس سے وہ برسوں اجتناب کرتے آتے تھے. عذاب! عہد ابراہیمی کے بعد یہ طریقہ بدلا. خطا کار قوموں کے لئے بھی باد رحمت چلنے لگی. پھر نبی الرحمہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عہد مبارک آیا تو غلط کار قوموں اور معاشروں سے مکمل مایوسی کی اجازت منسوخ ہوئی اور سونے والے معاشروں، خصوصا خوابیدہ مسلم معاشروں، کے حق میں فقط دعا اور دائمی جدوجہد کی سنت کو تا قیامت قائم کر دیا گیا. چنانچہ اب ملی اصلاح کا داعیہ رکھنے والے ایک پہلو سے ناکام ہوتے ہیں تو عمل کا رخ کسی دوسری سمت پھیر دیتے ہیں، ایک زمین میں فصل نہیں اگتی تو کسی نئی زمین کی طرف توجہ کرتے ہیں.

مولانا محمد میاں منصور انصاری کی زندگی میں نہ جانے کتنی بار جد جہد بے نتیجہ

ثابت ہوئی مگر ہر بار انہوں نے اپنے افکار کا جائزہ لیا اور کتاب اللہ وسنت رسول اللہ سے رہنمائی لے کر کسی نئے منصوبے پر کام کرنا شروع کر دیا.

وہ ہندستان کی آزادی کی جدوجہد کا عنوان بن کر ۱۹۱۵میں بے وطن ہوئے تھے. یہ خواب افغانستان کی سنگلاخ سیاست پر ٹوٹ کر بکھرا. امیر حبیب اللہ خان انگریزوں سے جا ملے. بچہ سقہ تو تھا ہی انگریزوں کا ہرکارہ. امیر امان اللہ خان نے انگریزوں سے معاہدہ کیا تو ان کی فاتح فوج کے جنود ربانیہ کو خون افشانی کی داد نہ ملی.

حالات بدلے تو مولانا منصور انصاری نے افغانستان کی سفارتی خدمت قبول کر لی. روس کی سفارت بالشویک سیاسی مزدوروں کے سیاسی ہراس کی وجہ سے بے نتیجہ رہ گئی. اتاترک کے نئے قومی ترکی میں انہیں ہم نوا ملے نہیں یا ایسے ترکوں کی آوازیں اس قدر کمزور ہو گئی تھیں کہ کسی کان تک پہنچنے کی سکت کھو بیٹھیں.

ایک بار پھر مولانا منصور انصاری نے زاویۂ عمل بدلا اور افغانوں اور سرحدی پٹھانوں کی تعلیم کے منصوبہ پر متوجہ ہو گئے. اس میدان میں انہیں خاصی کامیابی ہوئی اور کہا جا سکتا ہے کہ آج افغانستان اور قبائل آزاد علاقۂ سرحد میں تعلیم کا جو غلغلہ ہے اس کا سبب حاجی ترنگ زئی کے ساتھ مولانا منصور انصاری کی مساعی ہیں.

نظام سلطنت القرآن

میں ۱۳۳۴ھ/ ۱۹۱۶ میں دولت عثمانیہ کے نفیر عام کرنے پر جہاد کو فرض عین سمجھ کر وطن، آل اولاد، اور تمام عزیزوں قریبوں کو چھوڑ کر ہند سے نکلا. مگر امیر حبیب اللہ خان نے اس فرض عین کو اپنی تمام قوم کے ساتھ ادا نہیں کیا جس سے ان کی حکومت کا احترام میرے دل سے جاتا رہا.

اس کے بعد انقرہ پہنچ کر خود ترکوں کو دیکھا. ان میں بھی اسلام کے ساتھ ایسا ربط نہ دیکھا کہ جس کی وجہ سے ایک مسلمان ان کی رضا پر اپنی ہست و بود قربان کر کے خالق کی رضا کا امیدوار بن سکے.

اس لیے میں اپنی اس بے علمی پر اپنے مالک ملک الناس کے دربار میں نادم ہوں اور سخت نادم.

اب میرا نظریہ یہ ہے اور ایمان کہ کتاب و سنت اور سیرت نبوی و شیخین (حضرات ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما) سے نظام سلطنت القرآن مدون کر کے نئے سرے سے اس کی تبلیغ علمی ٹھوس اصولوں پر شروع کی جائے. میں ایمانداری سے صرف اسی میں اپنی اور تمام مبتلائے آلام بنی نوع انسان کی دنیا اور آخرت کی خیر دیکھتا ہوں.

اور المیہ یہ کہ آج دنیا کی قومیں ساعی ہیں کہ ایک متحدہ بین الاقوامی عالم میں مدغم ہو کر دنیا سے تعدد حکومتی کی عالم تباہ لعنت کو دیس نکالا دے دیں.

قرآن کریم کا ایک مقصد وحدت حکومت اور توحید فی الحکم ہے جس کی طرف آج کی انسانیت ایک صف بن کر روانہ ہو چکی ہے. اور اس میں اتحادی اور محوری، جاپانی اور

اشترا کی کا کوئی فرق نہیں ہے. اختلاف ہے تو اتنا کہ یہ عالم شمول انسانی اتحاد کس کے تحت قایم ہو.

حالات شاہد ہیں کہ یہ اتحاد عالم انسان ضرور قائم ہوگا اور قرآن عظیم کا سخت اصرار ہے کہ اس متحدہ کا قانون صرف وصرف وہی ہے.

میرا کام اول وآخر یہ ہے کہ تمام انسانی اقوام اوران کے متحدہ کو علم وصداقت کی روشنی میں سمجھاؤں کہ قرآن حمید کے اصرار کو قبول فرما لینے میں ہی ان کی خیر ہے.

اگر متحدہ کے بننے یا قبول کرنے سے پہلے بعض اقوام اس علمی اور تبلیغی سفر میں میرے ساتھی بن جائیں تو میں ان کی قوت کو اپنے اوراپنی ذی حق بنی نوع کے لیے ایک زبردست فال نیک اور سرمایۂ کامرانی وسعادت وفلاح سمجھوں گا. **اللھم ایاک نعبد وایاک نستعین اھدنا الصراط المستقیم آمین**

ان وجوہ سے میں اب کسی سلطنت کا قطعاً مخالف نہیں ہوں. بلکہ ہر قوم اوراس کی حکومت کا ہمدرد اور ان کی باہمی مخالفتوں میں افغانستان کی سیاست کا تابع یعنی بے طرف (غیر جانبدار) ہوں.

میری انسانی خدمت وطن کی آزادی سے نہایت بلند ہے. اوراس لیے میں اس کو وطن دوستوں کے لیے چھوڑتا ہوں اوران کی نیت اورراہ خدمت پراعتماد رکھتا ہوں.

والسلام

ابوحامد محمد ابن عبداللہ انصاری منصور عفاعنہ

۱۵شوال ۱۳۶۳ھ/ یکم اکتوبر ۱۹۴۴ کابل

ذہن سازی کی مہم

انسانوں پر اللہ کی حاکمیت کا نظریہ نیا نہیں مگر صدیوں کے تغافل اور بے توجہی کی وجہ سے اب خود مسلمانوں کو بھی نیا لگتا ہے. رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں ریاست مدینۃ النبی کے قیام، خلفائے راشدین کی مساعی سے اس کے استحکام کے بعد علمائے اسلام نے اسے ایک سیاسی نظریہ کے طور پر اس کا آئینی ہیکل مدون کرنا شروع کر دیا تھا.

تقریباً ایک ہزار سال کی مدت (۸۰۰ سے ۱۷۵۰ تک) میں کئی مسلم سیاسئین نے کلی یا جزوی طور پر اس اہم معاشرتی عمرانی علم اور اصول زندگی پر کام کیا ہے.

امام ابو یوسف (۷۳۸-۷۹۸) نے کتاب الخراج میں، امام ابوعبید قاسم ابن سلام (۷۷۱-۸۳۹) نے کتاب الاموال میں، امام ابو النصر فارابی (۸۷۲-۹۵۰) نے آراء اہل المدینۃ الفاضلہ میں، امام ابوالحسن ماوردی (۹۷۲-۱۰۵۸) نے الاحکام السلطانیہ والولایۃ الدینیہ میں، امام ابوالبقا الحسینی الکفوی (م:۱۰۹۵) نے کلیات العلوم میں، امام راغب اصفہانی (م:۱۱۰۹) نے الذریعہ الی مکارم الشریعہ میں، امام غزالی (۱۰۵۶-۱۱۱۱) نے احیاء العلوم، اور التبر المسبوک فی نصائح الملوک میں، امام ابن تیمیہ (۱۲۶۳-۱۳۲۸) نے السیاسۃ الشرعیہ فی اصلاح الراعی والرعیہ میں، شاہ ولی اللہ دہلوی (۱۷۰۳-۱۷۶۲) نے حجۃ اللہ البالغہ میں اس سیاسی نظریہ کو ایک مکمل علم سیاسیات کی شکل دی.

اس علم کا احیاء مولانا محمد میاں منصور انصاری نے تحریک ریشمی رومال کے خاتمہ کے فوراً بعد ۱۹۱۷ میں کیا. انہوں نے کام کا آغاز چند متفق الخیال احباب کے نام خطوط میں کیا. پھر ان افکار کو رسالوں اور کتابوں کی شکل میں ترتیب دیا جنہیں مجلس دستور امت نے

بجنور سے شائع کر دیا تھا. بعد میں ان کے صاحبزادہ مولانا حامد الانصاری غازی نے ۱۹۳۸-۱۹۴۱ کے دوران اس نظریہ کو ایک مکمل سیاسی فکری سائنس اور اساسی دستور کے طور پر اپنی ابتکاری تالیف اسلام کا نظام حکومت میں پیش کیا.

اس مستقل سیاسی نظریہ کو عمل میں پذیرائی نہ ملی. اس کے دو بنیادی سبب تھے.

اول تو مسیحی یورپ میں علی الترتیب دینی آزردگی، اصلاح کلیسا، نشأۃ الثانیہ، مادیت کے سیلاب، صنعتی انقلاب، قوم پرستی اور مارکسیت کے تدریجی واقعات نے سیاست کو مذہب (یعنی کلیسائی عیسائیت) سے لاتعلق کر دیا تو دینی اساس پر مرتب کوئی سیاسی نظریہ بلاتحقیق مسترد کیا جانے لگا. چونکہ باقی دنیا کو یورپی استعمار اور مادی ارتقا بدترین احساس کمتری میں مبتلا کر چکا تھا اور اس کی ذہن سازی یورپی-امریکی تصورات پر مبنی عالمی نظام تعلیم میں ہو رہی تھی اس لئے ایسی کوئی جدید یا تجدید فکر لوگوں کی بساط فہم سے باہر ہو گئی جو یورپی تعلیمیہ میں مستند نہ سمجھی جائے.

دوسرا سبب یہ تھا کہ پہلی عالمی جنگ کے بعد مسلمانوں سے ظاہری نسبت کے ساتھ جو جغرافیائی یا نسلی اقوام بساط عالم پر ابھری تھیں وہ تمام پرانے اور نئے ملک مطلق العنان بادشاہتوں، قہرناک آمریتوں، نااہل، ناخواندہ یا نیم خواندہ بادشاہوں، بے شعور وزیروں، خوشامد خور مشیروں کی ذاتی اغراض کے مارے ہوئے تھے. اکثر مسلم حکمراں سابق یورپی استعماری ملکوں کے ارباب سیاست کے کارندے تھے، اور ایمانی فراست، بے قید غور و فکر اور آزاد عمل سے عاری تھے، اور اکثر اب بھی ہیں. مسلم آبادیوں والے ان ملکوں میں کسی نوع کے اسلامی نظام کی عزت سے عوام و خواص اور حکمرانوں کے دل خالی تھے. چنانچہ ان ملکوں میں کہیں بھی اسلامی نظام کی آواز بازگشت نہیں بن سکی.

بے شک بیسویں صدی کے وسط میں مسلم اہل علم کے ایک محدود طبقہ میں یہ نقطۂ نظر مقبول ہوا مگر اس تصور کو پیش کرنے والے افراد کے بارے میں ایسی روایات یا شواہد بھی

پائے جاتے ہیں کہ وہ افراد خود بھی یورپی تعلیمیہ ہی کے پروردہ تھے. اس کی دلیل یہ ہے کہ ان کے افکار کو مغربی دنیا میں اسلامی سیاسیات کے خلاف پروپیگنڈے میں عام طور سے استعمال کیا جاتا ہے لیکن وہ افکار خود ان کے ملکوں میں ان کی قوموں کے لئے قابل قبول اور قابل عمل نہ ہوئے. تاہم اب اکیسویں صدی میں دو ایک ملکوں میں اسلام کی طرف رجوع کی چند آوازیں سیاست کے ایوانوں میں سنی جارہی ہیں، مگر یہ صاف معلوم نہیں ہوتا کہ ان آوازوں کے پیچھے کوئی محکم فکر ہے یا یہ محض ایک مخلصانہ خواہش ہیں.

ہزار سالہ تاریخ میں اپنے پیش رووں کی مانند مولانا محمد میاں منصور انصاری بھی بس ایک آواز سے زیادہ کچھ ثابت نہ ہوئے. وہ تیس سال تک دنیا کے مسلمانوں اور غیر مسلموں کو اس سمت میں بلاتے رہے. انہوں نے اپنے بزرگوں، ہم عصروں، دانشوروں، شاگردوں کو اس سمت توجہ دلائی مگر ہر طرف سے خاموشی ان کے درد کا صلہ قرار پائی.

ہر آواز کے سنے جانے، ہر فکر پر عمل آوری کا وقت تقدیر الٰہی میں طے ہوتا ہے. کسی قوم کے حق میں وہ وقت کب آنا ہے اس کی حکمت کو وہی جانتا ہے جو تقدیریں لکھتا ہے. اسی لئے اہل فکر و شعور مایوسی میں پڑنے کے بجائے برابر آواز لگاتے رہتے ہیں، لوگوں کو اس حقیقت کی طرف بلاتے رہتے ہیں جو اللہ نے ان پر الہام کی ہے. بارہا ہوا ہے کہ ایک آواز کی لہروں کو عمل کے کنارے پر پہنچنے میں طویل وقت لگ جاتا ہے. مگر وہ وقت آکر رہتا ہے جب قوم کے ضمیر پر حق کھل جاتا ہے جو کبھی ثواب دارین کا موجب ہوتا ہے اور کبھی عذاب دارین کا. یہی حکمت ہے کہ جلیل القدر انبیاء میں حضرت نوح علیہ السلام کا ذکر قرآن حکیم میں کیا گیا تاکہ اسلامی نظریات کی تبلیغ کرنے والے اپنے ذمہ داری کو لگاتار پورا کرتے رہیں خواہ اس مہم میں نوسو پچاس سال محنت کرنی پڑے.

یہی مولانا محمد میاں منصور انصاری کا وظیفۂ حیات تھا. وہ زندگی بھر یہ کام کرتے رہے. تکمیل جب بھی ہوگی، ثواب کا حصہ انہیں بھی ملے گا.

ذہن سازی کے اسی مقصد کے لئے جامعہ ملیہ اسلامیہ قائم کیا گیا تھا. اپنے ابتدائی دور میں جامعہ بہت مختلف مدرسہ تھا. ایک عظیم مقصد کے لئے شیخ الہند نے ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ کو علی گڑھ کالج کی مسجد میں ایک اجلاس کے دوران یہ انقلابی ادارہ قائم کیا تھا.

انقلاب آ بھی جائے تو بعد کی نسلیں بے شعوری سے اس کی موت کا باعث بن جاتی ہیں. اس ادارہ کے اساسی مقصد کے مطابق ابتدائی زمانہ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ میں تفسیر قرآن کا شعبہ بھی تھا اور اس کا پروفیسر شیخ التفسیر ہوتا تھا. اولین دور میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ایک شیخ الجامعہ (وائس چانسلر) مولانا مفتی کفایت اللہ تھے. مگر جلد ہی اس کے تاسیسی مقصد سے اسلامیہ کی صفت حذف ہوگئی.

مولانا محمد میاں منصور انصاری کے لئے جامعہ ملیہ اسلامیہ ان کے استاذ اور مربی شیخ الہند مولانا محمود الحسن کی یادگار تھا. یہ ادارہ ایک تعلیمی نظریہ کا عنوان تھا. اسے ایک انقلاب کا نقیب بنایا گیا تھا. جب یہ قائم ہوا تو ملک میں اداروں کی بھی کمی نہیں تھی اور یونیورسٹیاں بھی خاصی تعداد میں تھیں. نہ ادارہ سازی اس کی غایت وجود تھی نہ یونیورسٹیوں کی گنتی بڑھانا مقصود تھا. اس کی انفرادیت ذہن سازی میں تھی. مولانا محمد میاں منصور انصاری اس ذہن سازمہم کے سالار اعظم تھے. وہ اپنی بے وطنی اور منتشر زندگی کے باوجود ایسے ہر شخص سے رابطہ قائم کرتے تھے جو ملت کے مستقبل کی تعمیر سے دلچسپی رکھتا ہو یا اس مہم میں کوئی کردار ادا کر رہا ہو یا اس عملی کردار کے پرچار کی صلاحیت رکھتا ہو.

اسلامیان عالم میں انقلاب کے نقیب کے ایسے ایک مخاطب مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی تھے، جو مولانا منصور انصاری کی طرح شیخ الہند کے شاگرد رشید تھے. اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شیخ الجامعہ کی حیثیت سے نئی نسلوں کے مربی بھی تھے. مولانا منصور انصاری نے ایک مکتوب میں انہیں شیخ الہند کی مہم کی غایت یاد دلائی اور اس سلسلہ میں اپنی تحریروں کا تعارف کروایا اور تعاون کے خواستگار ہوئے. --م ط غ

مولانا مفتی کفایت اللہ سے خطاب

شیخ الجامعہ کے نام خط

۲۱ جمادی الاولی ۱۳۵۳ / ۲ دسمبر ۱۹۳۴

از کابل

حضرت المحترم شیخ الجامعہ السلام علیکم ورحمۃ اللہ

حضرت الاستاذ شیخ الہند رحمہ اللہ علیہ کو جو علاقہ جامعہ (ملیہ اسلامیہ) کے ساتھ تھا اس کا اثر آپ کے ہر زیارت کرنے والے کے دل پر ہونا چاہیے. اس آوارۂ ناکام کا بھی یہ رشتہ جامعہ سے قائم ہے اور اس کی کامیابی کے لئے دست بدعاء رہتا ہوں.

اس لئے مضبوط رشتہ کی بنا پر عرصہ سے خیال کر رہا تھا کہ اپنے بعض خیالات جو عام بشریت کی خدمت کے خیال سے عرض کرنے ضروری ہیں جامعہ کے مربیان روحانی کے حضور میں پیش کرنے کا شرف حاصل کروں تا کہ اگر ان ناقص مساعی سے ان کو روحانی مناسبت ہو تو اپنی روحانی اور علمی اولاد کی روح میں ان اصول کے پیوست کرنے کا بندوبست فرمائیں.

خدا کا شکر ہے کہ آج اپنے تین آثار (انواع الدول، حکومت الٰہی، مجمل اعلان تبعیۃ) خدمت عالی میں ارسال کرنے کا فخر حاصل کر رہا ہوں.

''انواع الدول'' میرے عرائض اجتماعیہ کا حکم رکھتی ہے اس سے ''حکومت الٰہی'' تعالےٰ شانہ کی اصلاحات پر روشنی پڑتی ہے اور ''تفسیر مجمل فاتحہ'' دعویٰ حکومت الٰہی کے لئے قرآن حکیم کی اساس پر مبنی ہے.

یہ آوارہ اس موقع پر یہ عرض کرنا ضروری تصور کرتا ہے کہ میں نے سیاسیات اور

علوم کو مطلق نہیں پڑھا اور نہ یورپ کی زبانوں سے ہی آشنا ہوں، اس لئے میرا سارا کیا دھرا ایک ناخواندہ کا دخل در معقولات کا حکم رکھتا ہے.

مجھے خدائے علاّم کی ربوبیت مطلقہ نے موقع دیا کہ افغانستان کی سفارت رسمیہ کے عضو کی حیثیت سے دنیا کی دولی تشکیلات اور تازہ مدنی جزئیات کو عملاً دیکھوں. اس لئے مجھے جو دکھایا گیا ہے اس کو اپنے خود ساختہ اصطلاحات میں عرض کر رہا ہوں. الحمد للہ آپ حضرات مسلّم اساتذۂ فن ہیں آپ کے لئے آسان ہے کہ آپ میرے الفاظ کو علمی اصطلاحات کا جامہ پہنائیں اور جہاں میں نے ٹھوکر کھائی ہو وہاں میرا ہاتھ تھامیں.

میری عملی زندگی نے مشاہدات و تجربات کی روشنی میں نظام حکومت کے متعلق چند سوالات پیدا کر لئے. اور اپنی آنکھوں نے دیکھا کہ عالم اور تجربہ کار حضرات دنیا کو ان کے جوابات اپنے ممدوح افکار اور انسانی تجربہ یا عقلی فلسفوں سے دے رہے ہیں اور بے علم عالمِ اسلام عام دنیا کے بزرگوں سے سن سنا کر ان انسانی اصولوں کے لئے فداکارانہ جہاد میں کھوئے ہوئے ہیں.. اس آوارہ نے اپنے سوالات کو اسلام کے اصول ناطق پر پیش کر کے جواب حاصل کیا ہے اور عقل کو بھی اوسطاً موئید پایا ہے اور ان مطبوع و غیر مطبوع عرائض کے ذریعہ سے عرض کرنا چاہا ہے. میرا خیال ہے کہ جب تک ہم کوئی عملی پروگرام پیش نہیں کریں گے کامیاب نہیں ہوسکیں گے. اگر آج عام دنیا اور خاص عالم اسلام بستر مرگ پر پڑے ہوئے جان توڑ رہے ہیں تو اس کی صرف یہ وجہ ہے کہ. جن لوگوں نے عمل سے ہٹ کر صرف علم تک اپنے کو محدود رکھا ہے ان کی مثال ایسی ہے جیسے انہوں نے شفاخانوں کی بجائے ایسے اداروں میں اپنے آپ کو داخل کر دیا ہے جہاں دوا کے بجائے ان کو جراثیم مہلکہ کا کلچر پلایا جاتا ہے.

انواع الدول نہایت ناقص اور حکومت الٰہی ابتدائی حالت میں طبع ہوئی تھیں جس کی وجہ سے کچھ خامیاں رہ گئیں. اس لئے انواع الدول پر نظر ثانی کر کے مکمل کر لیا گیا ہے.

اور حکومت الٰہی کا اردو ترجمہ کیا ہے جس میں وہ بھی نظر ثانی ہو کر مکمل تر ہوگئی ہے. ابھی یہ دونوں دوسری مرتبہ طبع نہیں ہوسکیں. ہوسکا تو ان کو طبع یا نقل کرا کر حاضر خدمت کروں گا. انشاء اللہ تعالیٰ.

تفسیر فاتحہ کا جز و دوم (اعلان تبعیت مفصل) بھی تیار مگر غیر مطبوع ہے. آرزو ہے کہ اس کا مطبوع یا منقول نسخہ کسی وقت تقدیم (پیش) کرسکوں. میری آپ حضرات سے یہ بھی درخواست ہے کہ ان تینوں آثارِ ناقص کو ملاحظہ فرما کر ان کی نسبت اپنی رائے عالی سے ضرور اطلاع بخشیں، تا کہ اختلاف کی صورت میں اصلاح ہو سکے اور اتفاق کی صورت میں آپ حضرات کو ایک مخلص کی ہمت افزائی کا ثواب ملے.

آخر میں یہ گذارش بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ جناب والا کو یہ بخوبی روشن ہے کہ امت اسلامیہ کا موجودہ افتراق اور جمود اور قعود اور امم غیر مسلمہ کا انقلابات جہاں سوز میں پہنچ کر قریب بہ فنا پہنچنا صرف اور صرف اس وجہ سے ہے کہ زندگی کا صحیح نقطۂ نظر نہیں رہا، اور چونکہ بدون صحیح نقطۂ نظر کے پیش نظر ہونے کے اور بدون اس کے دل ربا یا نہ مقناطیسیت کے نہ کسی امت میں جذبۂ عمل پیدا ہوسکتا ہے اور نہ وحدت افکار علی الخصوص آج امت اسلامیہ کے سامنے کوئی صحیح نقطۂ نظر پیش نہیں کیا جا رہا ہے. اس لیے اس کی بے حسی اور بے احساسی بھی دور ہونے میں نہیں آتی اور وہ جاہد ہونے کے بجائے برابر قعود ہی کو اپنا مابہ الامتیاز مایۂ ناز بنائے ہوئے ہے.

امم غیر مسلمہ کے سامنے نقطۂ نظری ضرور ہیں مگر سب غیر صحیح حتیٰ کہ بعض غیر انسانی ہیں. یہی وجہ ہے کہ ان کے عظیم الشان مجاہدات نے بحران فلاکت زا کو دن دونی رات چوگنی ترقی دے کر دنیا کو عدم تام (مکمل تباہی) کے کنارہ پر لا کر کھڑا کر دیا ہے.

اس لئے آج پہلے سے زیادہ فرض انسانی ہے کہ انسانیت کو صحیح نقطۂ نظر کی تعلیم و تبلیغ کی جائے جس سے قائدین جاہدین بن سکیں اور جاہدین راہ راست کی مقناطیسیت

سے ان کے ساتھ ایک صحیح انسانی مرکز پر جمع ہوسکیں.

مجھے یہ سمجھایا گیا ہے کہ بشریت عقلیہ کا صحیح نقطہ نظر ''حکومت الٰہی کی تبعیت'' اور ''قوت اصلی کی غلامی اور عبدیت'' ہے.

اگر میری اس عرض میں کوئی صداقت ہو تو علماء جامعہ ملیہ اس کے سب سے زیادہ مستحق ہیں کہ اس کے تعبیری نقائص کو دور فرما کر اس کو دنیائے جاہد اور عالم جاہد (دونوں) کے سامنے پیش فرمائیں اور اجر ہادیت سے سرفراز ہوں.

میرے نزدیک مسلم ہند میں پرانی اور نئی تعلیم کی برکت سے اس قدر قابلیت حاصل ہو چکی ہے کہ وہ صحیح نقطۂ نظر کے جہاد اکبر (تبلیغ لسانی) کی امانت کے سنگین ترین بار کو اٹھا سکے اور اپنے گردوپیش کی اقوام (انگریز، ہندو، سکھ، بدھ، فرسی، عیسوی، وغیرہ) کے سامنے پیش کرنے کا بندوبست فرما سکے اور اپنے لئے بھی ایک ہدف عمل کو جلوہ دے سکے.

ناکام، فقط والسلام مع الاکرام

منصور انصاری غازی

مکرر یہ کہ انواع الدول اور حکومت الٰہی جامعہ کے اساتذہ کی خدمت میں ارسال ہے تاکہ اپنے اجتماعی نظریہ سے اس آوارہ کو شرف بخشیں. مختصر تفسیر فاتحہ جو ابھی تک طبع نہیں ہوئی بطور تذکار جناب کی خدمت میں ارسال ہے اور درخواست ہے کہ اس کو بھی حضرات اساتذہ کے مطالعہ کے بعد ان کی رائے سے اطلاع بخشی جائے.

☆

ان دستاویزوں پر جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اساتذہ کے ردعمل کے بارے میں کچھ علم نہیں. جامعہ کی قدیم دستاویزوں میں تحقیق کی جائے تو شاید کچھ خبر ملے.

اسلامی سیاسی نظریہ

مولانا محمد میاں منصور انصاری تحریک ریشمی رومال کے بعد ۱۹۱۷ میں قرآنی سیاسیات پر متوجہ ہو چکے تھے. رفتہ رفتہ یہ توجہ ایک نظریہ میں مرتب ہونے لگی اور انہوں نے ۱۳۴۴/ ۱۹۲۵ سے پہلے حکومت الٰہی اور اجتماعیات میں اللہ کی نیابت کا اسلامی سیاسی نظریہ اور اس کا اجمالی نقشۂ عمل پیش کر دیا تھا. مگر یہ نظریہ فکر سے آگے عام تحریک نہ بن سکا. چونکہ انہوں نے بطور فردیہ کام کیا تھا اور اس امر میں انہیں نہ تو ہم فکر اور ہم نوا رفقاء کار ملے، نہ اس مقصد کو خواص وعوام میں مقبول بنانے کی غرض سے انہوں نے کوئی جماعت قائم کی، نہ کسی جگہ مناسب ماحول بنایا .اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ انقلابی نقطہ نظر چند مختصر رسالوں سے زیادہ آگے نہ بڑھ سکا.

ان کی علمی تنہائی کا ایک بڑا سبب ان کے مخاطبین تھے. اس انقلابی نظریہ پر وہ اپنے برادران علمی کو توجہ دلاتے رہے جنہیں اس نظریہ کو برپا کرنے کا حوصلہ نہیں تھا.

اس موضوع پر مولانا منصور انصاری نے جو خطوط ہندستان اور قبائل آزاد کے مختلف بااثر اصحاب کو لکھے ان میں ۱۸ شعبان ۱۳۴۳ (۱۴ مارچ ۱۹۲۵) کا تحریر کردہ ایک خط بغیر سرنامہ کے ان کے کاغذات میں ملا ہے. یہ واضح نہیں کہ یہ خط کن حضرات کے نام لکھا گیا تھا. ایک مقام پر خط کے متن میں '' آن محترمین'' کا فقرہ اشارہ کرتا ہے کہ اس باب میں دیگر مکاتیب کی طرح یہ مکتوب بھی دو یا چند ممتاز اور عملی زندگی میں نسبتاً موثر اصحاب کو بھیجا گیا تھا.

مکتوب الیہ کے نام سے خط کا اعتبار دونا ہو جاتا ہے مگر اس مکتوب میں جو نکات زیر تحریر آئے ہیں وہ آج بھی عالم انسانی کی پریشانی کا باعث ہیں بلکہ سو سال پہلے کے مقابلہ میں بحران آج زیادہ سنگین ہو گیا ہے. اس پس منظر میں یہ مکتوب خاصا اہم ہے.

قرطاس ابیض

دو رسالے جو اس آوارۂ ناکام کی تالیف ہیں ابلاغ خدمت سامی کر کے شرف حاصل کرتا ہوں. رسالۂ اول ''انواع الدول'' حکومت الٰہی کا مقدمہ ہے جس سے حکومتِ الٰہی کا امتیاز اور فرق اختراعی اور انسانی حکومتوں سے پوری طرح سمجھ میں آجاتا ہے.

میرا علم جہاں تک کام کرتا ہے فطری حکومت کا صحیح امتیاز مخترعہ حکومتوں سے ایک بے حد ضروری مسئلہ ہے جس پر علمائے امت نے اب تک شایانِ شان توجہ نہیں فرمائی تھی. یہ میدان بالکل تشنۂ عمل چلا آرہا تھا، اور عصری علماء بھی اس مسئلہ میں اجانب (غیروں) کی اجتماعی مصنوعات کے مقلد بن کر فطرت کی تبلیغ سے محروم ہو چکے تھے. اس کا نتیجہ تھا کہ مدعیانِ علمبرداریٔ خلافت یعنی ترکوں کی جماعت اتحاد وترقی (Committee for Unity and Progress - CUP) نے دستوری انسانی اور مدافعۂ ملیہ نے جمہوریۂ ترکیہ کی تاسیس کی اجنبی ساز غلطی کی اور خلافت کی اصلاح کی بجائے اس نظام کو محو کرنا وظیفۂ حیات جانا.

خدائے علیم نے اس ننگ اسلاف کو جو قلمی عمل کی توفیق اس ضروری میدان میں بخشی ہے وہ جناب کے سامنے ہے. امید ہے کہ اس کو اپنے خاص سکون وتوازن فکر کی ساعتوں میں ملاحظہ فرما کر اپنے اصلاحی افکار سے اپنے آوارۂ وطن کو مطلع فرمادیں گے.

انواع الدول میں ضمنی طور پر عموماً ہند اور خاص مسلمانانِ ہند کے مسائل پر بھی خصوصی افکار پیش کئے گئے ہیں. ان پر بھی خصوصی توجہ کا متمنی ہوں.

رسالۂ دویم ''حکومت الٰہی ودستور اساسی امامت امت'' اصلی نقطۂ نظر ہے جس کے انجام اور تکمیل دینے کے لیے حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کو اعلیٰ حضرت واقدس رب العلمین نے مبعوث فرما کر سلسلۂ رسل کو انجام اور تکمیل دینے کے لیے آپ صلی اللہ علیہ

وسلم کی ذات ستودہ صفات پر تمام فرمادیا ہے. اس مسئلہ کو جو عدیم المثال اہمیت حاصل ہے وہ خود آفتاب آسا روشن ہے

آفتاب آمد دلیل آفتاب

اس مسئلہ کو بھی اس دستوری اور روشن طرز پر کسی مولف نے نہیں سلجھایا. خدا کی مہربانی کے قربان کہ اس نے یہ بےنظیر خدمت بھی اس ننگ اسلام ومسلمین سے لے کر اپنی کارسازی مطلق کا کرشمہ دکھایا. **فالحمد لله علی ذلک**. کیا جناب اس آوارہ وطن کے اس خیال سے متفق ہو سکتے ہیں کہ اس رسالہ میں سادہ طرز میں مسلمانوں کے سامنے ان کے بھولے ہوئے سبق کا صفحہ ابتدائی کامیابی کے ساتھ کھول کر رکھ دیا ہے.

یہ آخرین مرضی الٰہی ہے جو کسی خاص قوم، رنگ، کسی خاص ملک کی ملکیت نہیں. یہ رب العلمین، رب الناس کی ملوکیت کا معاملہ ہے. اس لیے اس کی تبلیغ عمومی کی ضرورت ہے اور اشد ضرورت ہے کہ اجتماعیات کے اس سخت بحرانی زمانہ میں، جب کہ مشرق ومغرب کے اہل فکر اس سے نجات کے لیے نہایت ہی جدوجہد میں غریق ہیں اور نکلنے کی کوئی صورت نہیں دیکھتے، نجات کی اس یگانہ راہ کو ساری دنیا میں بسنے والوں کے ہر ایک کان میں پہنچا دیا جائے. جہاں تک میری شخصی طاقت کا تعلق تھا اور ہے اس کو میں نے کیا اور کر رہا ہوں اور کرتا رہوں گا بعونہ تعالیٰ، لیکن اس میں ہندستان کے اہل علم، اہل قلم، اہل ثروت کا اشتراک عمل بھی ہر حیثیت سے فرض ہے جس کی تبلیغ کا وظیفہ اس قرطاس ابیض کے ذریعہ سے ادا کر رہا ہوں.

ضرورت ہے کہ رسالۂ حکومت الٰہی اردو، عربی، انگریزی میں اشاعت پذیر ہو اور ناپیدا کنار (وسیع پیمانے پر) اس کی تبلیغ (اشاعت) کی جائے. حکومت الٰہی کا ترجمہ فارسی سے اردو میں یہ آوارہ خود کر چکا ہے جو فارسی سے زیادہ مکمل اور مرتب ہے. یہ ترجمہ ناظم مجلس دستور امت بجنور مولوی حامد الانصاری غازی کو روانہ کر دیا گیا ہے جن کا خیال ہے کہ اس کی اردو ہندستان کے موجودہ مذاق کے مطابق نہ ہونے کے باعث قابل اصلاح ہے.

ناظم مجلس دستور امت اپنی کم فرصتی اور قلت مایہ کے سبب اب تک اس پر نہ نظر اصلاحی کر سکے اور نہ طباعت کا سر شتہ ہے، اور عربی، انگریزی کا تو ترجمہ تک بھی نہیں ہوا.

اس کے علاوہ اس ناقص نے تفسیر قرآن حکیم بھی اجتماعی اصول پر پڑھانی اور لکھنی شروع کر رکھی ہے. سورۂ فاتحہ کی فارسی زبان میں تفسیر جس کا نام ''اعلان تبعیت'' ہے لکھی جا چکی ہے جس میں حکومت الٰہی پر بحث ونظر بعض حیثیتوں سے رسالہ حکومت الٰہی سے بھی زیادہ طمانیت بخش اور بلند پایہ ہے. اب ایک سال سے زیادہ گذرتا ہے کہ سورۂ بقرہ پر نظر ڈال رہا ہوں. ابھی مضمون ارتباط آیات زیر نظر ہے. حق تعالیٰ مدد فرما کر یہ بھی مکمل فرما دے. آمین.

اگر آن محترمین ان تبلیغی رسائل کے مطالعہ کے بعد اس آخرین فرمان الٰہی کی عصری طرز پر تبلیغ کو ضروری اور عالم انسانی کے لیے آب حیات اور بحران فنا ناپذیر اجتماعی سے اس کو وسیلۂ نجات تصور فرمائیں تو خود بنفس نفیس بھی مجلس دستور امت بجنور کی لازمی اعانت فرمائیں، اور اپنے اپنے حلقۂ اثر کے بزرگوں خوردوں اور دوستوں کو بھی اس کی ہر گونہ امداد کی طرف شوق فرمائیں. **واجرکم علی اللہ الملک القدوس العزیز الرحیم**

مجلس دستور امت کی امداد دو نقطۂ نظر پر مبنی ہونی چاہیے۔

اول : طباعت اور نشر کتب ورسائل

دویم : ناظم مجلس کی خلاصی اڈیٹری اخبار وغیرہ سے تا کہ اپنا پورا وقت اور پوری ہمت سفر اور حضر کے ذریعہ سے تبلیغ میں صرف کر سکے.

کابل. ۱۸ شعبان المعظم ۱۳۴۳ (۱۴ مارچ ۱۹۲۵)

جدید تفسیر کی ضرورت

افغانستان اور باقی نام کی مسلم دنیا کی حالت سے بددل ہوکر مولانا محمد میاں انصاری نے افغانستان کی عملی سیاست سے اپنے کو یکسو کیا اور تصنیفی و تالیفی خدمات میں مشغول ہو گئے. اس سلسلہ میں انہوں نے پہلے امیر محمد نادر خاں (نادر شاہ) کی ذہن سازی کرنی ضروری سمجھی تاکہ وہ بھی اس ضرورت کو محسوس کر سکیں اور کوئی درپردہ گروہ اس دیرینہ رفیق سے تعلقات میں رخنہ انداز نہ ہو.

قرآن حکیم افکار و حکم کا بحر ذخار ہے اور ہر میدان علم میں یگانۂ روزگار علماء نے دنیا کی ہر عزت مند زبان میں اس کی ہزار ہا تفاسیر سپرد قلم کی ہیں. یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے اور جب تک ایک اللہ کی ربانیت کا کلمۂ حق بلند کرنے والے علماء دین روئے زمین پر آباد ہیں یہ سلسلہ موقوف نہ ہوگا. مولانا محمد میاں منصور انصاری جنوبی ایشیا کے اس عبقری سلسلۂ فکر کی ساتویں آٹھویں نسل کے مفکر فرد تھے جس کے سر آغاز پر حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی نظریہ ساز شخصیت تھی جنہوں نے سلطنت مغلیہ کے انحطاط و زوال کے زمانہ میں اسلام کے سیاسی اور عمرانی احیاء کی مہم شروع کی تھی. وہ مہم شاہ عبدالعزیز، شاہ رفیع الدین، شاہ عبدلقادر، شاہ عبدالغنی، شاہ اسماعیل شہید، سید احمد بریلوی شہید، شاہ محمد اسحٰق، شاہ عبدالغنی مجددی، مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندی سے ہوتی ہوئی مولانا عبیداللہ سندھی اور مولانا محمد میاں منصور انصاری تک پہنچی تھی.

شاہ ولی وللہ کی تحریک تین سو سال سے اب فقط چند ذہنوں میں ہے یا اعلی دینی مدرسوں میں پڑھی اور پڑھائی جانے والی طالبعلمانہ شرحوں میں محدود ہے. شیخ الہند کی اس

چھوٹی سی فعال جماعت کے بعد یہ فلر وفلسفہ بھی عرب وعجم کے میدان عمل سے لا پتا ہے.
بیسویں صدی میں ولی اللہی جماعت نے سیاسی اور عمرانی فکری اور عملی قیادت کا میدان اہل مغرب کے لئے چھوڑ دیا تھا اور بلا امتیاز مسلم دنیا کی سیاست برطانیہ اور پھر عام مغرب کے افکار کے پروردہ ان افراد کے ہاتھوں میں رہ گئی جو حجۃ اللہ البالغہ کی ہجے بھی نہیں کر سکتے.

تحریک ریشمی رومال کی ناکامی اور شیخ الہند کی وفات کے بعد مولانا عبیداللہ سندھی نے ولی اللہی مہم کے فکری ابلاغ کے لئے خود کو وقف کیا اور مولانا منصور انصاری نے اس فکر کے اصلی منبع، قرآن حکیم، کی جدید تفسیر پر توجہ کی. ترجمہ وتفسیر تو بے شک مکمل ہوئی مگر حالات کی ناسازگاری، وسائل کے فقدان، ایک انقلابی عمرانی تفسیر کے خیال سے عوام و خواص نیز علما کی بے اعتنائی اور مولانا منصور انصاری کے انتقال کی وجہ سے یہ کام علامہ منصور انصاری کے منشا کے مطابق مکمل نہ ہوسکا.

مولانا انصاری اور مولانا سندھی اپنے استاذ مولانا شیخ الہند کی طرح بیک وقت عالم دین بھی تھے، مفکرین امت بھی، اور مجاہدین فی سبیل للہ بھی. ان تینوں بزرگوں کا منبع شوق اور ذوق عمل قرآن حکیم ہی تھا اور تینوں کا نقطہ نظر تھا کہ جب تک کہ مسلم عوام میں قرآنی علوم وافکار کا ذوق اور فہم پیدا نہ ہوگا کوئی انقلاب مسلم معاشروں میں کامیاب اور نتیجہ آفریں نہیں ہوسکتا. اسی نقطۂ نظر سے خود شیخ الہند نے بھی کتاب اللہ سے عوام الناس کو قریب تر کرنے کے لئے قرآن حکیم کا سلیس اردو زبان میں ترجمہ کیا تھا. اسی روش پر چلتے ہوئے مولانا محمد میاں منصور انصاری نے افغانستان کے حالات کے مدنظر فارسی میں قرآنی ترجمہ کی بنیاد ''اعلانِ تبعیت'' سے فراہم کی اور ساتھ ہی شیخ الہند کے فارسی/ دری زبان اور پشتو میں ترجمہ قرآن شروع کیا جس کی تکمیل ان کے انتقال کے بعد ہوئی.

انہوں نے وفات سے دو تین سال قبل ۱۹۴۳ میں یہ کام شروع کیا تھا. فروری سے جولائی ۱۹۴۳ کے وران انہوں نے نواب باجوڑ کی معرفت صدارت عظمی کو تقریبا بارہ خطوط

تحریر کئے اور ایک خط محمد نادر شاہ (ح:۱۹۲۹-۱۹۳۳) کو بھی لکھا جس میں ترجمہ کا ایک نسخہ بھیجنے کی اطلاع دی گئی تھی. اس خط پر کوئی تاریخ نہیں ہے لیکن غالب امکان ہے کہ یہ مارچ ۱۹۴۳ کا ہے کیونکہ صدارت عظمیٰ (مدیریت دوم) کا جو خط مولانا کے نام قرآن مجید کا ترجمہ موصول ہونے کے سلسلہ میں تحریر کیا گیا وہ ۳۱ مارچ ۱۹۴۳ء کا ہے.

ترجمہ کا کام محمد ظاہر شاہ (۱۹۱۴-۲۰۰۷) کے زمانہ حکومت میں بھی جاری رہا. ظاہر شاہ بھی دری زبان میں ترجمہ وتفسیرِ قرآن کے خواہشمند تھے اور ان کے فرمان کے مطابق مولانا منصور انصاری نے یہ کام جاری رکھا. اس وقت کے صدر اعظم (وزیر اعظم) سردار محمد ہاشم خان بارک زئی اس کام کی راست نگرانی کر رہے تھے. علامہ منصور انصاری کے نبیرہ عثمان منصور انصاری کی اطلاع کے بموجب مولانا منصور انصاری نے پانچ پاروں کی تفسیر مکمل کر لی تھی. پھر ان کی طبیعت ناساز ہوئی اور اس کام کو مکمل نہ کر سکے تو مولانا یعقوب حسن قریشی نے اس کی تکمیل کی. یہی تفسیر کابلی کہلاتی ہے جو افغانستان، ایران اور تاجکستان میں مقبول عام ہے. نبیرہ علامہ منصور انصاری محمد طارق غازی نے کینڈا کے شہر ٹورانٹو کی نواحی مضافاتی بستی وھٹی کی مسجد عائشہؓ میں اس تفسیر کی جلدیں دیکھی ہیں.

مولانا یعقوب حسن قریشی بھی ایک ہندی مہاجر ومجاہد تھے اور مولانا منصور انصاری کی صاحب زادی امیت اللہ انصاری ان کے بیٹے عبداللہ قریشی سے منسوب تھیں.

نادر شاہ کو توجہ دہانی

افغانستان میں انقلاب نادری اکتوبر ۱۹۲۹ کے بعد مولانا انصاری نے نئے حکمراں محمد نادر شاہ کی توجہ سب سے پہلے قرآن مجید کی تفسیر کی طرف مبذول کرائی. اس سلسلہ میں انہوں نے ۲ ربیع الاول ۱۳۵۰ھ (۱۸ جولائی ۱۹۳۱) کو نادر شاہ کو ایک خط تحریر کیا:

رمضان المبارک میں جب آپ سے ملاقات ہوئی تھی تب قرآن حکیم کی

خدمت کے سلسلہ میں آپ سے تبادلۂ خیال ہوا تھا. اس دن سے میں نے سوچ لیا تھا کہ اس کام کو انشاء اللہ سرانجام دینا ہے. چنانچہ میں خاموشی کے ساتھ اس کام میں لگ گیا اور الحمد للہ اب میں اپنی کوشش میں کامیاب ہو چکا ہوں اور اپنے فکری جہاد کے اس نمونہ کو آپ کی خدمت عالیہ میں پیش کر رہا ہوں. اس نمونہ سے مراد سورۂ فاتحہ شریف کی تفسیر موسوم اعلان تبیعیت ہے.

میرا خیال ہے کہ آنجناب اس تفسیر مبارک کو زیارت کے شرف سے نوازیں گے. یہ تفسیر موجودہ زمانہ کے تقاضوں کے مطابق لکھی گئی ہے اسے آپ اپنی امیدوں کی کامیابی کا پہلا قدم تصور فرمائیں گے.

یہ اس طویل خط کا ایک اقتباس ہے جو مولانا انصاری نے ''اعلان تبیعیت'' یعنی تفسیر سورۂ فاتحہ کی تکمیل کے بعد نادر شاہ کو لکھا تھا.

سورہ الفاتحہ سے آغاز

مفسرین نے سورۂ فاتحہ کو قرآن کا خلاصہ قرار دیا ہے اس لئے مولانا منصور انصاری نے اسی خلاصہ کو عوام کے قلوب میں اتارنے کے لئے اس کام کا آغاز کیا. اس تفسیر کا ماحصل یہ ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے اپنی اطاعت کے لئے دنیا میں بھیجا ہے تو ضروری ہے کہ وہ اللہ کا فرماں بردار بندہ خود بھی بنے اور دوسروں کو بھی بنانے کے لئے حتی المقدور کوشش کرے اور اس نظام کو مخلوق میں نافذ کرنے کی جد و جہد کرے جو اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں ودیعت کیا ہے اور جس کی تشریح انبیاء نے اور تکمیل خاتم الانبیاء حضرت محمدؐ نے عملاً نافذ کر کے دنیا میں حکومت الٰہیہ قائم کی.

یہ تفسیر اتفاقی امر نہیں تھی. مولانا منصور انصاری کو جب بھی موقع ملا علمی دنیا میں اس فکر کو پیش کرتے رہے. نادر شاہ درانی سے گفتگو کے بعد وہ اس مہم پر باقاعدہ لگ گئے اور اعلانِ تبیعیت کے علاوہ درج ذیل دیگر کتب بھی تصنیف کیں

۱- ضرورتِ ترجمہ باحتیاج انسان بقرآن عظیم الشان

۲- حکومت الٰہی، دستور اساسی امامت امت

۳- اساس انقلاب یا مراقبۂ نماز

ضروری ہے کہ ان کتب کا مختصر تعارف کرا دیا جائے تا کہ مولانا منصور انصاری کے بنیادی قرآنی فکر سامنے آسکے.

۱- ضرورت ترجمہ باحتیاج انسان بقرآن عظیم الشان

مولانا منصور انصاری کی یہ تالیف افغانستان کی وزارت تعلیم سے وابستہ ہونے (۱۹۲۳) کے فوراً بعد کی ہے. یہ کتاب دری زبان میں چھوٹے سائز کے تقریباً ساٹھ صفحات پر مشتمل ہے، جو فرماں روائے افغانستان کی ایماء پر عوام الناس میں قرآنی ذوق پیدا کرنے کی خاطر تالیف کی گئی ہے. کتاب کے سرورق پر سورہ رحمٰن کی ابتدائی آیات ''الرحمٰن علم القرآن خلق الانسان علمہ البیان جلی عبارت سے لکھی گئی ہیں.

کتاب از اول تا آخر فلسفیانہ رنگ لئے ہوئے ہے اس کے پہلے باب میں قرآن حکیم کی حکمت بالغہ کا موازنہ دنیا کے حکماء و فلاسفر کے نظریات سے کرتے ہوئے اس امر پر دلائل و شواہد پیش کئے گئے ہیں کہ مخلوق کی رہنمائی کا کام صرف کتاب اللہ سے لیا جا سکتا ہے، نیز یہ کہ اکثر حکماء و فلاسفہ کے وہ نظریات جو مبنی بر حقائق ہیں وہ قرآن عظیم سے ہی مستنبط ہیں. فرماتے ہیں:

قصر مقدس حقوق اساسی بر سنگ سنگینے قائم است کہ علماء حقوق آں را ''مرکز دولت''
وقرآن عظیم ''مرکز حکومت'' میخوانند.

حقوق اساسی کا مقدس محل اس مضبوط بنیاد پر قائم ہے جسے علماء حقوق ''مرکز دولت'' قرآن عظیم ''اور مرکز حکومت'' کہتا ہے.

وہ کہتے ہیں کہ حقوق انسان کے قدیم ترین فلاسفہ - سقراط، افلاطون، ارسطو

وغیرہ سے آخری عہد کے فلاسفر میکالے وغیرہ تک - بالا جماع یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ

برائے خلق خود یک فرد یا یک عنصر خلق مرکز دولت لازمی باشد

مخلوق کے ایک فرد یا ایک جماعت کے لئے مرکز دولت (ریاست) ہونا لازمی ہے.

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ فلاسفہ خدا شناس تو ہیں لیکن مخلوق کی سیاست میں اللہ تعالیٰ کو قبول نہیں کرتے.

مولانا منصور انصاری نے ابتدائی نصف کتاب میں فلاسفہ کے نظریات کا قرآنی نظریات سے موازنہ کرنے کے بعد یہ نتیجہ نکالا ہے کہ

کامرانی بشریت عظمیٰ در پیدائے نہائے سیاسی سہ (اول اقامت صلوٰۃ در حفاظت مرتبہ شرفِ خود؛ دوم قائم کردن امن وسلام در مملکت؛ سویم حاصل شدن آرام و سکون دل برائے انسان.

سیاسی میدان میں انسانی عظمت کی کامیابی تین باتوں پر منحصر ہے اول عبادت الٰہی (قیام نماز) اپنے شرف کے مرتبہ کی حفاظت کے لئے؛ دوسرے مملکت (ریاست) میں امن وسلامتی کا قیام؛ اور تیسرے انسان کے لئے دلی آرام وسکون کا حصول.

ان تینوں اصول کے مطالعہ سے مولانا منصور انصاری یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ تمام دنیا میں بنیادی حقوق کے فلسفہ کا نمونہ عمل قرآن مجید ہے تو اس کے پیغام کو عوام تک پہنچانے کی ضرورت ہے. چونکہ قرآن مجید عربی زبان میں نازل ہوا ہے اس لئے ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ تمام مسلمانانِ مملکت افغانستان کو عربی سیکھنے پر توجہ مرکوز کرتے، لیکن چونکہ یہ ممکن نہیں ہے اس لئے یہ ضروری ہے کہ قرآن مجید کو اس کے عربی متن کے ساتھ پڑھ کر اپنی زبان میں اس کے معانی ومطالب پر غور وفکر کیا جائے اور تدبر کے ساتھ اس کا عمیق مطالعہ کیا جائے. چنانچہ قرآن مجید کے ترجمہ کی ضرورت اسی لئے پیش آ رہی ہے کہ عوام اپنی مادری زبان کے ذریعہ اللہ کے کلام کو سمجھ سکیں اور ان حقوق سے واقف ہو سکیں جو اللہ تعالیٰ نے

قرآن حکیم میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت عطا کئے ہیں.

اس مختصر کتاب کے نصف آخیر میں ''مجمل حقوق اساسی قرآن عظیم'' کی وضاحت کی گئی ہے اسے مختلف طبقات میں تقسیم کر کے نظام حکومت پر سیر حاصل بحث میں بتایا ہے کہ حکومتِ الٰہیہ کا قیام کس طرح روبہ عمل لایا جاسکتا ہے اور حکومت علیٰ منہاج النبوۃ موجودہ دور میں کس طرح قائم کی جاسکتی ہے.

۲- کتاب اجتماعی، انواع الدول وحریت الملل

حکومت الٰہی کے مجوزہ خاکہ کو قدرے آگے بڑھا کر مولانا منصور انصاری نے انسان ساز حکومتوں کی مختلف اقسام پر اجمالی نظر ڈالتے ہوئے فطرت انسانی سے قریب تر حکومت الٰہی کے قیام کی ممکنہ کوششوں نیز انہیں روبہ عمل لانے کی عملی تدابیر کو مدلل و بلیغ انداز میں پیش کیا ہے.

چالیس صفحات پر مشتمل یہ کتاب بھی دری/ فارسی زبان میں ہے. اس کی اشاعت مولانا حامد الانصاری غازی کی زیر نگرانی مجلس دستور امت بجنور نے شعبان ۱۳۵۰ (دسمبر ۱۹۳۱ء) میں مدینہ پریس بجنور سے کی تھی..

مولانا منصور انصاری نے اس کتاب کو ان اصلاحی کوششوں میں سے ایک بتایا ہے جو نوع انسانی کی فلاح کی غرض سے تحریک احیائے اجتماعیات اسلامی کے سلسلہ میں وہ انجام دے رہے تھے. اس کا انتساب دکھی انسانیت کے نام کیا ہے.

کتاب کے پہلے باب میں حکومت کی اقسام کا تجزیہ کرتے ہوئے انہیں دو اجزا کا مرکب قرار دیا ہے: قوت فرماں روائی اور قوت تنفیذ و اجرائے حکم حکومت. پہلے جز کا اصطلاحی نام پادشاہ، سلطان، ملک ہے اور اسی کو موجودہ زبان میں قانونی طاقت، قانون سازی، یا آئینی اختیارات حاصل ہیں. اس کی ایک خاص علامت اس قوت کا کسی بھی امر میں جواب دہ نہ ہونا ہے. دوسرا حصہ یعنی قوت اجرائیہ حقیقت میں عوام الناس کو اپنا فرماں

بردار بنانا ہے۔ اسی کو عرفِ عام میں حکومت کہتے ہیں۔ یہ کام عام طور سے بادشاہ کا وزیر یا مجلس وزراء کا بینہ انجام دیتی ہے۔ یہ شاہی نظام مملکت کا خاکہ تھا۔

اس کے بعد انتخابی حکومتوں پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کی مروجہ قسم جمہوریت اور اس کی شاخوں پر تفصیلی کلام کرتے ہوئے اس کی خوبیوں اور خامیوں کو بیان کیا ہے اور جن مما لک میں جمہوریت کی یہ شکلیں رائج ہیں ان کی صورت حال کے پیش نظر ان نقائص کی نشاندہی کی گئی ہے جو اس طریقہ کار کو اختیار کرنے کے باعث عوام کو درپیش ہیں۔ اسی ذیل میں ہندستان کی سیاسی صورت حال پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> زعیمان ہند بالضرور تشکیل حکومت آزاد خویش را بر اصول متحدہ لا مرکز یہ (مطابق رائے متفکر غیور برادرم مولانا حسرت موہانی) ترتیب دادہ سررشتۂ اتحاد صمیمی را درمیانِ اقوام وعناصر ہندستان (باشندگان قدیم، اقوام آرین، اہل اسلام، سکھ یا اقوام منگولی، عیسائی یا پارسی) فرمودہ بزور اتحاد وامنیت ہند برائے اتحاد امنیت عالم خدمت بے مثال بفرمایند۔

> ہندستان کے رہنماؤں نے بالضرور اپنی آزاد حکومت کی تشکیل کے لئے متحدہ لامرکزیہ (ہم پیاوفاقی جمہوریہ/confederation) کے اصول پر (مفکر قوم مولانا حسرت موہانی کی رائے کے بموجب) ترتیب دیا ہے۔ یہ ہندستان کی مختلف اقوام اور مختلف عناصر (قدیم باشندگان، آرین اقوام، اہل اسلام، سکھ، منگول، عیسائی اور پارسیوں) کے درمیان مضبوط اتحاد کے لئے فرمایا گیا ہے کیونکہ ہندستان کے امن اور اتحاد کے زور پر دنیا کے امن واتحاد کی بے مثال خدمت انجام دی جا سکتی ہے۔

مولانا منصور انصاری نے برصغیر جنوبی ایشیا میں مجوزہ متحدہ لامرکزی جمہوریت (confederation) کی تجویز کو سراہنے کے باوجود اسلامی فطری حکومت سے اس کا

موازنہ کرتے ہوئے اسلام پسندوں کو یہ وصیت بھی کی ہے کہ

> ایں آوارہ بعد از تجربات آوارگی پانزدہ سالہ خودرا بحیثیت یک مبلغ امامت امت بخدمت برادران انسانی واخوان ایمانی تقدیم نمودہ یگانہ آرزو دارد کہ کم از کم حکومتہائے اسلامیہ تازۂ آزاد ہند براصول اجتماعیہ سماوی (امامت) قائم شدہ نہ اینکہ ازمسئولیت جواب اخروی وازعذاب الیم دینوی خودرا خلوص فرمایند۔

> یہ آوارہ اپنے ان پندرہ سالہ تجربات کے بعد جواس نے امامت امت کے مبلغ کی حیثیت سے کئے ہیں انسانی وایمانی بھائیوں کی خدمت میں یہ ایک آرزو پیش کرتا ہے کہ کم از کم آزاد ہندستان کی اسلامی حکومتیں ان آسمانی اجتماعی اصولوں (امامت) پر قائم رہیں، نہ یہ کہ آخرت کی جواب دہی اور دینی درد ناک عذاب سے اپنے آپ کو بری قرار دے لیں۔

مولانا منصور انصاری چاہتے تھے کہ دورِ حاضر میں سماجی وانفرادی اصلاح کے لئے ضروری ہے کہ پورا نظام معاشرت تبدیل ہو، خاص طور سے وہ حضرات جو حکومت سازی میں کسی طریقہ کا عمل دخل رکھتے ہیں یا وہ مسلم حکومتیں جو اسلام کی نام لیوا ہیں اس نظام حکومت کو نافذ کرنے کے لئے کوشاں ہوں جو قرآن کی منشا کے مطابق ہو کیونکہ حکومت سازی کا مقصد اپنی حکمرانی قائم کرنا نہیں بلکہ اعلائے کلمۃ اللہ ہے اور سلطان چونکہ خلیفۃ اللہ ہے اس لئے اس پر اس نظام کو نافذ کرنا لازمی ہے۔ نظام قرآنی کے مطابق جو حکومت قائم کی جائے گی وہی انسانوں کی نجات دہندہ اور فلاح وکامرانی کا باعث ہوگی۔ اس کے علاوہ دوسرے تمام اقسام حکومت بشمول جمہوریت سراب وفریب کے علاوہ کچھ نہیں۔

۳- حکومت الٰہی: دستورِ اساسی امامتِ امّت:

مولانا منصور انصاری کی یہ کتاب وہ دستورِ اساسی ہے جو امامتِ امت کے لئے انہوں نے قرآن حکیم کی روشنی میں ترتیب دیا ہے۔ یہ کتاب ''انواع الدول'' کے ساتھ دسمبر

۱۹۳۱ (شعبان ۱۳۵۰) میں مدینہ بجنور سے مولانا حامد الانصاری غازی نے مجلس دستور امت کے ماتحت شائع کی تھی. اس کتاب پر وزیر امور خارجہ افغانستان آقائے فیض محمد خاں کی تقریظ ہے جو ۲۰ محرم ۱۳۴۹ (۱۹ جون ۱۹۳۰) کی تحریر کردہ ہے.

مولانا منصور انصاری نے انواع الدول کی تکمیل ۱۵ شوال ۱۳۴۹ (۵ مارچ ۱۹۳۱) کو اور اس کتاب کی تکمیل ۱۵ ذی قعدہ ۱۳۴۹ (۱۳ اپریل ۱۹۳۱) کو کی تھی، لیکن سردار فیض محمد خاں کی تقریظ سے معلوم ہوتا ہے کہ حکومتِ الٰہی کا مسودہ پہلے مرتب ہو گیا تھا.

کتاب کے شروع میں مولانا منصور انصاری نے اپنی تصویر دی ہے. کسی کتاب پر تصویر کا آنا اور کسی عالم دین کا تصویر اتروانا یا اسے شائع کرانا اس زمانے میں معیوب تھا. مولانا منصور انصاری اس قضیہ میں پڑنا نہیں چاہئے تھے. البتہ کیمرہ کی عکسی تصویر پر ان کا نقطہ نظر علماء کے مروجہ خیال سے مختلف تھا جو آج بڑے بڑے علماء حق کا نقطہ نظر بن چکا ہے

اس کتاب کا انتساب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق کے نام ہے جنہوں نے خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کی بنیاد فراہم کی.

اس کا آغاز ''باب الصفتین'' سے کیا گیا ہے جس میں اثبات مالک بشریت پر گفتگو کی گئی ہے اور یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ صفت مالکیت، صفت مالک اور صفت مملوک تینوں دو، دو انواع پر منقسم ہیں. مالکیت کی حیثیت سے (۱) مالکیت اصلی (Constant Authority) (۲) مالکیت عرضی (variable)؛ مالک کے اعتبار سے (۱)، مالک اصلی (primordial owner) (۲) مالک ظلی (delegated)؛ اور بہ اعتبار مملوک (۱) مملوک خاص (chosen servant) (۲) مملوک عام (general servant).

مالکیت اصلی (Constant Authority) اللہ کی خاصیت ہے اور تنہا وہی کائنات کا اصل مالک ہے. مالکیت عرضی (Variable and Delegated Authority) انسان کی صفت ہے. مملوک خاص وہ ہے جو مالک اصلی کی ملکیت میں

تصریف کرنے والا (Vicegerent) ہو وہ صرف انسان ہے جو اللہ تعالیٰ کا مملوک ہے.
اس سے ثابت ہوا کہ تمام انسانوں کا مالک صرف خالق رب العالمین ہے.

اس کے بعد مولانا منصور انصاری نے حکومت الٰہیہ کے اجزا: بادشاہ، قانون، صدر اعظم، حدود سلطنت وغیرہ کی تفصیلات دی ہیں اور قرآنی آیات سے ان کے دلائل پیش کئے ہیں.

قانون ان احکام کو قرار دیا گیا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ہم تک پہنچے ہیں. اس کی دلیل قرآن کریم کی آیت **مَـآاٰتـٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُ وْهُ [ق] وَمَانَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا** (لقرآن. الحشر ۵۹:۷) کو قرار دیا ہے.

رسول تم کو جو کچھ دیں وہ لے لیا کرو اور جس سے روک دیں اسے چھوڑ دیا کرو

اس قانون کی زبان **اَنْـزَلْنٰهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا** (لقرآن. الرعد ۱۳:۳۷) کی روشنی میں عربی بتائی گئی ہے.

اس نظام کا صدر اعظم رسول اللہؐ کو قرار دیا ہے جنہوں نے اس نظام کے ذریعہ دنیا میں امن وسلامتی اور انسانی اتحاد کی مثال قائم کی.

دوسرے ''باب التنفیذ'' میں اس نظام کے نفاذ کے امکانات پر تحقیق ہے. امامت امت کس طرح قائم ہوسکتی ہے؛ امامت امت کے عناصر ترکیبی کیا ہیں؛ خلیفہ/صدر کا طریقۂ انتخاب عنوانات قائم کر کے قرآن حکیم کی روشنی میں تعیین کی گئی ہے. یہ کتاب مولانا منصور انصاری کے فکر کا اجمالی نمونہ ہے.

بعد میں اپنے والد مکرم کی ہدایت پر مولانا حامد الانصاری غازی نے سیاسیات کے ان اساسی امور کی شرح میں مبسوط کتاب ''اسلام کا نظام حکومت'' تصنیف کی جو اس موضوع پر اردو میں سب سے پہلی کتاب ہے. ندوۃ المصنفین دہلی سے شائع ہونے والی یہ سب سے پہلی علمی تحقیق تھی.

مولانا غازی نے اس کتاب میں اسلامی نظام حکومت کے تمام شعبوں، ریاست و ملک کے تعلقات اور عام دستوری اصول کو جدید تقاضوں کی روشنی میں تفصیلاً واضح کیا ہے. اس کی پہلی اشاعت ۱۹۴۱ میں ہوئی تھی. گزشتہ ۸۰ سال میں اس موضوع پر اردو میں کم وبیش پچاس کتابیں شائع ہوئی ہیں جن میں سے بعض نہایت مشہور اور مستند اہل علم کی تصنیفات ہیں. ستم ظریفی یہ ہے کہ بعد کے تمام مصنفین نے بلا امتیاز مولانا غازی کی اس ابتکاری کتاب سے استفادہ ضرور کیا ہے مگر کسی ایک نے بھی اس اساسی کتاب اور مصنف کا حوالہ دینے کی علمی دیانت کا مظاہرہ نہیں کیا.

بہرحال مولانا منصور انصاری نے ایک مجمل کتاب میں ایک سنت مرحومہ کو اس طرح زندہ کیا کہ آج دنیا بھر میں اس کا غلغلہ ہے، اس پر اہل اسلام سے زیادہ مغربی دانش گاہوں میں بحث وتحقیق، تنقید، تعریض اور توصیف کا سلسلہ جاری ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس نظام کے فہم کی جو علمی اور فکری جدوجہد یورپ اور امریکہ میں نظر آتی ہے وہ ایک دن ان منطقوں کو عملی اسلام اور اسلامی سیاسیاتی اصول کو قبول کرنے اور انہیں دنیا میں رائج کرنے کے قابل بنائے گا. تقدیر الٰہی میں یہ وقت جب مقرر ہو بارگاہ رمالک الملک سے اس احیاء سنت کا ثواب مولانا محمد میاں منصور انصاری اور مولانا حامد الانصاری غازی کو ملے گا.

مولانا منصور انصاری کا پختہ نظریہ تھا کہ دنیا کے تمام معاشرتی، معاشی، عمرانی انسانی عوارض اور مسائل کا قطعی علاج اور حل اسلام کا عمرانی نظام ہے جس کے وجود کی ضمانت اسلام کا نظام حکومت ہے. اس ربانی نظام حیات وسیاست کو عالمی معاشرہ میں برپا کرنا اللہ کے ایمان دار بندوں کا وظیفہ ہے اور اسی پر انسانیت کی فلاح ونجات کا مدار ہے کیونکہ اس کا ماٰ خذ اللہ کا آخری قانون قرآن حکیم ہے جو دنیا کی تمام برائیوں کا خاتمہ کرتا ہے اور تمام بھلائیوں کا حکم دیتا ہے. اس طریقہ پر انسان، انسان کامل ہوجاتا ہے اور انسان کامل ہی اللہ کی نیابت یعنی حکومت کا حق واختیار رکھتا ہے. اس کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالی

مالک السموات والارض ہے اوراس نے ملائکہ کواطلاع دی تھی کہ **اِنِّـیْ جَـاعِـلٌ فِـی اْلاَرْضِ خَـلِیْـفَۃً** (لقرآن.البقرہ۲:۳۰) - میں زمین پر اپنا خلیفہ مقرر کرر ہا ہوں - انسان وہ خلیفہ ہے.

لہٰذا انسانوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے اندر وہ صفات حسنہ پیدا کریں جو اللہ تعالیٰ کو اپنے خلیفہ فی الارض کے لئے مطلوب ہیں اوران برائیوں سے تائب ہو جو اللہ کو ناپسند ہیں. اللہ کی مطلوب ومحبوب چیزوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس کی مخلوق اس کا کنبہ ہے - **اَلْـخَلْقُ عَیَالَ اللّٰہ** - اس کنبہ کو خوشحال ہونا چاہیے. دنیا میں رائج کسی نظام نے تمام انسانوں کے لئے یہ صورت پیدا نہیں کی بلکہ ہر انسان ساختہ نظام ادنی واعلی، برتر وکمتر طبقات میں انسانوں کی تفریق وتقسیم کی تائید وحمایت اور کوشش کرتا ہے. ان تفریقات کو مٹانے کی ایک ہی صورت ہے کہ زمین پر وہ نظام نافذ ہو جس میں صدر، یا امیر، یا شاہ یا وزیر اعظم منصف وحق پسند ہو، اللہ سے ڈرنے والا ہو، جس کے دل میں ہمہ وقت ایک عادل احکم الحاکمین کے سامنے پیش ہونے کا ڈر ہو.

مولانا منصور انصاری نے اس نظام حکومت کے لئے جو دستور اساسی ترتیب دیا وہ موضوعات وعنوانات کے اعتبار سے امامت امت کے منصوبہ کا لائحۂ عمل ہے. یہ کتاب دری/ فارسی میں تحریر کی گئی ہے. مولانا منصور انصاری حکومت کو ایک دینی عنصر مانتے ہیں کیونکہ دین اسلام فطرت انسانی پر مبنی ہے اور انسانی فطرت کے تمام کاموں اور سرگرمیوں پر حاوی ہے اور انسان پر مثبت اور مفید طریقہ پر ارتقاء کا راستہ کھولتا ہے. اس اصول پر اصل حکومت اللہ کی ہے جس نے انسان کو ربانی حکومت کی ذمہ داری سپرد کی گئی مولانا حامد الانصاری غازی نے اس اصول کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

> یہ ذمہ داری انسان پر اللہ کا حق ہے، خاتم النبین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے احکام کے بموجب جس طریقہ کا حکومتی نظام دنیا میں نافذ کرنا چاہا تھا

اسے آپؐ کے خلفائے راشدین نے دنیا میں رائج کر کے ایک مثال پیش کردی. خلافت راشدہ نے وجود میں آنے کے بعد صرف نصف صدی کے عرصہ میں نصف دنیا پر اپنی فتح کے ساتھ انسانوں کو انسانی غلامی سے نجات عطا کی.

مولانا منصور انصاری کا یہ علمی شاہکار ان کے مطالعۂ سیاسیات، مطالعۂ مدنیت اور مطالعۂ اقوام عالم کا نچوڑ ہے اور اس کو عملی شکل دینے کا طریقہ بھی ہے. یہ اساسی تحقیق مفکرین سیاسیات کے لئے راہ نما ہے.

درحقیقت یہ تصنیف اس فکر کا تحقیقی اظہار ہے جس کے لئے اسلامی علماء ہند کئی صدیوں سے کوشاں تھے. مغل بادشاہوں کے قدم ڈگمگائے تو شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی نے گرتی ہوئی دیواروں سہارا دیا. مغلیہ سلطنت کا چراغ ٹمٹمانے لگا تھا تو شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے محسوس کیا کہ وہ انقلاب کے لئے سازگار وقت تھا. مگر ہندستان سے افغانستان تک انہیں وہ شخص ہی نہ ملا جو جنوبی ایشیا میں ہمہ گیر اسلام کو برپا کرنے کا جذبہ اور صلاحیت رکھتا ہو. ان کے بعد شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، شاہ اسمٰعیل شہید، سید احمد بریلوی، مولانا ولایت علی، شاہ محمد اسحٰق دہلوی، حاجی امداد اللہ مہاجر مکی، مولانا محمد قاسم نانوتوی، شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندی کی لگاتار جدوجہد کے بلند و پست سے گزرتی ہوئی اس مہم کی کمان مولانا محمد میاں منصور انصاری جیسے مفکر مجاہد تک پہنچی جنہوں نے حصولِ مقصد کی بے مثال جدوجہد کی خاطر وطن و سرزمین وطن اور اہل وعیال سے مہاجرت اختیار کی اور عمرانیات اسلام کو معاشرت اسلام کا جزو لاینفک بنانے کی بانگ رحیل کو یاغستان کی ان سنگلاخ وادیوں سے، جہاں سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید کی تحریک بالا کوٹ کے زمزمے گونج رہے تھے، اقصائے ترکستان اور حدود ترکی تک پہنچا دیا.

مولانا محمد میاں منصور انصاری نے امامت امت کا جو دستور اساسی ترتیب دیا وہ برصغیر کی پہلی مرتب کوشش تھی. بعد میں اس پر بہت لوگوں نے محل تعمیر کئے اور نظریہ حکومت

الٰہیہ کے بانی کہلائے لیکن حقیقت یہ ہے کہ جنوبی ایشیا میں اس نظریہ کی دستوری بنیادیں تیار کرنے والی پہلی شخصیت مولانا محمد میاں منصور انصاری کی تھی. پس آئندگان اس نظریہ کی کلیاتی اہمیت کا عرفان حاصل نہ کر سکے اور علمی عجلت پسندی کے نتیجہ میں خواہ بلا ارادہ ایسی فکری یا تشریحی غلطیوں کے مرتکب ہو گئے جن کی وجہ سے نظریہ امامت امت کو نقصان پہنچا اور یہ قیمتی نظریہ فی الجملہ ناروا تنقید یا بے فیض فلسفیانہ موشگافیوں کی نذر ہو گیا.

تحسین امامت امت

مولانا منصور انصاری کا رسالہ حکومت الٰہی: دستور اساسی امامت امت یکم شعبان ۱۳۵۰ (۱۲دسمبر۱۹۳۱) کو مجلس دستور امت، بجنور، ہند، نے شائع کیا تھا. اس پر مولانا منصور انصاری کے سیاسی شاگرد اور افغانستان کے وزیرامور خارجہ آقائی فیض محمد خان کی تقریظ کا ترجمہ یہاں پیش ہے.

تقریظ

کتاب امامت امت مؤلفہ حضرت مولانا منصور صاحب کا میں نے مطالعہ کیا. یہ مبارک کتاب علم اجتماعی (عمرانیات) اور حقوق واصول ادارہ (سیاسیات) کی بہترین رہنما ہے کہ اب تک ہماری عزیز مملکت (افغانستان) کے کسی بھی دوسرے عالم نے اس معاملہ میں سعی تو کجا توجہ بھی نہیں دی ہے.

اجتماعیات (عمرانیات) اور نظام حکومت (سیاسیات) کے حقوق اور اصول کا پہلا معلم ہمارا مقدس دین ہے اور متمدن دنیا نے اسلام کی مقدس کتابوں کے واسطہ سے ان علوم سے خوب استفادہ کیا ہے، مگر ہمارے نزدیک آج کل کے علما سے یہ باتیں مستور اور ان کے علم سے باہر ہیں. یہی اولین تالیف ہے کہ اس کے مطالعہ سے اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے دل و دیدہ کو بے اندازہ مسرت حاصل ہوگی اور مستقبل کے بارے میں تازہ امیدیں قائم ہوسکتی ہیں.

علم اجتماعیات کی اس کتاب کو ہمارے مدارس کے پروگرام (نصاب) میں شامل

ہونا چاہئے اور ہمارے ہر مدرسہ کو اپنے طور پر بھی اس کتاب کو درس میں شامل کرنا نہایت مفید ہوگا.

۲۸ جوزا ۱۳۰۹ ہجری شمسی

۲۰ محرم ۱۳۴۹ (سہ شنبہ ۱۷ جون ۱۹۳۰)

اصل فارسی متن

کتاب امامت امت مولفہ حضرت مولانا منصور صاحب را مطالعہ کردم. ایں کتاب مبارک از حیث علم اجتماعی وحقوق واصول ادارہ بہترین رہنمائیست کہ تا اکنون در مملکت عزیز ما بااین مضمون ہیچ عالمی صرف مساعی وحتی توجہ نموده است

اجتماعیات وحقوق واصول ادارہ کہ دین مقدس ما معلم اول آنست و دنیائے متمدن از کتب مقدس اسلام نسبت باین علوم استفادہ ہائے خوبی کردہ اند، نزد ما وعلمائے امروزی ما چیز مستور ومجہول بود، ہمیں اولین مولفہ ایست کہ بہ مطالعہ آن دل ودیدۂ مشتاقان مسرت بے اندازہ وامیدھائے تازہ حاصل کردہ می تواند

ایں کتاب در علم اجتماعیات کہ در مکاتب تدریس می شود با پروغرام وحتی با مفردات پروغرام مکاتب ما موافقت می نماید وتدریس آں خیلی مفید واقع خواہد شد.

فیض محمد

وزیر امور خارجہ

۲۸ جوزا ۱۳۰۹ ھ ش

۲۰ محرم ۱۳۴۹ ھ

(سہ شنبہ ۱۷ جون ۱۹۳۰)

نیادارالاسلام

اللہ نے یہ دنیا اسلام کے لئے بنائی ہے.

اِنِّی جَاعِلٌ فِیْ الْاَرْضِ خَلِیْفَہ (القرآن. **البقرہ ۲:۳۰**)= بے شک میں زمین پر اپنا خلیفہ بناؤں گا.

ذِکْرٰی لِاُولِی الْبَابِ (القرآن. **المومن ۴۰:۵۴**)= یاد رکھنے والی نصیحت تو عقل والوں ہی کے لئے ہے.

رَبَّنَامَاخَلَقْتَ ھٰذَابَاطِلًا (القرآن. **آل عمران ۳:۱۹۱**)= (علم رکھنے والے اور عقل والے لوگ جب اس کائنات اور دنیا کو دیکھتے ہیں تو بے ساختہ کہہ اٹھتے ہیں کہ) اے ہمارے پالنہار، آپ نے یہ سب کچھ بے وجہ پیدا نہیں کر دیا.

اس ارضی دارالاسلام کو خود انسان ہی غرضی دار الفساد بنا دیتا ہے اور خسارہ میں رہتا ہے جس کا اسے کوئی اندازہ نہیں. مگر انسانی دنیا کبھی بھی علم اور عقل رکھنے والوں سے خالی نہیں ہوتی اور ایسے افراد زمین پر اللہ کی خلافت کو برپا کرنے کے لئے جہاں جہاں دار الفساد بن جاتا ہے وہاں وہاں دارالاسلام بناتے رہتے ہیں. جنوبی ایشیا بھی ایسا ہی ایک بابرکت خطہ ہے جس کا حق ہے کہ وہ اللہ کی خلافت کی کا حق ادا کرنے کے قابل ہو. اہل علم اور اہل عقل کی یہ ایک پرانی مہم ہے. اس کی حالیہ تاریخ قابل توجہ ہے.

برصغیر میں انگریزوں کے تسلط کے بعد بھارت کے مسلمان دو واضح جماعتوں میں بٹ گئے تھے اور اس تفریق سے انہیں آج تک مفر نہیں. ایک وہ طبقہ جس نے فکری اور عملی سپر ڈال دی اور انگریز اور یورپ کو مستقبل کا نجات دہندہ مان کر اس کی غیر مشروط پیروی کر رہا تھا؛

دوسرا طبقہ انگریز اور انگریزیت سے فکری سازگاری کے لئے آمادہ نہیں تھا اگر چہ اس کی تمام صنعتی ایجادات سے استفادہ پر مجبور تھا یا اس میں قباحت محسوس نہیں کرتا تھا. راہ و منزل کے بارے میں اگر چہ دونوں جماعتوں کو اپنی اپنی جگہ برحق ہونے کا یقین تھا مگر درحقیقت دونوں کے سامنے مستقبل مبہم اور راہیں متواتر بحرانوں کے غبار میں گم تھیں. دونوں جماعتوں سے ایسے افراد نکلے جو اپنے اپنے نقطۂ نظر سے غیر مطمئن تھے. ان غیر مطمئن افراد کے تجربات اور معاشرتی و فکر تجزئے ان کے سامنے نئے امکانات کھول رہے تھے.

مولانا محمد میاں منصور انصاری نسبی اور علمی اعتبار سے اس دوسرے طبقہ کے فرد تھے جو انگریز سے فکری سازگاری کے لئے آمادہ نہیں تھا. لیکن اپنی جماعت کے تقریبا تمام بزرگوں کے برعکس وہ اور ان کے رفیق مہم مولانا عبیداللہ سندھی نے ایک دنیا کی طویل راہیں کاٹیں، عالمی سیاست کی نیرنگیوں کا تماشا دیکھا، تہذیبوں کے بگڑتے اور بنتے سانچوں کا مشاہدہ کیا. اور یوں یہ دونوں بزرگ اپنے قافلے سے کٹ گئے یا خود قافلہ ہی نے انہیں تنہائی کا درد عطا کر کے امکانی کامیابی سے دور کر دیا.

زندگی کے تلخ و ناہموار تجربات نے مولانا منصور انصاری کو اس نتیجہ پر پہنچایا تھا کہ مسلمانوں پر مشتمل عالم اسلام کے دل آرزو سے اور دماغ فکر سے خالی ہو چکے تھے، ان میں کچھ کر گزرنے کا حوصلہ مفقود نہیں تو اس درجہ مضمحل ہو گیا تھا کہ یکے بعد دیگرے ان کی مہمات بے نتیجہ اور بے ثمر ہوتی جا رہی تھیں اور ان میں زندگی کی امنگ پیدا نہیں ہو رہی تھی.

اس عالم میں مولانا محمد میاں منصور انصاری نے اپنے چھوٹے صاحبزادہ قاری حمید میاں انصاری کے نام ایک تفصیلی خط میں ان منطقوں کی نشان دہی کی جہاں اسلام نئے برگ و بار لا سکتا تھا. یہ ایک حیرت انگیز تجزیہ تھا.

شاہ ولی اللہ کے زمانہ سے اپنے دور تک دو سو برس کی متواتر بے نتیجہ اجتماعی مساعی کی دردناک تاریخ کے باوجود مولانا منصور انصاری برصغیر جنوبی ایشیا سے مایوس نہیں تھے

اور یقین رکھتے تھے کہ مستقبل کے سورج کا مطلع عالی یہی مبارک خطہ تھا. یہ خیال ہندستانیت کے فطری لگاؤ یا علاقائی تعصب کا پیدا کیا ہوا نہیں تھا کیونکہ اسی کے ساتھ انہوں نے امریکہ، یورپ، جاپان اور چین کی قوموں میں بھی اسلام کا مستقبل دیکھا. یہ بڑا ابتکاری انقلابی تصور تو ان ذہنوں میں بھی نہیں تھا جو مغربیت کے ثناخواں تھے، چہ جائیکہ مدرسہ وخانقاہ کے حجروں میں اس کی نمود ہوتی.

مولانا منصور انصاری کے اس تجزیہ کی دلیل بظاہر یہ ہے کہ انسان کی معلوم تاریخ میں کئی قومیں ہیں جنہوں نے ابھی تک فلاح انسانی کی مد میں کوئی ہمہ گیر مثبت کردار ادا نہیں کیا، اور ربانی عدل سے بعید ہے کہ ان قوموں یا منطقوں کو موقعہ دئے بغیر قیامت میں جواب دہ کر دیا جائے. بے شک دنیا کی تاریخ تہذیبوں کے بیان سے خالی نہیں لیکن وہ تمام قومی تہذیبی تجربے حالت شرک کی ترقی پر مبنی تھے. تاریخی حقیقت یہ ہے کہ اکادی، کلدانی، سمیری، سریانی، مصری قبطی، یونانی رومی، دراوڑی اور آریہ، ہندی، چینی، فارسی کسی بھی سماج اور تہذیب میں رب کائنات کی توحید کا تصور نہیں تھا اس لئے ان تمام معاشروں میں اثباتی اور حقانی پہلو جزو تاریخ نہیں ہے. ظاہر بین مورخین نے ان تمام انسانی تجربات کو تہذیبوں کے زمرہ میں جمع کر دیا ہے، لیکن انسانی شرف وفضیلت کے عنوان سے دیکھا جائے تو یہ تمام معاشرتی تجربات انسانوں کے بڑے طبقات کی تذلیل وتحقیر کے نمونے تھے جو فی الواقع شرک کی نفسیات کا معاشرتی اظہار تھے.

ماضی کی ان اقوام میں سے عراق (اکادی، کلدانی، سمیری)، شام (سریانی، فنیقی، ارامی) فارس (پارسی، باختری، خراسانی)، مصر (قبطی فرعونی) کی قوموں نے وقت کی آواز سنی، اسلام کا پرچم توحید بلند کیا اور اثباتی حقانی تہذیب سازی میں غیر معمولی کردار ادا کر دیا. ترکوں نے ترکستان اور ترکیہ میں سلجوقی اور عثمانی سلطنتوں کے ماتحت فطری عقیدہ توحید کی بے مثال خدمت کی. جنوبی ایشیا میں بے شک ترکان غلامان واحرار نے حق کا پرچم بلند کیا

لیکن مغلیہ عہد اباحیت کا شکار ہوااور دنیا کی بہترین تعمیرات کوتہذیب عالم کی میراث بنانے کے باوجوداس اسلامی اجتماعیت کا بانی نہ ہوا جس کے نمونے ماضی قریب میں شام وعراق، مصرومراکش، اندلس واناطولیہ میں مرتب ہوئے تھے.

سادہ لفظوں میں یہ کہ برصغیر ابھی اس خدمت کے میدان میں موجود ہے جو دربار رب میں اس کے لئے مقدر ہے.اسی اعتبار سے امریکہ، یورپ بشمول یونان وروم (اطالیہ)، چین اور جاپان بھی ابھی تک عالم انسانی کی وہ خدمت نہیں کر سکے جو تہذیب کا مقصود اصلی ہے.

اگر مولانا منصور انصاری کے عالمی منظر نامہ کا یہی عالمی تہذیبی پس منظر ہے تو سو سال پہلے کی دنیا میں ان کا نقطۂ نظر حیرت انگیز تھا.اس وقت کون جانتا تھا کہ چند عشروں کے بعد لاکھوں مسلمان عالم اسلام سے ان متذکرہ یورپی اور امریکی ملکوں میں جا کر آباد ہوں گے اور وہاں توحید اور تہذیب کے وہ مینار تعمیر کریں گے جن کی روشنی مستقبل میں اتنی ہی خیرہ کن ہوسکتی ہے جیسی دمشق، بغداد، نیشاپور، بخارا، قاہرہ اور قرطبہ سے پھیلی تھی.آج یہ بات بلا خوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ لندن، بریڈفورڈ، روم، بوڈاپسٹ، برسلز، فرینکفرٹ، کاسل، پیرس، تیرانہ، سرائیوو، ٹورانٹو، آٹوا، مونٹریال، ہالیفیکس، کالگری، نیویارک، شکاگو، ڈیلس، ہیوسٹن، سانتا کلارا، پناما بھی اسلامی تہذیبی شہروں کا مرتبہ پا چکے ہیں.

اس عالمی پس منظر میں قاری حمید میاں انصاری کے نام مولانا منصور انصاری کا یہ مکتوب تاریخی اہمیت اختیار کر لیتا ہے. یہ مکتوب تاریخ شناسی اور مستقبل بینی کا امتزاج ہے. یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ان متذکرہ ممالک اور مناطق میں کوئی توحیدی تہذیبی انقلاب کب آئے گا، لیکن مولانا انصاری کی پیش بینی کی بنیاد پر خود ان منطقوں اور ملکوں کے سامنے مستقبل کی راہ عمل کھل گئی ہے اور نشان منزل روشن ہو گیا.آگے بڑھنے نہ بڑھنے کا فیصلہ یہ قومیں کریں.

--م ط غ

قاری حمید میاں انصاری کے نام خط

برخوردار سعادت اطوار حافظ حمید السلام علیکم ورحمۃ اللہ.

۱- بڑے انتظار کے بعد نامۂ عافیت پہنچا دل شاد ہوا خالد میاں نام کی مقبولیت اور اس کی تشریح کی پسندیدگی اور مولوی مسعود کی محبوبیت عامہ ایسی چیزیں نہیں کہ جس پر خالق اکبر کا خاص طور پر شکرادانہ کیا جائے، **فَنَشکُر اللہ ربِّ العالمین.**

۲- بی کی ترقی صحت اور اس کے دستی خط سے نہایت مسرور ہوا، خدائے حکیم سے رجاء (امید) ہے کہ بی سلمہا کی باقی رضا اور آپ کی کل پریشانیوں اور ظاہری اور باطنی کلفتوں کو عفو تقصیرات فرما کر دور فرما دے اور آئندہ عمل صالح بے لوث کے ساتھ ہر قسم کی سلامتی اور آرامی سے سرفراز رکھے. آمین ثم آمین.

۳- شاہ مقصود احمد صاحب کے حادثہ سے اپنے قلب میں خاص طور سے درد محسوس کر رہا ہوں. حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

یہ آوارۂ وطن اس صدمہ میں شاہ صاحب کا سہیم ہے میری طرف سے ان کی خدمت میں حاضر ہوکر جواب سلام مسنون اور تعزیت پہنچائیں. اب صبر کے سوا کیا چارہ. خدا تعالیٰ مرحوم کو ذخیرۂ آخرت ہم سب کے لئے بنا کر آڑے وقتوں میں کام لائے اور نعم البدل سے جو بقیات صالحات بھی ہو سرفراز فرمائے. آمین یا مجیب.

۴- تبلیغ حکومت الٰہی کے متعلق آپ کے تفصیلی افکار سے مسرور اور مستفید ہوا.

(الف) اس امر کو اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہوں کہ آپ لسانی تبلیغ کے حامی ہیں اور اس کے لئے مجھ کو وقف کر چکے ہیں. خدا تعالیٰ آپ سے اپنا کام اعلیٰ مرتبہ پر لے. آمین.

(ب) یہ رائے درست معلوم ہوتی ہے کہ ہند میں مرکز تبلیغ قایم کرنے کے بعد ممالک اسلام کی تبلیغی سیاحت کی جائے. اعلیٰ حضرت ملک الناس آپ کو اسلام کے لئے

انتخاب فرمائے. آمین.

(ج)   درست ہے کہ مصر وعراق وعرب میں حکومت الٰہی کی تبلیغ ہو اور اعلیٰ پیمانہ پر ہو اور اس میں بھی کلام نہیں کہ افغانستان اور ایران اس کام کے لئے زیادہ موزوں مراکز نہیں، اور یہ بھی صحیح ہے کہ زبان فارسی ممالک اسلام میں عام طور پر نہیں سمجھی جاتی اور یہ بھی مانتا ہوں کہ کتاب کی بہ نسبت عام فہم زبان میں پمفلٹوں کی تقسیم زیادہ سہل اور زیادہ مفید ہوگی، اور یہ بھی بالکل ظاہر ہے کہ میری فارسی ناقابل فہم ہوتی ہے اور یہ بھی قابل مسرت ہے کہ مصر آج کل فضلائے یورپ اور جاپان کا مرکز ہے اس لئے یہاں سے اسلام اجتماعی بسہولت پہنچایا جاسکتا ہے.

مگر میں اس امر کو قبول نہیں کرسکا کہ تبلیغ صرف امم عربیہ میں ہی منحصر ہو.

میرا خیال یہ ہے کہ امم اسلامیہ جن میں ملل عربیہ بھی ہیں بلند اجتماعی حریتِ فکر، جرأتِ اجتماعیہٗ اخلاق سے (افغانستان وایران کی طرح) عموماً محروم ہیں. ہوسکتا ہے کہ ممالک اسلامیہ، اسیر ہوں یا آزاد، کچھ افراد ایسے پیش کر سکیں جو حکومت الٰہی کو سمجھ اور سمجھا سکیں، مگر ان ممالک میں ایسی قوم پیش کرنے کی صلاحیت نہیں دیکھتا جو اپنے حلقۂ اقتدار میں حکومت الٰہی کا جھنڈا گاڑ کر اس کو صحیح اصول پر عملاً دنیا کے سامنے رکھ بھی سکیں.

آج کل عالم مسلمین تنزل نامعلوم العمق (پستی) کی طرف رواں ہے اور آج اس کا خزینۂ دماغی علم صحیح اجتماعی سے بالکل تہی ہے. آج اس کی پونجی صرف کورانہ تقلید ہے. اس کے قدماء، جو خود کو وارث انبیاء بھی کہنے کے عادی ہیں اور مجاہد فی الحق اور غالب علی الخلق بھی سمجھتے ہیں، شخص پرست اور فرعونیت فردا کے پرستار ہیں. ان کو کبھی بھول کر بھی یہ خیال نہیں آتا کہ میدان اجتماعی (معاشرہ) میں اسلام ان کے اوپر کس قسم کے وظائف (ذمہ داریاں) عائد کرتا ہے. بدقسمتی سے ان کو کبھی توفیق نہیں ہوتی کہ وہ سمجھیں کہ ان کی محکومیت

ِ غیراور ذلت و مسکینتِ اجتماعی کی اصل علت (وجہ) یہی ہے کہ انہوں نے۔ ۔ ۔اجتماعیات اسلام کو پس پشت ڈال کر ثابت کر دیا ہے کہ وہ احکام الٰہی کے انتخاب کو فراموش کر کے نا قابل عفو کے مرتکب ہیں۔

اس کے باوجود جدید فضلا و دانشور جو خود کو روشن دماغ اور بلاشرکت غیرا پنے آپ کو مستحق قیادت تصور کرتے ہیں وہ انسان پرست اور فرعونی جماعت کے علمبردار ہیں۔ وہ یورپ کو استاد ازل سمجھتے ہیں۔ وہ محققین یورپ کے اس درجہ معتقد ہیں کہ قرآن وحدیث کو عملاً نظریات یورپ تک کے مقابلہ میں احادیث پارینہ اور داستان ہائے کہنہ خیال کرتے ہیں۔

اس حالت میں مجھے دنیاے اسلام میں کسی جماعت کے ملنے کی امید نہیں ہے جو اس مہم کو سر کر سکے۔ ہاں، افراد ضرور ملیں گے اور ان کے دستیاب کرنے کے لئے ضرور سعی کرنی چاہیے۔

جماعت جو کسی اجتماعی ہدایت کی علمبردار بن سکے اور جو اجتماعی اصول کو تہہ تک سمجھ کر اس کی اصلی شکل میں دنیا کے سامنے پیش کر سکے ان ممالک میں ان ملل میں مل سکے گی جو بشریت کی ہمدردی و انسیت کی خاطر سرفروشی کے خوگر ہیں۔ جن میں اجتماعی تحقیقات کا آزاد دریا بے خوف و خطر ٹھاٹھیں مار رہا ہے اور جن میں جرأت اخلاقی بھی ہے، جن کو اب حیات اجتماعی کی بے حد طلب ہے، جو غلامی و آزادی میں امتیاز کر سکتے ہیں، اور آزادی انسانی ان کو دنیا و مافیہا سے زیادہ عزیز ہے۔

میری رائے میں، اگر وہ غلط نہ ہو، وہ یورپ و امریکہ اول نمبر، جاپان بہ مرتبہ دوم ہے۔

اس لئے میرا خیال ہے کہ اگر ہندستان مرکز تبلیغ قائم کر سکے تو اس کو نمبر اول، (پھر) توجہ امریکہ اور یورپ کی طرف، اور نمبر دویم جاپان و چین کی

طرف اور نمبر سویم امم اسلامیہ کی طرف مبذول کرنی چاہیے.

السنہ (زبانوں) کے اعتبار سے یورپ، امریکہ، جاپان اور تعلیم یافتہ طبقۂ ہند کے لئے انگریزی؛ عرب، شام، عراق، مصر، مراکش، وغیرہ اور علماء اسلام کے لئے عربی؛ افغانستان، ایران کے لئے فارسی؛ ترک، ترکستان (شرقی، غربی وغیرہ) کے لئے ترکی اور تاتاری؛ عام مسلمین ہند کے لئے اردو اور علاقائی زبانوں میں مہارت کی ضرورت ہے.

ان السنہ میں سے فارسی میں مسودہ تیار ہے، اردو کا ترجمہ خود میں نے کر کے بھیجا، مگر برسوں گذرے کہ میں نے اردو تحریر ترک کر رکھی ہے اس لئے وہ (ترجمہ) ہندستان کے مذاق پر درست نہ آیا. اس کا کیا علاج.

اب میری اردو بھی میری فارسی سے زیادہ مغلق اور ترجمہ طلب ہے. اس لئے اجازت چاہتا ہوں کہ فارسی میں لکھوں. اس میں میرا قلم چلتا ہے. آپ لوگ میری اردو کی بجائے میری فارسی سے ترجمہ کریں.

از بکی (زبان) میں حکومت الٰہی کا ترجمہ نظر ثانی اور تصحیح سے خلاصی پا کر پاک نویس ہو رہا ہے اور عنقریب انواع الدول کا ترجمہ شروع ہونے والا ہے اور سورۂ فاتحہ کی تفسیر کا ترجمہ بھی پیش نظر ہے. اس سے روسی اور مشرقی ترکستان کے مسلمان مستفید ہو سکیں گے. انشاء اللہ تعالیٰ.

ایک ترکستانی عالم نے حکومت الٰہی کا ترجمہ عربی میں شروع کیا. دیکھیے کیسا ہو. مولوی تاج الدین نے حکومت الٰہی پر حاشیہ لکھا. ترکستانی قوم ایک وسیع قوم ہے اور ہم سے زیادہ مجاہد. ان کی قوم قتال فی سبیل اللہ میں باشندگان ہند سے زیادہ محکم ہے جس کے شاہد فرغانہ اور شرقی ترکستان کے اقدامات ہیں. اس میں میری ناقص اور پریشان حالی کی تعلیم ضائع نہیں گئی جس پر خدا کا شکر واجب ہے. فاشکرک یا من لک الحمد والشکر.

باقی رہا مسئلہ میری شخصی خدمت کا تو وہ نہ مطلوب ہے اور نہ اس میں کوتاہی پر مجھے

یا آپ کو متاثر ہونے کا حق حاصل ہے.

ترکستانی اسلامی امت ہے اس میں چند افراد کامل جانا خدا کی خاص رحمت اور نعمت ہے. عام ملت کے ملنے کی امید نہ ہند میں ہے، نہ عرب و شام وافریقہ میں، اور نہ ترکستانیوں میں. کس قدر سچی بات ہے کہ ہندستان میں جو علمی طبقہ ہے وہ سمجھتا ہے اور اس کے سمجھانے کے لئے اردو زبان کی ضرورت ہے.

مگر یہ بھی سچ ہے کہ اس ضرورت کا مجھے احساس اول سے ہے. میں نے حکومت الٰہی کا ترجمہ اردو میں کر کے چند سال ہوئے آپ لوگوں کو روانہ کیا مگر اب تک نہ اس کی اصلاح ہوسکی اور نہ طباعت واشاعت. اس لئے انواع الدول اور اعلان تبعیت کا ترجمہ کس امید پر کر کے بھیجوں.

اس کے علاوہ میری صحت خراب، قلم کوتاہ، فکر پریشاں، زبان سخت اور نامانوس. اس لئے جو کام مجھ سے نہیں ہو سکے یا نہیں ہو سکتے وہ ہندستان کے لاکھوں اہل قلم میں سے کسی ایک دو کے سر ڈالتے تو مفید ہوتا. اگر میں اس پریشان حالی اور کس مپرسی کے عالم میں اپنے کوتاہ قلم سے اور کج مج زبان میں اس اصول مردہ کو زندہ کر سکوں تو یہ بھی خدا تعالیٰ کی فوق العادہ رحمت ہوگی.

اگر مولوی حامد (الانصاری غازی) یہ سمجھ لیتے کہ روزانہ مدینہ بند نہیں ہوا اور اس کا وقت میری اردو کی اصلاح یا اس تحریر کے املاء پر صرف کرتے رہتے تو بہت کام ہوسکتا تھا. اگر اب بھی کریں تو تلافی مافات ہوسکتی ہے.

اگر آپ خود ہی کم از کم ایک یا دو گھنٹہ روزانہ اس کام میں صرف کرتے رہیں تو کیا کچھ نہیں ہوسکتا۔

گر پڑے ہے آگ میں پروانہ سا کرم ضعیف
آدمی سے کیا نہ ہو لیکن محبت ہو تو ہو

میں چاہتا ہوں کہ اس عالم ضعیفی اور پریشان حالی میں اپنے آپ کو آزاد رکھ کر کام کروں. کلام اللہ کے فیض سے نہایت قیمتی اجتماعی اصول میرے سامنے آتے ہیں. اگر خدائے تعالیٰ ان کو میرے قلم سے تبلیغ کرا دے تو یہ شرف میرے لئے کافی ہے. باقی مجھے اس کی کچھ فکر نہیں کہ کون اس راہ میں اس آوارہ کی مدد کرتا ہے یا کون نہیں؛ اس تبلیغ کو اب یا کبھی مقبولیت نصیب ہوتی ہے کہ نہیں؛ بلکہ اس تحریک کو بقا بھی میسر آتی ہے یا میرے ساتھ یہ بھی قبر میں دفن ہو جاتی ہے.

ہاں، محبت قلبی کے باعث آپ دونوں (صاحبزادگان حامد میاں اور حمید میاں) کی نسبت خصوصاً اور اہل وطن اور دوستوں کے متعلق عموماً یہ آرزو ضرور دل میں پاتا ہوں کہ اس میدان کے مجاہد سرفروش بنیں. خدا تعالیٰ سے دعاء بھی ہے کہ وہ آپ لوگوں کو سلف صالحین جیسی توفیق اور کامیابی عطا فرمائے، آمین، اور مجھے ان لوگوں کا مثیل نہ بنائے جن کی نیک آرزوئیں پوری نہیں کی گئی ہیں.

مجھے علم ہے کہ آپ لوگ مجھ سے زیادہ پریشان ہیں مگر اس کا کیا علاج کہ کام کا پریشان حالوں سے مطالبہ ہے **ربنا افرغ علیناصبرا وثبت اقدامنا و انصرنا علی القوم الکفرین. آمین یا رب العالمین**. باقی آپ میرے چلے جانے پر افسوس نہ کریں کیونکہ آپ مجھ سے بھی زیادہ مستحقِ خدمت ذات (اپنی والدہ صاحبہ) کی خدمت میں ہیں اور گھر کے سارے افکار کو سپرد بخدا کر دیں.

تبلیغ زبانی کی اہمیت کا میں سب سے زیادہ قائل ہوں. یہ انبیاء علیہم السلام اور حضرت نبی امی کا خاص الخاص اور ابدی وظیفہ تھا اور اب عام امۃ کا وظیفہ ابدی ہے. میرے نزدیک حدیث **رجعنا من الجهاد الا صغر الی الجهاد الاکبر** میں جہاد اکبر سے مراد صرف تبلیغ لسانی ہے. آج دنیا بھی پروپگنڈے کو، جو تبلیغ لسانی کا انگریزی نام ہے، جنگ وحزب سے اکبر اور قوی تر مانتی ہے اور تجربہ کر کے اکبر مانتی ہے.

جن لوگوں نے جہاد اکبر سلوک وتصوف کو مانا ہے انہوں نے اس زبردست تعلیم کی روح کو فنا کر کے امت اسلامیہ کو رہبانیت کی موت مار دیا ہے. عصر (زمانہ) سعادت سلوک وتصوف کے کمالات سے مانوس نہ تھا تصوف اپنی جگہ درست مگر اس کی صورت حاضرہ حادث ہے. وہ ہرگز جہاد نہیں. اور نہ ہی جہاد نبوی کی کوئی قسم ہے. امر اعلیٰ حضرت الٰہی **جاهد الكفار و المنافقين** حضرت نبی امیؐ پر دو قسم جہاد فرض کرتا ہے. جہاد بر کفار یعنی جہاد اصغر، جہاد بر منافقین یعنی لسانی جس کو اکبر کہا گیا ہے. اس لئے یہ آوارہ آپ کو وصیت کرتا ہے کہ جہاد اکبر تبلیغ لسانی میں وقف ہو کر خدا تعالیٰ سے رہنمائی کے طالب رہیں. کامیابی کی سب راہیں کھل جائیں گی.

ہمارے لئے اس کے سوا کیا چارہ ہے کہ **اُفَوِّضُ اَمْرِیْٓ اِلَی اللّٰهِ** (القرآن. غافر ۴۰:۴۴) - میں تو اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کرتا ہوں - کہہ کر قلبی سکون حاصل کریں اور وظیفہ تبلیغ اور جہاد اکبر کے فکر سے استمداد حاصل کریں.

سید راس مسعود کی فکر کے متعلق اس ڈاک سے بوجہ تنگی وقت کچھ نہیں لکھ سکتا. دوسری ڈاک میں بامداد تعالیٰ کچھ لکھ سکوں گا. مشتاق احمد صاحب، حضرت مولانا شاہ ظہور احمد صاحب، حضرت حافظ صاحب، اپنی والدہ صاحبہ، بہن فاطمہ، بی سلمہا، حکیم رشید احمد صاحب، حضرت مولانا مشتاق احمد صاحب، داروغہ ظہور صاحب، حافظ امیر حسن صاحب اور سب احباب سلام مسنون قبول فرمائیں.

فقط والسلام

آوارۂ ہند منصور انصاری

اسلامی نظام نامہ

مولانا محمد میاں منصور انصاری کے لئے حکومت الٰہی فقط ایک فلسفیانہ آرزوئے خام نہ تھی بلکہ قرآن حکیم، سنت طیبہ اور آثار خلفائے راشدین سے ماخوذ ایک ایسا مکمل اور بے عیب سیاسی، عمرانی اور اقتصادی نقطۂ نظر تھا جو نصف صدی تک نصف دنیا میں نافذ تھا اور کامیاب تھا. ان کا یقین تھا کہ جو سیاسی حکمت کامیابی کے ثبوت پیش کر چکی ہے اس کا نیا نفاذ امت کے لئے اتنا ہی آسان ہونا چاہئے جتنا رات کے بعد صبح سویرے بیدار ہونا.

حکومت الٰہی کا نظریہ ان کے ذہن میں رفتہ رفتہ پختہ ہوتا چلا گیا. دارالعلوم دیوبند کے روایتی فارغ التحصیل وہ نہیں تھے کہ منبر پر بیٹھ کر وعظ و تذکیر میں کبھی کبھی خلافت راشدہ کے حوالہ سے یہ ذکر بھی زبان پر آجائے. وہ پیدائشی انقلابی تھے اور عمل سے خالی ہو تو لفظ کو بے قیمت سمجھتے تھے. زمانہ طالب علمی سے ان کا ذہن فیصلہ کر چکا تھا مسلم دنیا کی بے راہ روی اور ذہنی غلامی کا سبب عملی اسلام سے مسلم خواص اور اہل سیاست کی اعتقادی دوری ہے. یہی خیال بالآخر نظریۂ حکومت الٰہی کا مقدمہ ثابت ہوا اور بالآخر وہ اس تصور کی عملی صورت گری اور اس کے نفاذ کے امکانات پر متوجہ ہوئے، اگرچہ بار بار امت کی عام بے حسی ان کا بار ندامت بنتی رہی.

ریشمی رومال تحریک کی ناکامی، شیخ الہند محمود الحسن شہادتانہ وفات، ہندستان میں مسلم قیادت کا اضمحلال، راہ ناشناسی اور منزل نارسی، قومی سیاست پر برطانیہ کے پروردہ یا یورپی افکار سے متاثر افراد کا فکری اور عملی تسلط، اور مولانا محمد میاں منصور انصاری کی عزتمندانہ مراجعت وطن کے معدوم امکانات نے اس مجاہد جلیل کے سامنے ایک ہی راستہ

چھوڑا تھا کہ اعتقادی طور پر مسلم ممالک میں کہیں اس اساسی اسلامی نظریہ کا بیج بو دیا جائے.

اس مقصد کے لئے انہوں نے افغانستان کے امیر حبیب اللہ، امیر امان اللہ، صدر اعظم سردار نصر اللہ خان، وزیر خارجیہ سردار فیض محمد خان، اور آخر میں نادر شاہ اور صدر اعظم محمد ہاشم خان سے امیدیں وابستہ کیں جو کچھ جزوی طور پر پوری ہوئیں اور اکثر کوہستان بے اعتنائی سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گئیں.

سلطنت عثمانیہ کا سقوط ان کے سامنے ہوا اور نوجوان ترک تحریک کی برسوں کی تگ و دو کے نتیجہ میں لادینی قومی حکومت قائم ہوئی تو مولانا منصور انصاری اس باب میں مایوسی لے کر وہاں سے واپس افغانستان آ گئے. مسلمان کے مقصد حیات سے بے خبر یا بے پروا ہمسایہ ترکستانی ریاستیں رفتہ رفتہ روسی قبضہ میں آتی جا رہی تھیں، ازبکستان، کرغیزستان، ترکمانستان، آذربائجان وغیرہ میں انہوں نے برسوں جو محنت کی تھی وہ بے ثمر رہ گئی.

پھر انہوں نے چاہا کہ عرب میں اس فکر کی شجر کاری کریں. اس سلسلہ میں وہ دولت افغانستان سے مدد کے خواستگار ہوئے. مگر ایوانوں میں سناٹا تھا. اور عرب تو ویسے ہی اسلام کے ریگستان میں خیمے لگاےء بیٹھے تھے. یوں بھی جزیرۃ العرب کے چپہ چپہ پر انگریزوں کے گماشتے امیر اور سلطان اور ملک بنے بیٹھے تھے اس لئے مولانا منصور انصاری وہاں چلے بھی جاتے تو ریگستان میں سراب کے سوا کوئی تجربہ نہ ہوتا.

جب ہر طرف مایوسی کے بے رس بادل طاری نظر آئے تو مولانا منصور انصاری نے اپنی توجہات شمال مغربی ہند کے علاقہ آزاد جیسے ایک بہت چھوٹے سے خطہ کی ننھی ننھی سرداری قبائلی ریاستوں پر مرکوز کر دیں. باجوڑ، سوات، دیر، جندول، چترال وغیرہ پر مشتمل یاغستان اور نواح کشمیر میں انہوں نے ہم نوا تلاش کرنے چاہے. وہاں بھی لفظی تائید تو تھی، عملی اقدام معصوم تمناؤں کی آندھیوں میں زمین پر نشان نہ بنا سکا.

بیسویں صدی مسیحی کے ابتدائی برسوں میں تمام مسلم دنیا کا ایک ہی حال تھا. عوام و

خواص میں ایمانی جذبہ بہت تھا، مگر خواص میں اسلامی قوت کا فقدان تھا.عوام میں تمناؤں کا وفور تھا، خواص میں عملی اقدام کی خواہش نہیں تھی. پیش آمدہ مسائل کی تکلیف سب کو تھی، فراست دینی سے سب فارغ تھے.

ان حالات میں کسی کو مرض کا پتا ہو تو بھی علاج ممکن نہیں تھا کیونکہ طبیب سے ملاقات اور دوا کا استعمال دو مختلف باتیں ہیں. کسی مطب کے سامنے سے گزر جانا یا طبی کتاب کا مطالعہ کر لینا علاج وصحت کے لئے کافی نہیں ہوتا.

یہ ساری صورت حال کسی صاحب شعور سے چھپی ہوئی نہیں تھی اور اہل شعور خود ایک بے حقیقت اقلیت تھے. تاہم مولانا محمد میاں منصور انصاری اس بنجر زمین میں قوت ایمانی کا پودا لگانے کی سعی کرتے رہے. ترکی وشام میں نہ سہی، عراق ومصر میں نہ سہی، ایران وافغانستان میں نہ سہی، تمام برصغیر جنوبی ایشیا میں نہ سہی؛ عملی ایمان کا پودا لگانے کے لئے یاغستان کی ایک ننھی سی ریاست دیر وسوات و باجوڑ سہی. علاقۂ آزاد میں ریاست دیر اور سوات کے نواب اور قاضی ریاست دیر وسوات وجندول اور باجوڑ کے سرداران سے متفق تھے. تو وہ قاضی ریاست دیر وسوات وجندول اور سردار ناجوڑ سے مراسلت کرتے رہے.

یاغستان کی یہ ریاستیں جغرافیائی اعتبار سے اہم تھیں. ایک طرف سیاسی اعتبار سے یہ شمال مغربی سرحدی صوبہ سے ملحق تھیں اور دوسری جانب جغرافیائی، لسانی اور تہذیبی طور پر افغانستان سے تعلق خاطر رکھتی تھیں. اس علاقہ میں کسی اثباتی اسلامی تحریک کی کامیابی کے دوررس اثرات برصغیر جنوبی ایشیا سے شمالی و وسطی ایشیا تک وسیع ہو سکتے تھے. ان دونوں وسیع منطقوں کی تاریخ میں اس چھوٹے سے خطہ کی غیور قوم کا کردار کسی سے پوشیدہ نہیں. اسی تاریخی حقیقت کے پیش نظر تین سو سال پہلے شاہ ولی اللہ نے اس خطہ کو آواز دی تھی، دو سو سال پہلے تحریک مجاہدین اسی جگہ برپا ہوئی، سو سال پہلے تحریک ریشمی رومال کا مرکز یہی علاقہ بنا. تو مولانا محمد میاں منصور انصاری نے بھی اسی سرزمین کو کشت امید سمجھا.--م ط غ

قاضی دیر وسوات کے نام مکتوب

برادرم عزیز مکرم جناب قاضی صاحب واحبابہ السلام علیکم ورحمۃ اللہ

چند روز گذرے کہ نامہ رسائی سے خیریت معلوم کر کے مسرور ہوا تھا. بوجہ تنہائی اور مصروفی جواب تاخیر سے لکھ رہا ہوں.

حکومت الٰہی پر آں عزیز اور آں عزیز کی جمعیت احباب کی توجہ پر شکر حق ادا کر کے دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان توجہات کو قبولیت سے نوازے.

حکومت الٰہی کا مسئلہ جتنا اساسی ہے اتنا ہی لمبا بھی ہے. یہ ایک دولتی فطری فلسفہ ہے جس کا منبع قرآن حکیم ہے. یہ آوارۂ وطن بھی اس کا ابتدائی شاگرد ہے اور اس وقت ایک دقت یہ بھی ہے کہ رمضان میں میری تمام تالیفات جو قلمی تھیں چوری چلی گئیں. ان میں بعض اچھی مفصل تھیں. اس لئے اس وقت مطبوعہ تین رسائل روانہ کرتا ہوں، اگرچہ یہ ابتدائی زمانہ کی تالیف ہونے کی علت سے ناقص اور بہت مجمل ہیں، لیکن اس سے آپ حضرات اس کام کی نوعیت اور اہمیت کا اندازہ فرما سکیں گے.

مجھے قرآن حکیم کے مطالعہ سے معلوم ہوا ہے کہ آغاز بشریت سے لے کر آج تک انبیاء علیہم السلام نے صرف حکومت الٰہی ہی کو بشریت کے سامنے پیش فرمایا ہے اور اس کی تبلیغ کی راہ میں سخت سے سخت زحمتیں اٹھائیں، ماریں کھائیں، تکلیفیں اٹھائیں، وطن سے آوارہ ہوئے، مارے گئے آروں سے چیرے گئے، آگ میں جھونکے گئے اور یہی حکومت الٰہی ہے جس کی سیاسی اطاعت اور دولتی تابعیت (رعایا بننے) کو اسلام کا مبارک لقب دیا گیا ہے. خدا کے ہوتے ہوئے اس کے غیر کی حکومت وشاہی کا خیال، معاذ اللہ. اس لئے حکومت الٰہی کی تبلیغ وتفہیم کی سعی واقعی اسلام کی تبلیغ وتفہیم کی سعی اور حضرات الانبیاء علیہم السلام کے رنگ پر (ان کی اخفا کرتے ہوئے) بشریت مظلوم کی خدمت ہے.

حضرات انبیاء علیہم السلام، بالخاصہ حضرت خاتم الانبیاء محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہدفِ نظر یہ تھا کہ مظلوم اور پریشان بنی نوع کو مغرضین (خود غرض) بشریت کے خود تراشیدہ حکومتی فلسفہ (بادشاہت) کے ظالمانہ پنجوں سے نجات بخشیں کیونکہ بشریت عبدیتِ عباد (مخلوقات کی بندگی) کی پستی میں گر کر اپنی بلندی وشرافت سے ہاتھ دھو بیٹھتی ہے.

بشریت کے اس ننگ بشریت گروہ مغرضین (غرض مندوں) کی ہمیشہ سے یہی کوشش چلی آئی ہے کہ وہ بنی نوع انسان کو دھوکہ دے کر اپنی غرض میں پھانس لیں. ان کی غرض یا تو شخصی ہوتی ہے یا قومی یا حزبی. شخص پرست لوگ ایک شخص کی، اور قوم کے بندے اپنی قوم کی، اور کسی انسانی ساخت کے مسلک سیاسی (اشتراکیت، نازیسی [Nazism] وغیرہ) کے پجاری اپنی جماعت کی حکومت اپنی مساوی المرتبہ بنی نوع پر قائم کر دیتے ہیں. ان کی اس غرض پرستانہ کوشش کی کامیابی سے مساوات کی مبادی کے ساتھ امن وسلام عالم بھی برباد ہو جاتا ہے. وجہ یہ ہے کہ انسان اشخاص واقوام اور احزاب کی ان حکومتوں میں سے ہر ایک حکومت تمام دنیا کے چپہ چپہ پر اپنے مال واسباب وثروت کے ذرہ ذرہ کو اپنی ضروریات زندگی میں شمار کر کے عالم گیری کی ترتیبات میں گھس جاتا ہے. ہر ایک حکومت اپنی حیات وبقا کی اولین شرط اس امر کو جانتی ہے کہ یکے بعد دیگرے تمام دوسری حکومتوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا کر ان کے محروسوں کو اپنے محروسہ کا ضمیمہ بنا لے. اس طرح کلیہ انسانی کے ان غرض پرست عناصر کے اندر سر جوڑ کر بیٹھنے کی اہلیت مطلق نہیں رہتی، اور نہ پھر وہ ان میں کسی طرح پیدا ہوتی ہے.

یہ ایک قبیح و مذموم فعل ہے جس سے گروہ بشریت کو بچانا ہماری ذمہ داری ہے. اسی سے انسانوں کی رہائی ان شیطانوں کے چنگل سے ممکن ہو سکتی ہے. اگر ایسا نہیں کیا جاتا تو ملوکیت وآمریت کی مساعی سے بشریت امن وسلام سے ابدی طور پر محروم ہو جاتی ہے.

خدا قدیم وکریم ہے. اس نے مغرضین کی اس فتنہ انگیزی سے بشریت کو محفوظ رکھنے کے لیے ہر زمانہ میں اپنی حکومت کا عصری دستور عطا فرما کر اپنے رسولوں کو بھیجا ہے

تا کہ وہ اپنی تبلیغ سے مغرضین عصر کے پروپیگنڈے کو نیچا دکھا کر جامعۂ انسانی (انسانی معاشرہ) کو اس کے اصلی شرف مساوات اور باہمی انس سے مانوس رکھے. جس سے دنیا کا امن بحال رہے. اس لئے ہر عصر میں حکومت الٰہی کے قیام کی کوشش طاغوتی حکومتوں کے زہر کے لئے تریاق فاروقی کا کام دے سکتا ہے. چونکہ آپ کو معلوم ہے کہ آج کے نہایت روشن دماغ رہنمائے عالم (یورپ وامریکہ، جاپان) قومیت اور حزب پرستی کا شکار ہو کر دنیا کی تباہی کی ترتیبات میں لگے ہوئے ہیں اور انہوں نے اس کو تباہی کے کنارے پر لا کھڑا کیا ہے. اس لئے اس وقت دنیا امن وسلامتی کے اسی میدان میں دستگیری اور امداد کی سب سے زیادہ محتاج ہے.

اس وقت سلسلۂ نبوت ختم ہو چکا ہے مگر اس سلسلہ کی آخری وحی اپنی رہنمایانہ خاصیت کے ساتھ موجود ہے. قرآن حکیم بشریت عقلیہ کی اس مہیب فساد انگیزی کے مقابل اپنی عصری تجلی سے چاہتا ہے کہ کلی وبشری اور اس کے رہنمایان عصر (یورپ، امریکہ، جاپان) سے کہے کہ "ایں رہ کہ تو میروی بہ ترکستان است" قرآن حکیم کا یہ قدم بھی اس کے پہلے قدم کی جو عصر نبوی میں اٹھا تھا اخلاص بہی خواہانہ اور کلیتاً لاغرضانہ ہے. اس لئے قرآن کی اس تازہ خدمت کے علمبردار بھی صرف وہی پاک نیت اور پاک نفس افراد ہو سکتے ہیں جو کہ حضرات صحابہ کی طرح غرض شخصی، قومی، حزبی سے بالکل پاک ہوں اور بہی خواہی بنی نوع کے سوا ان کا کوئی نقطۂ نگاہ مطلق نہ ہو. اس لیے اس خارزار عمل میں قدم رکھنے سے پہلے ہر شخص کو اول خود اپنا جائزہ لینا چاہیے کہ وہ بہی خواہی بنی نوع کے سودے میں اتنا دیوانہ ہے بھی یا نہیں کہ اس خارزار عمل کے تیز کانٹوں کی تاب لا سکے.

آج کلیتاً گروہِ انسانی ایسے مغرضین (غرض کے بندوں) کے ہاتھ میں ہے جو ایسی ہر تبلیغ کا مقابلہ کرنے کو ہمہ تن تیار رہتے ہیں جس کی ضرب ان کی غرض پر پڑتی ہو.

حکومت الٰہی کی تبلیغی نظر میں ہندو، مسلم، یہودی، نصرانی، آتش پرست وصابی اور

موحد، دہری اور سیاہ وسفید، زردوسرخ اور مشرقی مغربی وغیرہ وغیرہ کی مطلق تمیز نہیں. وہ سب کی یکساں طریقہ پر بہی خواہ ہے اور وہ بلاتفریق انسانیت کے ہر شخص اس کی ہر قوم کی نسبت خواہش رکھتی ہے کہ انسان شخص، قوم، حزب کی غلامی وعبدیت کی رذالت سے نجات پائے اور اس کے ساتھ ہی وہ آپس کی سر پھٹوّل کے حامی فلسفوں کے تنویمی تاثرات دیکھ کر اپنے جامعہ کی یگانہ تعمیر، انس ومحبت، لطف واحسان کی امن پرور اساس پر قائم کرے اور بشریت کے گھر گھر میں خدائی اور مالکیت اجتماعی کے دعاوی (دعووں) کو صدا بلند کرنے کا موقع نہ دے. لیکن اس عمومی بہی خواہی کے باوجود وہ خالص لاغرض ہے جس کا تصادم غرض پرستی سے اٹل ہے، اور اس کے مبلغین کا ان کے ہاتھوں ذلتوں اور مصیبتوں میں گرفتار ہونا لازم. اس لئے اس میدان میں سر پر توا باندھ کر داخل ہونا لازم مسلک اور فرض عقل وہمت مسلکی ہے.

یہاں پہنچ کر میں تصریح کرنا چاہتا ہوں کہ اسلام، جمہوریت، مشروطیت، اشتراکیت، فسطائیت کی طرح ایک دولتی (ریاستی) مسلک ہونے کے باوجود ان کے ساتھ ناقابل جمع ہے. ان باطل مسالک کی بنیاد ناقابل جمع سیاہ غرضوں پر رکھی گئی ہے اور اس لئے وہ آپس میں مطلق جمع نہیں ہو سکتے. اسلام (مسلک حکومت الٰہی کی تابعیت) فرض ہے اس لئے وہ بھی کسی دوسرے مغرض (غرضمندانہ) دولتی (سیاسی) مسلک کے ساتھ جمع نہیں ہوسکتا. اس کو برطانیہ کی مشروطہ جمہوریت، جواہر لال جی کی اشتراکیت، مسلم لیگ کی خطابیت، خاکساروں کی ڈکٹیٹری وغیرہ سب مل کر یکساں بیگانگی کی نظر سے دیکھتے ہیں اور غرض سے پاک نیک نہادوں کے سوا اس کا حامی کوئی بھی نہ بنے گا.

اگرچہ نفسانی اغراض میں مبتلا گروہ بشریت کے عہدۂ جاہ ومال میں پھنسنے کے اندیشۂ قوی کے ساتھ اس کی کامیابی کے اسباب بھی زیادہ قوی نہیں، تاہم کچھ تدابیر ہیں جن پر عمل پیرا ہو کر اس مہم میں کامیاب ہوا جا سکتا ہے.

اول: ہر حاکم اپنے خدام اور مخلصین کی امداد خاص کرتا ہے. پس جو لوگ خدا

کی حکومت کی رعیت کر کے ان کی تبلیغ و اشاعت کی خدمت کا مخلصانہ جھنڈا بلند کریں گے ان کی امداد خدا ملیک مقتدر بھی پورے جوش کے ساتھ فرمائے گا، بلکہ خدا کی بارگاہ سے امداد حاصل کرنے کی یگانہ تدبیر صرف یہی ہوسکتی ہے کہ ہم اس کی حکومت کی تابعیت کا مسلک (اسلام) قبول کر کے اس کی تبلیغ میں وقف ہو جائیں.

دویم: انسانیت کی ہر قوم اور ہر ملک کے بصیر اور بلند رتبہ رہنما غرض پرستی کی ہلاکت سے انسانوں کو بچانے کے لئے حکومت الہیٰہ کے نظام کو بروئے کار لائیں. اگر ایک لاغرض و صالح جماعت اپنے بہی خواہ دلوں سے حکومت الٰہی کی فطری تبلیغ کی صدا بلند کرے گی تو امید ہے کہ بحالت موجودہ جلد قبولیت عام حاصل کر سکے گی کیونکہ دنیا کے دانشمند اس کے از حد طالب ہیں اور منتظر.

سویم: لاغرضانہ بہی خواہی عامہ خود ایک نا قابل مقابلہ قدرت ہے جس کے مقابلہ کی تاب غرض کی چٹانیں کسی زمانہ میں بھی نہیں لاسکتیں، بلکہ ان کو ہمیشہ لاغرضی کا مقابلہ کر کے پاش پاش ہونا ہی پڑا ہے. اس موقع پر بھی تاریخ تکرار کیے بغیر نہ رہے گی، مگر شرط یہ ہے کہ ہم غرض پرست نہ ہوں اور ہمارا اوڑھنا بچھانا لاغرضانہ بہی خواہی بشریت کے سوا کچھ نہ ہو.

ان وجوہ سے امید ہے کہ اگر انجام کو خدا پر چھوڑ کر اور کڑا دل کر کے کوئی جماعت حکومت الٰہی کی تبلیغ کا بیڑا اٹھائے گی تو اسے مستقبل قریب میں کامیابی استقبال کرتی ہوئی نظر آئے گی. انشاءاللہ العزیز.

تنفیذ کا طریقہ کار

حکومت الٰہی کا دستور قدیمی دستور ہے. انبیاء علیہم السلام آغاز عالم سے اسی کی تبلیغ فرماتے رہے. حضرت خاتم النبیینؐ اسی کا نا قابل تبدیل اور آخر درجہ کا کامل دستور

اساسی لائے اور اس کو عملاً جزیرۃ العرب میں قایم فرمایا. خلافت راشدہ کے دوران اس کی کامیاب حفاظت فرما کر اسے عرب سے باہر بھی وسعت دی.

بعد کی صدیوں میں اسلام کی حاکمیت وسیاست کا تصور نہ رہا بلکہ اس کو انفرادی و شخصی حق سمجھا جانے لگا. جب حکومت الٰہی انسانی حکومت کے ساتھ ایک محروسہ میں قایم نہ رہ سکی تو حکومت انسانی نے حکومت الٰہی کے نظام، حتّٰی کہ اس کے تصور، کو بھی اپنے محروسہ (مدعیان اسلام کے حلقہ) سے محو و نابود کر دیا اور اس کی صورت صرف یہ کی کہ اسلام کو مذہباً ایک غیر سیاسی اور خالص انفرادی حق قرار دے کر، علماء اور فقہاء اور محدثین کو سیاسی مباحث سے روک کر، صرف انفرادی مباحث اور جزئیات اعمال میں منہمک اور محصور کر دیا. یہی وجہ ہے کہ آج ہر غیر سیاسی جزئیہ کے متعلق تو ہمارے یہاں تحقیقات کے انبار لگے ہوئے ہیں اور سیاسیات نبویہ اور اصول دولتی قرآن کے متعلق ایک عام خاموشی طاری ہے. علماء عقائد امامت سے تعارض فرماتے ہیں. جہاں کہیں اس پر بحث کرنا لازمی ہوتا ہے تو وہ اس پر بحث بھی کرتے ہیں، مگر وہ بالعموم ایک دو نظر سے زیادہ نہیں ہوتا اور وہ بہت جلد اس اساسی بحث سے کترا کر آپ کے اختلافی میدان میں کھڑے ہو کر خم ٹھوکنے لگتے ہیں. اور اس کے بعد اگر کوئی بندۂ خدا اس کے تصور کے احیاء کے لئے کھڑا بھی ہوا ہو تو وہ ایسا ناکام گیا ہے کہ اس کی تاریخ سے تو کیا آج نام و نشان تک سے بھی آشنا نہیں ہیں.

اس لئے ہم فی الحال ان کی تبلیغ کا کوئی ادارہ کھولنے کی جلد بازی نہیں کر سکتے. بلکہ ہمارا اولین فرض ہے کہ اول حکومت الٰہی کا جمہوریت واشتراکیت جیسے عصری اسلوب پر دستور یا نظام نامہ تیار کر کے اس کی تعلیم و تفہیم کے ذریعہ سے چند دانا اور خدا کار افراد کو نظام سیاسی قرآنی کا ماہر اور استاد بنائیں کیونکہ اگر اس وقت تبلیغ کا ادارہ کھولا جائے تو کون ہے جو اس کو صحیح طریقہ پر سنبھالے یا اصولی طور پر اس کی تبلیغ کرے.

اس لئے آپ کے جو احباب حکومت الٰہی کی تبلیغ کے لئے امداد فرمانا چاہتے ہیں

ان پراول فریضہ یہ عائد ہوتا ہے کہ وہ ایک دو، یا تین چار، قابل، پاک نفس اور خدا پرست شخصوں کو فن حکومت الٰہی کے حاصل کرنے کے لئے آمادہ فرمائیں اور ان میں سے جو صاحب اپنے مصارف آپ نہ برداشت کرسکیں ان کے مصارف کے لئے چندہ کر کے انہیں ایک سال یا کم ازکم چھ ماہ کے لئے اس ننگ امت کے پاس بھیج دیں تا کہ وہ سیاست الٰہی کے متعلق میری تحقیقات کو بالمشافہ سن سنا کر اور اپنی خداداد فہم وفراست سے اسے ترقی دے کر اس کے بعد اپنے تبلیغی مساعی سے مبلغین کی ایک جماعت ہندستان جا کر تیار کرلیں اور ہر ایک تبلیغی ادارہ کامیابی سے قائم کر کے نور فطرت کو مشرق ومغرب میں پھیلائیں.

افغانستان میں آنے والے اصحاب علم کے لئے ضرور ہے کہ

(الف) علوم دینی (قرآن، حدیث، عقائد، فقہ، تفسیر) میں ماہر ہوں اور نظر تقلیدی جامد کی جگہ تحقیق کی طرف میلان رکھے اور رنگِ حضرات صحابہ سے رنگین ہونے کے قابل ہوں.

(ب) دماغِ سیاسی کے مالک ہوں اور سیاسیات کی تحقیق وتنفیس کے شائق ہوں ان کے ساتھ قبول حق اور اس کی پرجوش تبلیغ کا جذبہ کامل بھی رکھتے ہوں.

(ج) اگر یورپین زبان (انگریزی وغیرہ) سے سب کے سب واقف ہوں تو نورٌ علیٰ نور، اور اگر نہ ہوں تو ان کے ساتھ

(د) ایک شخص جو انگریزی کا ماہر اور اس میں سیاسیات کا مطالعہ رکھنے والا ہو ضرور ہونا چاہیے تا کہ سیاسیات عصریہ سے استفادہ کر کے حکومت الٰہی کے نظام نامہ کو عصری اسلوب بیان پر ڈھال سکے. انگریزی داں شخص کے لئے لازم ہے کہ اتنا بلند فکر ہو جس کو سیاسیات تازہ جمہوریت، اشتراکیت وغیرہ کے عیوب نظر آتے ہوں اور اس کو ان سے بلند تر نظام بنانے کی تلاش کرسکتا ہو.

اس وقت میرے سامنے اولین کام یہی ہے جو اوپر عرض کیا. اگر آپ کے حضرات

اس اساسی اسلوب پر کام کرنا پسند فرمائیں تو بسم اللہ. اور اگر اس راہ میں موانع ہوں تو دوسرا کام میری تالیفات کی اشاعت ہے اردو، عربی، انگریزی میں. اس صورت میں میں اپنی تالیفات آپ حضرات کی خدمت میں نقل کرا کر روانہ کرتا رہوں گا. آپ حضرات ان کے ترجمہ اور اشاعت کے لئے ایک قابل کار ادارہ قایم کر کے ہندستان میں اشاعت کا کام کریں. اور نیز مطالعہِ کتب کے ذریعہ سے اگر مبلغ تیار ہو جائیں تو وہ اشترا کیوں اور کانگریس وغیرہ کی طرح اپنی ایک سیاسی جماعت بنا کر حکومت الٰہی کی تبلیغ ہندستانی اقوام میں کریں.

حضرت نبی الرحمۃؐ کی مکی زندگی کے اتباع میں عدم تشدد کے پابند رہیں تبلیغی مساعی سیاسی انداز پر تشکیل ہوں کیونکہ حضرت خاتم النبینؐ نے کسی ایسے انفرادی حق کی تلقین ہرگز نہیں فرمائی جو کسی دوسرے نظریۂ دولتی کے ماتحت رہ کر زندگی بسر کر سکے. آپؐ کا انداز سرتاپا سیاسی اور دولتی تھا. آپ نے مکہ معظّمہ میں حکومت الٰہی قائم فرمانی چاہی، جب وہاں ممکن نہ ہوا تو آپ نے مکہ سے مدینہ منورہ ہجرت فرمائی اور مکہ اور مدینہ کے پاک نفس لا غرضوں کے مجاہدات کے سایہ میں اسے قائم فرما کر تمام عربستان پر اس کو عام فرمایا.

الحاصل، اسلام کو فقط مذہب پر تنزل دینا غلط ہے. ایک مذہب کی تبلیغ سے اس میں چند افراد تو داخل ہو سکتے ہیں **یَدخُلُونِ فِی دِینِ اللّٰہ اَفوَاجاً ، لِیُظھِرَہٗ عَلَی الدِّینِ کُلِّہ** کا سماں ہرگز نہیں بندھ سکتا. سلام کو یہ دونوں صفتیں بالیقین حاصل ہیں اس لئے بالیقین وہ سیاست دانی کا فطری نظام ہے. اس لئے اس کی تبلیغ میں حضرت نبی الرحمہ کا سیاسی اسوۂ حسنہ پیش نظر رکھنا فرض ایمان ہے. البتہ آج کل کی ترقی تنظیم کار سیاسی سے استفادہ کرنا طبعی ہے، یعنی اس کی تبلیغ سیاسی اصول پر ہونی لازم ہے اور اس کی مبلغ جماعت کی تنظیم سیاسی انداز پر ہے. سیاست و دین کی جدائی کے اصول پر چل کر حلقۂ مسلمین میں جو تبلیغی جمعیتیں الگ اور سیاسی الگ تشکیل ہو گئی ہیں وہ اصل اسلام سے بے خبری اور اسوہ سیاسی نبی الرحمہؐ سے روگردانی ہے. اس لئے سیاست و مذہب کے امتزاج کے اصول پر کام شروع کرنا چاہیے.

مقصد صلاۃ

نماز ایک مراقبہ اور مسلسل مشق ہے جسے اگر صحیح طور پر کیا جائے تو اس سے خدا تعالیٰ کی حکومت اور پادشاہی کا عقیدہ پختہ ہوکر انسان کے دل سے انسان کی حکومت اور پادشاہی کا مردار خیال نکل جاتا ہے، جس سے انسان خدا کا سچا بندہ اور اس کی حکومت وشاہی کی پکی رعیت بن کر انسانوں کی گڑھی ہوئی قانونی بندشوں سے آزاد ہو جاتا ہے.

مراقبۂ نماز

اول انسان کو چاہیے کہ دل سے یقین کرے کہ اس کا بادشاہ خدا ہے اور وہ نماز میں اپنے خدا بادشاہ کے دربار میں عریضہ پیش کرنے کے لیے حاضری دیتا ہے.

جب انسان وضو کرنے بیٹھے تو خیال جمائے کہ مجھے اب خدا کے دربار میں حاضر ہونا ہے. اس لیے میں ہاتھ منھ وغیرہ دھوکر تیار ہو رہا ہوں تاکہ اس کے دربار میں صاف ستھرا ہوکر حاضر ہوں. اور مسجد یا جانماز پر پہنچ کر قبلہ کی طرف منھ کر کے کھڑا ہو جائے تو خوب خیال باندھے کہ خدا تمام جہانوں کا یگانہ مالک اور میرا بادشاہ ہے. اب میں اس کے شاہانہ دربار میں پہنچ کر بالکل اس کی روبرو کھڑا ہو گیا ہوں تاکہ سورۂ محمد اس کے مقدس دربار میں پیش کروں. وہ اگرچہ وہ مجھے نظر نہیں آتا لیکن میرے سامنے موجود ہے. اس لیے ایسے ادب اور تعظیم سے آنکھیں نیچی کر کے سیدھا کھڑا ہو جاؤں جیسا کہ ایک عظیم الشان بادشاہ کی حضور میں ادب سے کھڑا ہونا چاہیے.

اس کے بعد جو نماز پڑھنی ہو اس کی نیت کرے اور پھر کانوں تک ہاتھ اٹھا کر

خیال جمائے کہ اپنے بادشاہ کے لیے دونوں جہاں سے ہاتھ اٹھا کر صرف اس کا بندہ ہوں اور اس کے ساتھ اللہ اکبر کہتے وقت اس کے معنوں کا دھیان کرے کہ اللہ دنیا کی سب قوتوں سے بڑا ہے اور پھر دونوں ہاتھ ناف کے نیچے باندھ کر تابعدار غلاموں کی طرح نہایت ادب سے کھڑا ہو جائے.

اور تیرے سوا کوئی مولا اور بادشاہ نہیں جس کے سامنے حد سے زیادہ ذلت اختیار کی جائے.

دستور ہے کہ جو شخص اپنے بادشاہ کے حضور میں باریاب ہوتا ہے تو اپنے مطلب کے عرض کرنے سے پہلے بادشاہ کی تعریف اور بڑائی بیان کرتا ہے. بادشاہ کے دربار میں پہنچتے ہی اپنا مطلب شروع کر دینا ادب شاہی کے مخالف اور بے ادبی خیال کیا جاتا ہے.

اس لیے سورۂ فاتحہ سے پہلے جو عرضی ہے سبحنک اللھم پڑھے اور تصور کرے کہ میں اپنے مطلب کے عرض کرنے سے پہلے اپنے بے مثال اور سچے بادشاہ کی تعریف اور بڑائی بیان کر رہا ہوں.

سُبۡحٰنَکَ اللّٰھُمَّ وَبِحَمۡدِکَ وَتَبَارَکَ اسۡمُکَ
وَتَعَالٰی جَدُّکَ وَلَااِلٰہَ غَیۡرُکَ

الٰہی! تیری ذات تیری صفتوں و کمال کے سبب ہر عیب و نقص سے بالکل پاک ہے
اور تیرا نام بڑا برکت والا ہے. اور تیرا رتبہ بہت ہی بلند ہے.

اس کے ختم ہونے کے بعد اپنی رسمی عرضی یعنی سورۂ فاتحہ معنوں کے دھیان کے ساتھ اپنے خدا بادشاہ کے حضور میں بڑے ادب اور عاجزی سے زبانی پیش کرے.

نوٹ : نماز اسی عرضی کو پیش کرنے کے مراسم دربار شاہی ادا کرنے کا نام ہے. خدا کریم اپنے رعایا اور بندہ کی اس عاجزانہ عرضی کو قبول فرماتا ہے اور بندہ اس کے اس کرم کا شکریہ ادا کرتا ہے جس کی تفصیل آگے آتی ہے.

عرضی مع ترجمہ

سورۂ الحمد سے پہلے اعوذ باللہ اور بسم اللہ پڑھی جاتی ہے اس کا ترجمہ مع اعوذ و بسم اللہ لکھا جاتا ہے.

ترجمہ اعوذ باللہ

میں بندۂ عاجز اپنے بادشاہ خدا کی پناہ میں آتا ہوں شیطان ومردود کی دشمنی سے.

ترجمہ بسم اللہ

(اس پناہ میں رہنے کے لیے میں اپنی اس عاجزانہ عرضی کو)

اپنے بادشاہ خدا بے حد مہربان بے مثال قدردان کے مبارک نام سے شروع کرتا ہوں.

ترجمہ سورہ فاتحہ

(جہاں میں نظر آنے والی اور موجود) سب تعریفیں اور صفتیں اللہ بادشاہ ہی کی ہیں جو مالک ہے سارے جہانوں کا.جوزبردست مہربان ہے سارے جہان پر.بے حد قدردان ہے اپنی بادشاہی کے جان نثاروں کا.روز جزا کا بادشاہ ہے.(اے ہمارے قدردان بادشاہ) ہم صرف تیری ہی سلطنت کے غلام اور رعیت بنتے ہیں.اور صرف تیرے شاہانہ دربار میں ہی امداد کے لیے اپنی درخواست پیش کرتے ہیں.تو ہی ہدایت فرما ہماری جماعت کو سیدھے راستہ (یعنی اپنے دولتی نظام اور مسلک) کی طرف جو مسلک رہا ہے تیرے ان گذشتہ فدا کار وفا شعاروں کا جن کی ٹولی کو تو نے انعام دیا (ان کی وفا اور جان نثاریوں کے بدلہ میں).اور تو ان (انعام یافتہ لوگوں کو) جو تیرے جاں نثار، میں ان لوگوں یا گروہوں سے جُدا اور اجنبی کردے جو تیری شہنشاہیت کے مخالف یا تیری خدائی کا انکار کرنے والے ہیں.اور نہ ہی انہیں اس جماعت میں شامل فرما جو (سیدھی راہ سے) خود بھٹک گئے ہیں (یا شیطان کے دجل وفریب میں آکر) دوسروں کو بہکانے والے ہیں.آمین یعنی حضور، میری یہ عرضی قبول فرمالیجئے.

سورہ فاتحہ کی تفسیر

عرضی کا جواب

سورۂ الحمد بندہ کی عاجزانہ عرضی کے ختم ہونے پر نمازی خود یا اس کا امام قرآن عظیم کی چند آیتیں یا کوئی سورہ پڑھتا ہے. یہ اس کی عرضی کا جواب ہے. اس لیے نمازی کو اس جگہ خیال باندھنا چاہیے کہ اس شاہنشاہ عظیم نے کمال مہربانی سے میری عاجزانہ عرضی قبول فرما کر اس کا یہ جواب دیا ہے جس کو خود میں پڑھ رہا ہوں یا امام کی زبانی سن رہا ہوں. یہاں تصور کرے کہ عرضی کا جواب تو سارا قرآن شریف ہے مگر اس جواب کا بطور نمونہ یہ ایک ٹکڑا ہے جو پورے جواب کی طرف اشارہ کرتا ہے. اس لیے قرآن شریف کے اس حصہ کو بھی معنوں کے پورے دھیان کے ساتھ پڑھے. اور اگر نمازی مقتدی ہو تو اور دن کی نمازوں (ظہر وعصر) میں صرف عرضی کے معنوں اور اس کے پورے جواب (قرآن شریف) کا دھیان کرے. کیوں کہ امام ان وقتوں میں قرآن شریف آہستہ آہستہ پڑھتا ہے جسے مقتدی نہیں سن سکتا.

عام مطالعۂ قرآن کی ضرورت

یہاں پر ہر شخص کو معلوم ہو گیا کہ ہر مسلمان پر لازم ہے کہ وہ پورا قرآن شریف ترجمہ کے ساتھ پڑھے کیونکہ سورۂ فاتحہ اور قرآن مبین کے ترجمہ کے بدون کوئی مسلمان ہرگز نہیں سمجھ سکتا کہ اس نے عرضی میں کیا عرض کیا اور بادشاہ اور قدر دان مالک کی طرف سے اس کی عرضی کا کیا جواب ہے. اور کیا وظیفہ مہربان مقرر ہوا ہے اور اس کو سلطنت کا کون سا نظام دیا گیا ہے کہ جس کو وہ دنیا میں تبلیغ کے ذریعہ قایم کرے اور اس کو کون سا قانون عطا ہوا ہے جسے وہ اپنے اور اپنوں اور اپنے ملک پر جاری کرے.

اس جگہ نمازی خوب تصور کرے کہ جب تک ایک نمازی اپنے بادشاہ کے سلطنت

کے نظام اور اس کے قانون کو خوب سمجھ کر اس نظام کو اور قانون کو دنیا میں چلانے کی واجبی کوشش نہ کرے گا اس کا وظیفہ ہرگز ادا نہ ہوگا، اور اس لیے وہ شہنشاہ نہ کبھی اس کو اپنے دربار میں عزت ہی بخشے گا، اور نہ اپنے حلقۂ سلطنت میں اقتدار، اور نہ دولتی میدان میں اس کی کمک ہی فرمائے گا جس سے وہ کامیاب ہو سکے، اور نہ اس کو دونوں جہانوں میں انعام ہی دے گا جس سے اس کا کسی جہان میں بیڑا پار ہو سکے.

اس لیے معنوں کے ساتھ قرآن شریف پڑھنا ہر مسلمان مرد و عورت پر سب سے زیادہ لازم ہے.

اور پھر ہر مسلمان مرد عورت پر فرض ہے کہ اس کی بادشاہی کے قایم کرنے کے لیے ایک مرکز کے ماتحت رہ کر تبلیغ کرے اور جب تک تمام دنیا کے اوپر خدا کی قرآنی سلطنت چھا نہ جائے برابر فدا کارانہ تبلیغ کرتا رہے کیونکہ اس کے بغیر کوئی شخص اپنے مہربان بادشاہ (خدا) کی رضا اور دنیا میں اصلی عزت اور اقتدار اور اس کے لیے خدا بادشاہ کی مدد اور آخرت میں جنت ہرگز حاصل نہیں کر سکتا.

خدا کی حکومت و سلطنت کی تاسیس کی جو شخص واجبی سعی نہ کرے اور اس سے منھ موڑ کر مدت العمر اس کے غیر کی حکومت و سلطنت کی رعیت بنا رہے تو اس حالت میں خدا بادشاہ اس سے کیسے راضی ہو سکتا ہے.

ترجمہ سورۂ اخلاص

سورہ الفاتحہ کے بعد سورہ الاخلاس کی تلاوت کرے.

(اے محمد! یا اے نمازی) اعلان کر کہ وہ اللہ تنہا (بادشاہ) ہے. اللہ تمام کائنات کا حاجت روا ہے. اس کی کوئی اولاد نہیں اور نہ وہ کسی کی اولاد ہے. اور نہ اس کا کوئی خاندان اور کوئی قبیلہ ہے. اور نہ ہی کوئی اس کا ہمسر، شریک یا ساتھی ہے.

سورۂ اخلاص کی تفسیر

اس سورۃ کا حاصل یہ ہے کہ خدا بادشاہ اس مختصر سورۃ میں اپنی ایک رعیت کی عرضی کے جواب میں اس کو اپنی مقدس بادشاہی کا مسلک دیتا ہے تا کہ نماز کے بعد ہر شخص اس کا پروپگنڈا اور زبردست تبلیغ کر کے اس کی رضا حاصل کرے.

وہ مقدس مسلک یہ ہے خدا احد یعنی صرف ایک ہے. تمام انسانوں اور سارے جہانوں کا بادشاہ اور حاکم خدا کے سواء کوئی ہو ہی نہیں سکتا اس لیے جو قومیں اپنی بادشاہی اور حکومت کا دعویٰ بگھارتی ہیں خواہ انسانوں کی ہوں یا جنات کی یا ارواح اور بت وغیرہ کی سب جھوٹی ہیں اور کذاب کیونکہ انسانوں اور سارے سنسار کا بادشاہ اور فرمان فرما وہی ہوسکتا ہے جو سب کا داتا اور حاجت روا ہو اور چونکہ ایسی اعلیٰ وافضل قدرت اور دولت والی کوئی ہستی نہ تو انسانوں کے اندر موجود ہے اور نہ عالم ارواح میں اور فرشتوں اور جنات میں اور نہ ہی چونے مٹی، پیتل، چاندی، سونے اور یا قیمتی پتھروں سے بنی ہوئی مورتیوں ہی میں. اس لیے ان میں سے ایک بھی انسانوں اور سنساروں کا بادشاہ اور حاکم یا فرمانروا نہیں بن سکتا.

ہاں! خدائے کریم چونکہ صمد، یعنی سارے سنسار اور کائنات کا حاجت روا اور داتا ہے؛ اس نے زمین، آسمان، پانی، ہوا، بر و بحر، کوہ و فضا اور طرح طرح کے غلے والے میوے اور نعمتیں پیدا کر کے تمام کائنات کی حاجت روائی کا بندوبست فرما دیا ہے، اس لیے تنہا وہی احد یعنی تمام سنسار کا بلا کسی کی شرکت کے بادشاہ فرمانفرما اور مولا ہے.

اس کے علاوہ وہ ازلی ابدی ہے اس کو موت اور فنا نہیں، عدم اور نیستی نہیں، کیونکہ دنیا کے حاجت روا اور سنسار کے داتا کا ہمیشہ رہنا ضروری ہے. اگر کسی وقت وہ نہ ہو تو دنیا کی بے شمار حاجتوں کا بہتا ہوا اور ٹھاٹھیں مارتا ہوا دریا اس وقت کون چلائے گا. اس لیے اس کی شاہی بھی ہمیشہ سے ہمیشہ تک رہے گی اور کسی انسان کو کسی وقت بھی ضرورت نہ پڑے گی کہ

غیر خدا کی کسی جھوٹی اور پست حکومت کا غلام اور فرمان بردار رعایا بنے.

اس کے علاوہ اس کی شہنشاہیت مستقل ہونے کے بعد بھی کسی کو نہیں پہنچتی کیونکہ بادشاہی کا انتقال وراثت کے ذریعہ سے ہوتا ہے. اور اس کے کوئی وارث ہی نہیں. اس کے اولاد لڑکا، لڑکی، پوتا، پوتی وغیرہ وغیرہ نہیں. وہ کسی کی اولاد نہیں جو اس کے یہ رشتہ دار باپ، دادا، پردادا، ماں، نانی وغیرہ چچا، تایا وغیرہ بھائی بہن وغیرہ سگے، چچا، تائے، خالہ، پھوپھی زاد وغیرہ وغیرہ ہوں. بادشاہی بذریعۂ وراثت انہی رشتہ داروں کو پہنچا کرتی ہے.

جب اللہ الصمد کے یہ رشتہ دار نہیں ہیں تو اگر وراثت سے پہنچے بھی تو کس کو پہنچے. اگر کسی شاہ کے رشتہ دار نہیں ہوتے تو اس کی بادشاہی اس کے خاندان میں منتقل ہو جاتی ہے تو خدا کی شاہی میں یہ صورت بھی ممکن نہیں کیونکہ اس کا برابر کا کوئی خاندان اور قبیلہ (کفو) بھی نہیں ہے جو خدا کی شاہی اس کی طرف منتقل ہو سکے.

غرض کہ خدا بادشاہ سے منتقل ہو کر بھی اس کی شاہی کسی کو نہیں پہنچ سکتی. باقی بعض خاندان خدا سے اپنی رشتہ داری بھی بتاتے ہیں. ایسے تمام خاندان بالکل جھوٹے ہیں. حضرت صمد (اللہ) کہاں اور وہ کہاں. ہر شخص جو عقل رکھتا ہو ان کی حاجتمندی اور کھلی ہوئی انسانیت اور حالت فانی دیکھ کر حکم لگا سکتا ہے کہ ان فضول لوگوں کا دعوی سراسر غلط ہے.

اس لیے سارے سنسار پر صرف خدائے صمد ہی کو بادشاہی کا حق حاصل ہے اور دوسرے سب شاہی وحکومت کے مدعی یاوہ گو اور جھوٹے ہیں.

پس دنیا کے ہر ایک انسان کا وظیفہ ہے کہ وہ خدائے صمد کے سوا کسی کی کسی قسم کی حکومت کو قبول نہ کرے کیوں کہ اس میں ہر طرح کی محرومی ہے. اس لیے ضروری ہے کہ ہر شخص صرف خدائے صمد کی شہنشاہیت کا وفادار اور جان نثار رعیت بن کر آخر عمر تک صرف اسی کی تبلیغ دلیل اور نرمی اور شرافت کے ساتھ کرتا رہے تاکہ دنیا میں عزت، قوت اور خدا کی رضا اور آخرت میں جنت الفردوس اور اعلیٰ علیین پا سکے.

تسبیحات رکوع وسجود

الحمد کے بعد سورۃ یا آیتوں کے پڑھنے یا سننے اور فرمان شاہی الٰہی کے سمجھنے کے بعد نمازی اللہ اکبر کہتے اور اس کے معنوں کا دھیان کرتے ہوئے رکوع میں چلا جائے اور تصور کرے کہ .شاہنشاہ کریم حضرت الٰہی نے چونکہ مجھ نادار اور عاجز کی عرضی منظور کر لی ہے تو میں اس کی اس بے حد مہربانی کی شکرگذاری کے لیے اور اس کے حکم کے سامنے سر جھکا تا اور پشت کو خم کرتا ہوں .اس عمل سے ظاہر ہو جائے کہ اپنے سچے بادشاہ کا دل سے مشکور اور اس کے ہر اشارہ اور ارادہ (فرمان) کے سامنے سر تسلیم خم اور پشت جھکا تا ہوں تا کہ اس کی بادشاہی کے ہر قانون کو فرمانبرداری کے درجہ پر مانوں اور اس کے ہر قسم کے بار کو اٹھاؤں .

رکوع میں معنوں کے دھیان کے ساتھ کہے **سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْم** یعنی سب عیبوں سے پاک ہے میرا بڑی عظمت والا مالک اور بادشاہ .

اس تسبیح کو تین یا پانچ یا سات بار کہے مگر بڑے ادب اور فصاحت سے .یہ تسبیح خدا بادشاہ کی حمد بھی ہے .

اس کے بعد **سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنْ حَمِدَہ** معنوں کے تصور کے ساتھ کہتا ہوا رکوع سے سیدھا کھڑا ہو جائے اور تصور کرے کہ میرے بادشاہ خدا کی طرف سے بشارت مل رہی ہے کہ میں نے رکوع میں جو خدا کی حمد کی ہے اسے بھی شاہنشاہ عظیم نے سنا (سمع) قبول فرما لیا ہے .

اس زبردست کریمانہ بشارت کے سنتے ہی بندہ پر فرض ہو جاتا ہے کہ وہ اس مہربان اور قدر دان شاہنشاہ کا شکریہ اور حمد رکوع سے بھی بڑھ کر ادا کرے .اور اس کے دربار میں رکوع کی حالت سے بھی بڑھ کر اپنا فقر اور ذلت اور پستی کی عملی اور زبانی نمایش کرے .

یہ انتہائی شکریہ اور عاجزی سجدہ اور اس کی تسبیح ہے .

نمازی سجدہ میں شکریہ سے لبریز دل لے کر نہایت خشوع اور خضوع سے جائے

اور سجدہ میں معنوں کے دھیان کے ساتھ تین یا پانچ یا سات بار **سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی** کہے یعنی سب کمزوریوں سے بالکل پاک اور مبرا ہے میرا مالک جو ہر ایک قدرت اور قوت پر سچا اعلیٰ اقتدار یعنی غیر مصنوعی بادشاہ ہے.

سجدہ دوبار ادا کرے کہ انعام کا شکریہ دوبارہ ادا ہونا چاہیے.

سجدہ میں نمازی اپنے جسم کو توڑ مڑوڑ کر بہت چھوٹا بنا کر خدا بادشاہ کے سامنے پیش کرتا ہے. اور پھر اس کے سامنے اپنی اونچی ناک اونچا ماتھا اور سر پشت زمین پر ٹیک کر اس کے دربار میں اپنی انتہائی خوردی اور ذلت و خواری کی نمایش کرتا ہے. لازم ہے کہ سجدہ میں اس عملی ذلت کی نمایش کا پورا پورا دھیان نمازی کے دل میں بھی روشن انداز رہے.

دوسری رکعت

دوسرے سجدہ سے اٹھنے پر نماز کی ایک رکعت پوری ہو جاتی ہے. اس کے بعد دوسری رکعت کے پڑھنے کے لیے اللہ اکبر کہتا ہوا کھڑا ہو جائے.

دوسری رکعت بسم اللہ اور الحمد سے شروع کر کے وہ پورے تصورات اور آداب جو پہلی رکعت میں بیان ہوئے اس رکعت میں بھی بجا لائے.

اگر نماز دو رکعت والی ہو تو دوسرے سجدہ کے بعد بیٹھ کر التحیات، درود شریف، اور دعاء معنوں کے دھیان کے ساتھ پڑھے اس کے بعد دونوں طرف منہ پھیر کر السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہے اور دھیان کرے کہ اب میں اپنے شاہنشاہ کے حضور سے اپنی عرض و معروض میں کامیاب ہو کر واپس آ رہا ہوں اور ہر آنے والے کے دستور کے مطابق اپنی دائیں بائیں کے آدمیوں اور فرشتوں کو سلام مسنون کرتا ہوں.

مذکورہ بالا چاروں چیزوں کو باترجمہ لکھا جاتا ہے. ان کے ترجمہ کے بعد دس سورتوں کا ترجمہ مع تفسیر لکھا جائے.

الفلق اورالناس کی تفسیر

قرآن شریف جس میں کہ شاہی الٰہی کا نظام وتشکیل، قانون، اصول عدالت، فلسفہ اور حکمت کا اجرا بیان کر دیا گیا ہے ،سورۂ اخلاص جس میں توحید خالص، اللہ وحدہ لاشریک لہ کی وحدانیت اوراس کی ذات وصفات میں کسی بھی طریقہ کی عدمِ شرکت کو واضح لفظوں میں بیان کر دیا گیا ہے.حضرت شاہنشاہ نے اس کے لیےقوۃ اجرائی شوروی بھی وقف عمل فرمادی جس کے مقابل شاہی الٰہی کے مسلک کی مخالف قوتیں بھی وقف خصومت نظر آتی ہیں.

قاعدہ ہے کہ ہر حکومت اوراس کے علمبرداروں کے وہی لوگ مخالف اور جانی دشمن (مخاصمین) ہوتے ہیں جو کسی دوسرے حکومتی مسلک کے پرستار ہوتے ہیں.پھران کی دشمنی اور شرارت کی راہیں بھی مختلف ہوتی ہیں.مثلاً کوئی چاہتاہے کہ رات کے گھپ اندھیرے میں شاہی الٰہی کے چوٹی کے علمبردار کا کام تمام کردینے کا بندوبست کرے.کوئی چاہتا ہے کہ عملیات اورتعویذ گنڈے، جادو سے حسد رکھنے والوں کی ٹولی جمع کر کے اس کی قوت سے اس مسلک کا خاتمہ کردے.اور سب سے مہیب اس دشمن کی شرارت ہے جو پروپیگنڈا اوراس کی تشکیل کے زور سے شاہی الٰہی کے مسلک اوراس کے علمبرداروں کی قوت اور تنظیم کوفنا کے گھاٹ اتاردینا چاہتا ہے.

خدائے کریم نے اپنی حکومت کے مخالفین کے مقابل عمل،سعی وجہاداورقتال اور ہرقسم کی تیاری اسباب کے علاوہ جو کہ قرآن شریف میں گذر چکا ہے دوسورتیں (سورہ فلق اورسورہ الناس) جنہیں عرفِ عام میں معوّذنین کہاجاتا ہے،بطورِخاص نازل فرمائیں.

ان دونوں سورتوں میں ایک خاص سبق دیا گیاہے، وہ یہ کہ شاہی الٰہی کے علمبردار،مخالفین الٰہی کی ہرقسم کی ظاہری اور باطنی سعی وجہادتدبیرتوضرورکریں مگراپنی انسانی

حیثیت کی بلند سے بلند تدابیر اور اسباب پر تکیہ بالکل نہ رکھیں کیونکہ ہوسکتا ہے کہ مادی اعتبار سے دشمنوں کی تدبیر اور تیاری اس سے بھی بلند تر ہو. اس لیے چاہیے کہ شاہی الٰہی کا ہر مبلغ اپنی آخری تدبیر کو کسی حال میں بھی نہ بھولے، جو یہ ہے کہ وہ سعی و جہاد انتہائی کے باوجود خود کو اپنے خدا، اپنے شاہنشاہ، اپنے مالک کی قوتوں اور قدرتوں کی پناہ اور حفاظت میں آخر دم تک دے رکھے اور اپنی قوتوں اور قوتناک تدبیروں سے زیادہ اس مدبر عالم مدبر امر وحکومت کی تدبیر اور کارسازی پر اعتماد رکھے.

ہاں یاد رہے کہ اس اعتماد علی اللہ کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انسان تدبیر اور تیاری آلات واسباب سے بے غم ہوکر ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائے. ایسا کرنا حماقت اور خدا کے احکام سے جہالت ہے. یہ راستہ خدا کی ناراضی اور نتیجہ کی رو سے ناکامی کا ہے.

خدا تعالےٰ قرآن شریف میں اپنی شاہی کے قیام، استحکام، ترقی، توسیع کے لیے اس کے علمبرداروں سے بڑے سے بڑا جہاد وقتال، تدبر، تہیۂ اسباب بھی چاہتا ہے اور پھر اپنی خاص اور پنہا قوتوں اور قدرتوں پر تکیہ بھی. اگر ان دونوں میں سے کسی ایک میں بھی سستی یا فتور نمایاں ہو تو شاہنشاہ ضرور ناراض ہوگا جس کا نتیجہ دارین کی بربادی ہے.

سورہ الفلق

خدا بادشاہ نے از راہ کرم تمام مخلوقات کی مجموعی بڑی بڑی شرارتوں کے بعد تین شرارتوں سے جو اول مذکور ہوئیں (یعنی رات کے اندھیرے میں تعویذ گنڈے اور عملیات اور حسد کی بھڑکتی ہوئی آگ) سے پناہ لینے کی تعلیم کے لیے سورۂ فلق کو خاص فرمایا. اور اس کی حفاظت کا مرکز اپنی ایک اساسی اور نہایت کریمانہ صفت فلق (صبح صادق کی مالکیت یا خالقیت) قرار دیا.

صبح صادق آفتاب عالمتاب کا ابتدائی نورانی اثر ہے. آفتاب اس زمین پر منبع نور

ہے جس سے آنکھوں پر سے تاریکی یا جہل کے پردے ہٹ جاتے اور اس پر علم کا دروازہ کھل جاتا ہے. آفتاب کے نور عرفان سے پہلے برے، کنویں، گڑھے، سیاہ سفید، اونچ نیچ، اپنے پرائے کا علم ہو جاتا اور راہ کے سیدھے یا ترچھے ہونے کی تمیز ہو جاتی ہے.

میرے نزدیک یہاں آفتاب عالمتاب عرفان ریز سے مراد یہی قرآن عظیم الشان ہے جو سورۂ فلق سے پہلے بحیثیت احکام و نظام تمام ہو چکا.

فلق اور صبح صادق سے مراد قرآن عظیم کا وہ ابتدائی اثر ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں عرب و عجم کی چیدہ چیدہ ہستیوں پر اساسی طور پر پڑا تھا. آپ کے اس زمانہ کے بعد ایک اور زمانہ آنے والا ہے جس کو قرآن عظیم کی بشارت **يُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ** (التوبہ۹:۳۳) ظاہر فرماتی ہے کہ تمام عالم کے ادیان اور سلطنتی مسلک قرآنی ہدایت و مسلک کے مقابل مغلوب و منکوب ہو جائیں گے اور تمام دنیا اساسی طور صرف اسی یک سلطنتی کی حلقہ بگوش دل سے ہو جائے گی. میں اس زمانہ کو قرآن عظیم کے طلوع سے تعبیر کرتا ہوں.

مطلب یہ کہ سورۂ فلق میں رسول علیہ السلام اور ہر مبلغ قرآن عظیم کو امر ہوتا ہے کہ ان کو چاہیے کہ آفتاب قرآنی کی اس صبح صادق کے مالک اور خالق کی پناہ لینے کی درخواست کر کے دنیا کی تمام شرارتوں اور بالخاصہ مذکورہ بالا تین فتنوں سے اپنی حفاظت کا مادی سامان جو اس نے خود تیار کیا ہے مکمل کر لے.

سورہ الناس

تمام مخلوقات کے فتنوں، شرارتوں، خصومتوں میں یہ تینوں اول کی خصومتیں جن سے سورۂ فلق میں پناہ مانگی گئی ہے انفرادی قسم کی ہیں جن کا اثر مبلغ کی ذات اور اس کے جسم اور مادیات پر پڑتا ہے. مگر چوتھی شرارت اور خصومت (پروپگنڈا یا خناسیت) اجتماعی اور دولتی

(سیاسی) قسم کی شرارت ہے جس کا اثر پوری انسانیت بالخاصہ اس کے جسم سے گذر کر اس کے سینہ پر پہنچتا ہے اور دل کے فتح کر لینے کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے. اس لیے پروپگنڈہ کا فتنہ اور خناسی شرارت بہت قوی، بڑی دوررس، نہایت عمومی، از حد موثر اور برباد کرنے والا ہے.

یہی وجہ ہے کہ اس فتنۂ عظمیٰ سے پناہ ڈھونڈھنے کے لیے قرآن شریف کی ایک مستقل اور سب سے آخری سورت اور شہنشاہ عظیم کی تین زبردست عمومی اور اساسی صفتیں اور وہ بھی مخصوص جامعۂ اشرف المخلوقات انسان (معاشرہ) کے متعلق وقف فرمائی گئیں، یعنی سورۂ مبارک الناس اور صفات معظّمہ **رَبِّ النَّاسِ، مَلِكِ النَّاسِ، اِلٰهِ النَّاسِ**.

الغرض حق کی تبلیغ کے مقابل باطل کے پروپگنڈے اور خناسیت کی قوت دنیا میں سب سے زیادہ مہیب اور فاتح انسان اور عالم انسانی قدرت ہے جس سے عالم انسانی کے دل صحیح دولتی (سیاسی) مسلک سے متنفر کر کے اور ہٹا کر بدترین اور غلط مسلک کی طرف لگائے جا سکتے ہیں.

اس لیے اگر شاہی الٰہی کے مقابل پروپگنڈے کا حربہ یا شیطانی شرارت استعمال ہو تو اس کے علمبردار کو اول تو اس خناسی ہجوم کے مقابل بالمثل تبلیغ کا مکمل انتظام کرنا چاہیے، اور سب سے آخری موثر اور مکمل ترکیب یہ ہے کہ تبلیغ پر زور رکھنے کے ساتھ ساتھ مذکورہ بالا تینوں صفات عظیمہ کی پناہ میں چلے جانا چاہیے. علمبرداران شاہی الٰہی کی اس دوہری اور متین تدبیر سے مخاصمین شاہی الٰہی کی آخری اور موثر ترین تدبیر (خناسیت اور پروپگنڈے) کا کالا جادو بے اثر ہو کر رہ جائے گا.

تنبیہ

۱: آج مخاصمین شاہی الٰہی کا پروپگنڈا شباب پر ہے اور اس کے مقابل نہ شاہی

الٰہی کا وجود ہے، نہ اس کے علمبرداوں کا، نہ اس کے لیے تبلیغ کا ہی انتظام ہے، نہ پناہ لینے کا.
اس لیے قرآن عظیم ایک مذہبی کتاب بن کر رہ گیا ہے اور اس کی سیاسی حیثیت معدوم ہے.

۲ : خدا بادشاہ کی ان تینوں صفتوں رَبِّ النَّاسِ، مَلِكِ النَّاسِ، اِلٰهِ النَّاس میں انسانیت کے لیے خدا کے مطاعِ مطلق ہونے اور دوسروں کے مطاع نہ ہونے کے فلسفہ کی طرف بھی اشارہ فرمادیا گیا ہے. وہ یہ ہے کہ ہر کلیہ یا عالم اور نوع کا بادشاہ اس کا مالک ہی ہوا کرتا ہے. پھر ہر عالم کا مطاع مطلق اور فرماندہِ بلاقید وشرط اس نوع کا بادشاہ ہی ہوسکتا ہے.

صفت رَبِّ النَّاس سے معلوم ہوا کہ عالم انسانی کا مالک خدا ہے کیونکہ مالک کے لیے فوقیت لازم ہے اور انسانیت پر خدا کے سوا کسی کو فوقیت حاصل نہیں، اس لیے وہی مالک انسانیت ہے. اور جب وہ انسانیت کا مالک ہے تو وہ اس کا بادشاہ بھی وہی ہے، اور جب بادشاہ ہے تو وہ انسانیت کا مطاع مطلق اور الٰہ بھی وہی ہے. اس لیے انسان جیسا اشرف واعلیٰ کلیہ خدا مالک وملک کے سوا کسی کے سامنے اپنا سب سے اونچا سر نہیں جھکا سکتا اور بے قید وشرط رعیت نہیں بن سکتا.

الحاصل خدا کے سوا عالم انسانی کا نہ کوئی مالک ہے، نہ بادشاہ، نہ معبود اور مولا.

توحید تشریعی کے عناصر اربعہ

قرآن حکیم ان میں سے ہر عنصر کے اثبات کے لیے اس کثرت کے ساتھ اور مختلف اسالیب پر زور دیتا ہے جس سے ہر سمجھدار انسان ماننے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ قرآن مبین کا اساسی مضمون اور موضوع صرف یہی ہے کہ وہ بشریت مدنیت وسعادت ڈھونڈنے والے کے سامنے توحید تشریعی کی ضرورت کے ساتھ اصلی اور فطری مرکز تشریع کو پیش کرے.

بشریت پر تشریع کا فطری مرکز کون ہے؟ اس سوال کا جواب قرآن شریف کی ہر سطر اور اس حوالہ سے اس آوارہ کی ہر تحریر میں موجود ہے کہ وہ صرف وصرف اعلیٰ حضرت

واقدس اللہ جل مجدہ کی یگانہ ذات پاک ہے.

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اعلیٰ حضرت الٰہی جل مجدہ کا طرز حکومت کیا ہے؟ شخصی ہے، دستوری یا جمہوری ہے؟ یا اشتراکی قومی ہے، یا مسلکی، یا تمام اختراعی اقسام کے علاوہ ہے.

اس سوال کا جواب آئندہ وحدۃ الملوکیت کے ذیل عرض ہوگا. انشاء اللہ تعالیٰ

والسلام مع الاکرام.

وتمت كلمة ربك صدقا وعدلا لا مبدل لكلمته وهو السميع العليم

۷ اسد ۱۳۲۰ھ ش/ ۳ رجب ۱۳۶۰ھ (۲۸ جولائی ۱۹۴۱)

پہلا قدم

فلسفہ انقلاب کی پیشکش کے بعد اگلا قدم امت کو اس انقلاب کی دعوت عام دینا تھا مولانا منصور انصاری نے یہ دعوت فلسفیانہ اسلوب کے بجائے راست دعوتی زبان میں دی تھی.

انقلاب زندہ باد!

عالم اسلامی کے حضور میں

برادرانِ مسلکی .السلام علیکم ورحمۃ اللہ

بیداری .اور بیداری کے بعد جہاد انقلاب مبارک

مگر مسلمان اپنے انقلاب کی ناقابلِ تبدیل اساس کو اس وقت تک ہرگز ہرگز نہ پہنچے گا جب تک یہ نہ سمجھ لے کہ

مسلکِ سورۂ عظیمہ فاتحہ آپ کے انقلاب اصلاح کارانہ کی وہ مقدس اساس ہے جسے آپ کے لئے محسن عالم حضرت محمد رسول اللہ نے تجویز اور اعلیٰ حضرت ملک الناس جل مجدہ نے منظور فرمایا ہے.

یہی انقلاب صحیح کی وہ تجربہ شدہ عدیم المثال فطری اساس ہے جس پر حضور انورؐ نے اول وحی کے بعد سیاسی انقلاب برپا فرما کر عرب جاہلیت کو آسمان ہدایتِ عالم کا درخشاں ستارہ بنا دیا تھا فقط

مبلغ حکومتِ الٰہی

منصور (عفاعنہ) انصاری

اصول اجتماعیت

امامت امت کی دستور سازی کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس تنظیم کے وہ افراد جو اس دستور کے ماننے والے ہوں وہ خود کس کردار کے حامل ہوں، یا وہ کیا خصوصی اوصاف ہوں جو انہیں دیگر تنظیموں کے ممبروں سے ممتاز کر سکیں. بنیادی بات ہے کہ مومن کا جذبۂ ایمانی اور جذبۂ واطاعت الٰہی و طاعت رسول ہی مکمل ایمان کی دلیل اور ضمانت ہے. مطلوب رضائے الٰہی ہے. اسی بنیاد پر مطلوبہ مقاصد حاصل ہو سکتے ہیں.

جذبۂ ایمانی اور جذبہ واطاعت الٰہی و اطاعت رسول اللہ کا اولین مظاہرہ نماز میں ہوتا ہے.

نماز اسلام کے بنیادی ارکان میں پہلا اور اہم رکن ہے جو ہر عاقل، بالغ مرد، عورت پر ہر حالت میں وقت کی پابندی کے ساتھ دن رات میں پانچ مرتبہ فرض ہے. کیا اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ ہم دن میں پانچ مرتبہ اللہ کے دربار میں حاضر ہو کر نماز کے ظاہری ارکان کو الٹا سیدھا ادا کر کے اس فرض سے سبکدوش ہو جائیں اور اپنے کو مومن کہلانے پر فخر محسوس کرنے لگیں، یا یہ ایک تربیت ہے جو مومن کو نظم و ضبط، اتحاد و اتفاق، یک جہتی و یک رنگی اور اجتماعیت کا درس دیتی ہے اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو پانچ وقت مسجد میں جمع کر کے انہیں ایک قائد کی قیادت میں چلنے کا حکم دیتا ہے. مسلمانوں کا پانچ مرتبہ مسجد میں ایک ہی مقصد کے لئے جمع ہونا اور ایک قائد کی قیادت میں اس کے اشاروں کے تابع ہونا مصلحت سے خالی نہیں ہے. انہی مصلحتوں سے پردہ اٹھانے کے لئے مولانا منصور انصاری نے اس فکر کی اساسی کتاب ''اساس انقلاب یا مراقبۂ نماز'' تحریر کی تھی.

یہ کتاب ذی الحجہ ۱۳۵۶ (فروری ۱۹۳۸) میں مکمل ہوئی. کتاب انتہائی جذباتی، ناصحانہ جوش و جذبۂ ایمانی سے بھری ہوئی ہے. اس کے اندرونی سرورق کی عبارت مولانا منصور انصاری کی اسلامی تڑپ کو ظاہر کرتی ہے جسے مقصد حیات بنا کر مسلمانوں میں اور تمام عالم میں برپا کرنے کے لئے زندگی وقف کر دی تھی.

کتاب میں نماز کی روحانی اور جسمانی کیفیات، نمازی (عبد) اور اللہ (معبود) کے تعلق پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ جب نماز کے دوران ایک مسلمان پر وہ کیفیت طاری ہوگی جو اللہ کو بندہ سے مطلوب ہے تو اس کے اندرون میں ایک انقلاب پیدا ہوگا اور اللہ کے اطاعت گذار بندوں کا یہ انفرادی انقلاب اس انقلاب کا پیش خیمہ ہوگا جو اجتماعی طور پر مقصود ہے اور جس کا برپا ہونا ایک صالح معاشرہ کے لئے ضروری ہے. صالح معاشرہ کی شرط عبودیت پر ہے اور عبودیت کی ظاہری شرط اس کے سوا کچھ نہیں کہ نماز کو اس کے حقوق کے ساتھ ادا کیا جائے.

مولانا منصور انصاری نے دلائل وشواہد کی روشنی میں اس انقلاب کے بانی حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی راہ کو انقلاب کی کامیابی کا ضامن اور ان کے راستہ سے ہٹ جانے کو سراسر ناکامی و نامرادی ثابت کیا ہے. آغاز کتاب میں عالم انسانی کو مخاطب کرتے ہوئے حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مسلکی انقلاب کا مقدمہ پیش کیا ہے.

مسلکی انقلاب

انسانی بھائیو اور مربی الشان بہنو

دنیا میں موجودہ عالم کی تباہی پر محیط عام بحران، موجودہ قوم پرستانہ تمدن کی ناکامی کی بلند آوازیں ہیں اور فرزانۂ عالم انسانی کو ایک امن پرور بین الملی تمدن کو تلاش کر کے

قبول کر لینے کی دعوتیں دی جارہی ہیں. آپ انہیں ضرور سن کے قبول فرمائیں کہ اب ان کو سننے اور قبول کئے بغیر چارہ نہیں.

اسلام انسان کے پاک روحانی انقلاب کے زیرِ سایہ بین الملل انقلاب کی وہ فطری اسکیم ہے جسے حضرت خاتم الانبیاء نے اس ضرورت کے لئے نہایت ہی خواہانہ اور نہایت لاغرضانہ انداز پر جاری فرمایا تھا.

آپ اسلام کے نظام پاک کو اس نازک ترین وقت میں غرض زدہ، گم کردہ راہ، خودساختہ مدعیان اسلام کے اندر رواج پذیر اور مخالفین اسلام قومی، وطنی وغرباء، امراء کے خانہ ویران ہنگاموں کی عینک سے مطلق ملاحظہ نہ فرمائیں، بلکہ آپ اس کو میری روح القرآن تالیفی معروضات کے ذریعہ سے سمجھ کر اور اپنے تعصب سے پاک عشق، تحقیق اور تاریک خیالی سے خالی ملکۂ ضرورت شناسی اور سیاہ اغراض سے مبرا جذبۂ قبولِ حق سے کام لے کر اس سے اپنی نجات کی مہم میں خاص امداد لیں اور اس امداد کی برکت سے موجودہ زمانہ کی خوفناک تباہی سے نکل کر سعادتِ دارین حاصل کریں. فقط

آوارۂ وطن، خیر اندیش

مؤلف عفاعنہ

صوتِ اذاں اٹھاؤ ذرا شہر ذہن میں

مولانا منصور انصاری کی یہ کتاب اسلامی سیاسی نظریہ کی عکاسی بھی کرتی ہے اور اسلام کے بنیادی مقاصد تک پہنچنے کی تلقین بھی. اس سے ان کا مقصد مسلمانوں میں نماز کے ذریعہ رضائے الٰہی کے اصول پر مبنی ایک عظیم انقلاب برپا کرنا تھا.

جب یہ کتاب دنیا کے سامنے آئی تو اس وقت ہندستان کے حالات انقلاب کے متقاضی تھے مگر اس انقلاب کی سمت و منزل کا واضح تعین نہیں تھا. سیاستِ وقت کا

مقصود فقط انگریز حکومت کا خاتمہ اور اس غیر ملکی کے بغیر خود اپنی حکومت کا قیام تھا، لیکن آئندہ کے جس نظام کا تصور ذہنوں میں تھا وہ بالکل وہی تھا جو انگریزوں نے اس ملک میں نافذ کر رکھا تو آزادی کا کوئی آزاد ہدف نہیں تھا.

اس لئے مولانا محمد میاں منصور انصاری نے اپنا مخاطب ملک کے اولوالعزم جوانوں کو بنایا تا کہ جب ملک کی فضا انقلاب آزادی کے لئے سازگار ہو جائے تو وہ فقط انگریزوں کی غلامی سے جزوی اور خیالی آزادی نہ ہو جس کے ظاہر میں حکمراں اوران کے نام انگریزوں کے بجائے دیسی ہوں اور سیاسی ہیکل وہی رہے جس کے زور پر انگریز ہندستان کو غلام بنائے ہوئے تھے، بلکہ مقصد یہ تھا کہ آزادی جس قدر سیاسی ہو اسی قدر اقتصادی اور دراصل فکری آزادی، بلکہ حقیقتاً مکمل انسانی آزادی ہو. چنانچہ مولانا محمد میاں منصور انصاری کا نقطۂ نظر تھا کہ ایک ایسا انقلاب آنا چاہیے جس میں کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا غلام نہ رہے بلکہ فکری، ذہنی، روحانی وجسمانی طور پر صرف اس ہستی کا غلام ہو جو اس کا مالک وخالق ہے.

اپنے رب کی عبادت اور اس سے انسانوں کے راست تعلق کا آسان اور سہل اور واحد طریقہ نماز ہے. لہٰذا یہی عبادت انسان کے اندر تبدیلی پیدا کرنے کا مؤثر ذریعہ بن سکتی ہے کیونکہ نماز کے ذریعہ انسانوں میں جو روحانی انقلاب رونما ہوگا وہی حقیقی اور فطری انقلاب ہوگا. چنانچہ اس راہ کی نشان دہی کرتے ہوئے مولانا منصور انصاری نے ملک کے جوانوں کو راست مخاطب کیا.

جوانوں سے خطاب

ہندستان کے اولوالعزم، سرفروش نئے پرانے نوجوانوں.

اگر خدانخواستہ تمہارے قائد لاتعلق ہوں تو تم خود منظم ہو کر آگے بڑھو اور ان کے بے کار، کمزور، مرتعش ہاتھوں سے اقامت مسلک حکومت الٰہی کا تبلیغی جھنڈا اپنے مضبوط

ہاتھوں میں لے لواور اس کو تمام دولتی (سیاسی)، غیر دولتی، غیر فطری مسلکوں کے مقابل کھڑا کر کے اپنے نظام وحدت، نظام تبلیغ اور تبلیغ میں عدیم المثال مسلکی استقامت کے ساتھ دنیا سے فائق اپنی قوت برداشت کے زور سے اپنے مسلک کی ناقابل مقابلہ صداقت اور پاکیزگی کو آفتاب سے بھی زیادہ روشن کردو یعنی آپ کا جہاد اکبر، یعنی تبلیغ خالص بھی، مؤدبانہ و دردمندانہ اور سیاہ اغراض سے بالکل پاک ہونے کے ساتھ اس درجہ قوی اور عالمگیر بھی ہونا چاہیئے جس کے ذریعہ سے آپ قرآن حکیم کی حکمت حکومتی اور رسول کریمؐ کے فلسفۂ دولتی کا سکہ امت وسط سے گذار کر مشرق و مغرب کے حق شناس کے قلوب تک پر بٹھادیں.

اعلیٰ حضرت واقدس ملک الناس اللہ جل مجدہ آپ کو توفیق سعادت اور کامرانی کا ذوق بخشے. آمین ثم آمین.

فاقیمو الصلوٰة واتولزّکوٰةواعتصموا باللّٰه هو موٰلکم فنعم المولی ونعم النصیر

تمت باالخیر

عرض گذار، آوارۂ وطن

ابوالحامد محمد بن عبداللہ منصورالانصاری عفاعنہ

مبلغ حکومت شاہی اعلیٰ حضرت واقدس الٰہی جل مجدہ

۷ا ذی الحجہ ۱۳۵۶ھ (۱۸ فروری ۱۹۳۸)

مولانا منصورانصاری کی کتاب ''اعلان تبعیت یا تفسیر مجمل سورۂ فاتحہ عظیمہ'' دری/ فارسی زبان میں کابل، افغانستان، سے علامہ منصور انصاری فاؤنڈیشن نے شائع کردی ہے. اردو میں اس کا ترجمہ نہیں ہوا ہے.

سوچ کے سائے

مولانا محمد میاں ہندستان کی مکمل آزادی کی تحریک برپا کرنے کے لئے بے یارو مددگار ہندستان سے ہجرت کرکے یاغستان وافغانستان گئے تھے. پھر کبھی وہ حالات ہی نہ بنے کہ ہندستان واپسی کی راہ ہموار ہوتی. اس غریب الوطنی میں بھی وہ نہ ملک سے غافل ہوئے نہ ملت سے نہ ملی اداروں سے.

دارالعلوم دیو بند ان کی مادرِ علمی تھی اور اسی درس گاہ نے انہیں ملت و وطن کی آزادی کی راہ پر لگایا تھا. اس درس گاہ سے ان کو دوگونہ بلکہ سہ گونہ تعلق تھا. اس کے بانی ان کے نانا مولانا محمد قاسم نانوتوی تھے. یہ ادارہ قائم ہوا تھا ۱۸۵۷ کے بعد تحریک حریت کے نئے قائدین اور مجاہدین کی تربیت کے لئے. اور مولانا محمد میاں ان قائدین اور مجاہدین کی صف اول میں تھے اور انہیں شیخ الہند مولانا محمود الحسن نے اس مقصد کے لئے افغانستان اور وسطی ایشیا کا محاذ دیا تھا.

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، مسلمانان ہند کا وہ علمی، ادبی، وتہذیبی سرمایہ ہے جس سے مسلمانان ہند کو جذباتی وابستگی رہی ہے. سر سید کی ایما پر اس ادارہ میں دینی امور کے اولین سربراہ مولانا محمد میاں کے والد شیخ الاسلام مولانا عبداللہ انصاری انبہٹوی تھے. ان کے بعد مولانا محمد میاں کے برادر خورد مولانا احمد میاں انصاری اس منصب پر فائز رہے. مولانا محمد میاں کے قریبی رشتہ دار اور بہنوئی مولانا پروفیسر رشید احمد سالم انصاری علی گڑھ کالج میں فارسی کے پروفیسر تھے اور شیخ الہند کی پکار پر جامعہ ملیہ اسلامیہ سے متعلق ہو گئے تھے.

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی کوکھ سے جنم لینے والے جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد ۲۹

اکتوبر ۱۹۲۰ کو علی گڑھ کالج کی جامع مسجد میں مولانا محمد میاں انصاری کے استاد اور دارالعلوم دیوبند کے استاذ حدیث شیخ الہند مولانا محمود الحسن نے رکھی تھی تاکہ علوم دینی اور مادی علوم کے بیچ پڑ جانے والی غیر اسلامی دراڑ کو پاٹا جائے. روحانی اعتبار سے اس دن مسلمانوں کے دو تعلیمی اداروں کے ربط خاص سے ان کا تیسرا علمی ادارہ وجود میں آیا تھا. پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

ان تینوں اداروں سے مولانا محمد میاں انصاری کی قلبی وابستگی تھی. وہ ان اداروں کے شب و روز سے واقف رہتے تھے، ان اداروں کے واسطہ سے ملت اسلامیہ ہند کی رہنمائی بھی کرتے تھے اور ان تینوں اداروں کے ذمہ داروں سے سرپرستانہ و مربیانہ سلوک بھی رکھتے تھے. ان تینوں اداروں کو ملت اسلامیہ ہندیہ کا سرمایہ سمجھتے تھے اور ان کی بقا اور ارتقا کی خاطر ہر موقعہ پر ذمہ داروں کو مشورے دیتے تھے اور جہاں ممکن ہو ان اداروں کی مدد کرتے تھے.

انقلاب کا خواب

اپنے تاسیسی فکر میں دارالعلوم دیوبند ایک انقلابی ادارہ تھا. اس کا مقصد انقلابی افراد تیار کرنا تھا جن کے لئے پہلا نشانہ انگریز تسلط سے برصغیر جنوبی ایشیا کی سیاسی آزادی کو قرار دیا گیا تھا قوم ساز اداروں کے نشانے حالات کے مطابق بدلتے رہتے ہیں مگر اس کی شرطیں ہیں. ادارہ وہ شرطیں پوری کرتا رہے تو ہر دور کے لئے نئے نشانے مقرر کرتا رہتا ہے. مگر جب ادارہ بجائے خود مقصد بن جائے تو انقلاب کا تصور مٹ جاتا ہے.

دارالعلوم دیوبند نے اپنی پہلی نسل کو پہلے انقلاب کا نشانہ دیا اور اس کے لئے چند افراد کو تیار کر دیا. نشانہ پر تیر نہ لگا. پہلی مہم خود تو نتیجہ نہیں دے سکی لیکن اس نے اس خطہ کو اپنے طے کردہ نشانے کی طرف قوت سے متوجہ کر دیا. افق پر گاندھی جی کا سیاسی ظہور اور ریشمی رومال تحریک کی شاخ تحریک خلافت اسی تسلسل کا اگلا مرحلہ تھیں جنہیں رولٹ کمیٹی کا نتیجہ کہنا مناسب ہے. یوں ملک تو ایک سمت میں چلنے لگا مگر دارالعلوم دیوبند نے اجتماعی انقلاب کے اساسی تصور کی جگہ انفرادی اصلاح کو اپنا آخری نشانہ بنا لیا.

دارالعلوم دیوبند کی پہلی انقلابی نسل کی باقیات میں مولانا محمد میاں منصور انصاری اس ادارہ کے امتیازی انقلابی تشخص کا احیا چاہتے تھے. مولانا انصاریؒ اور دارالعلوم دیوبند کے جواں سال مہتمم مولانا قاری محمد طیبؒ کے مابین مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے واسطہ سے قرابت قریبہ تھی. مولانا محمد میاں انصاری ان کے نواسے تھے اور مولانا محمد طیب ان کے پوتے تھے. مولانا محمد طیب خطوط میں مولانا محمد میاں سے دارالعلوم دیوبند کے معاملات میں مشورے لیتے رہتے تھے. لیکن زیادہ اہم بات یہ تھی کہ مولانا محمد طیبؒ دارالعلوم دیوبند کے

مہتمم کی حیثیت سے جماعت کے امیر بھی تھے اور اس اعتبار سے ان کی شخصیت سازی ملی استحکام کی ایک ضرورت تھی. یہ ضرورت ایک مہم کے ذریعہ پوری کی گئی اور افغانستان میں دارالعلوم دیوبند کے سربراہ کی سرکاری شان سے پذیرائی کی گئی.

اس تاریخی سفر کے دوران مولانا محمد طیبؒ اور مولانا حامد الانصاری غازیؒ سے محمد ظاہر شاہ، صدر اعظم سردار محمد ہاشم خاں، وزیر تعلیمات عامہ سردار محمد نعیم خاں، وزیر دربار سردار احمد شاہ خاں، وزیر جنگ سردار شاہ محمود خاں، وزیر خارجہ سردار علی محمد خاں کے علاوہ فضلاء دارالعلوم دیوبند کی تفصیلی ملاقاتیں ہوئیں جن میں افغانستان اور ہندستان کے حالات پر بہت کھل کر گفتگو ہوئی جس کا کچھ تذکرہ قاری مولانا محمد طیبؒ نے فارسی زبان میں سفرنامہ افغانستان میں بھی کیا. بعد میں اس کی تلخیص اردو زبان میں بھی شائع کی گئی.

مولانا قاری محمد طیبؒ کے سفر افغانستان میں مولانا محمد میاںؒ کی اہلیہ حفصہ خاتون، صاحبزادہ مولانا حامد الانصاری غازی، صاحبزادی قدسیہ خاتون، نئی بہو ہاجرہ نازلی، خالہ زاد بھائی پیرجی محمد عمر اور پوتے عابداللہ غازی بھی شریک تھے. عابداللہ غازی صاحب کی عمر اس وقت صرف پانچ سال تھی.

قاری مولانا محمد طیبؒ نے اپنے سفرنامہ میں اعتراف کیا ہے کہ افغانستان میں ان کی سرکاری ضیافت مولانا محمد میاںؒ کی ذاتی کوششوں کا نتیجہ تھا. وزیر حکومت افغانستان آقائی تاج محمد کے اس خط سے بھی یہی پتا چلتا ہے جو انہوں نے مولانا محمد میاںؒ کے نام ۱۹ اگست ۱۹۳۹ کو تحریر کیا تھا. اس میں تاج محمد نے لکھا تھا کہ

> مولانا قاری طیبؒ اور مولانا حامد الانصاری غازی کے سفر کی تیاریوں کی تکمیل ہوگئی ہے. لہٰذا اب آپ انہیں بلوالیں.

مولانا محمد میاںؒ نے مولانا محمد طیبؒ اور مولانا غازی کو افغانستان کی دعوت اس مقصد سے دی تھی کہ جدید تقاضوں کے پیش نظر علوم دینیہ کو عملی طور پر نافذ کرنے کے لئے

مولانا منصور انصاری کے ۳۰ سالہ تجربات سے استفادہ کیا جائے اور روحانی اور مادی علوم کی تفریق کو ختم کیا جا سکے. ان تینوں حضرات نے ایک تازہ کار نظام تعلیم مرتب کیا تھا مگر ارباب مدرسہ کی بارگاہ میں اس کی پذیرائی نہیں ہوئی.

بقول ڈاکٹر عابداللہ غازی:

> اس سفر کا ایک اہم کام مولانا انصاری کے افکار سے استفادہ تھا. وہ مدارس کی جدید کاری چاہتے تھے اور ان میں مادی علوم کی تدریس کے داعی تھے. ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس وقت بھی جدید کاری کے تصور کی اسی قدر یا اس سے بھی زیادہ مخالفت ہوئی اور شاید یہ خیالات قبول شوریٰ نہ ہو سکے.

بہر حال افغانستان کے اس سفر کے باعث دارالعلوم دیو بند کا بین الاقوامی تعارف ہوا اور محمد ظاہر شاہ نے سرکاری خزانہ سے دارالعلوم دیو بند کو ایک خطیر رقم بھی بھیجی جس سے مغربی سمت میں دار جدید ہوسٹل اور ظاہر شاہ کی یادگار میں باب الظاہر بنوایا گیا.

حقیقت یہ ہے کہ مولانا محمد میاں منصور انصاریؒ کو ۴۲ سالہ مولانا قاری محمد طیبؒ کی متحرک شخصیت میں اس انقلابی فکر کی ایک جھلک دکھائی دی تھی جس کے لئے دارالعلوم قایم ہوا تھا. چنانچہ مولانا انصاری نے ان کی شخصیت سازی کے خیال ہی سے انہیں افغانستان بلایا تھا.

شخصیت سازی

تاریخ عالم میں جن لوگوں نے عظمت کی مشعلیں روشن کی ہیں بے شک ان شخصیتوں میں ذاتی جوہر ہونا لازم ہے لیکن محض ذاتی جوہر بے قیمت رہتا ہے جب تک کسی ذات شناس جوہری کی نگاہ انتخاب میں نہ آئے. شاعر انسانوں کی آرزو کرتے ہیں اور مفکر شخصیتوں سے انسان سازی کا کام کرتا ہے.

امام ابوحنیفہ(۶۹۹-۷۶۷) کی جوہر شناسی نے دنیا کو امام ابویوسف یعقوب انصاری (۷۳۸-۷۹۸)، امام محمد الشیبانی (۷۴۹-۸۰۵)، محدث امام عبداللہ ابن مبارک (۷۲۶-۷۹۷)، محدث امام وکیع ابن الجرح (۷۴۵-۸۱۲)، امام ظفرابن ہذیل (م:۷۷۵) جیسے اساطین علم وحکمت عطا کئے. امام الحرمین شیخ جوینی (۱۰۲۸-۱۰۸۵) نے دنیائے علم کو امام غزالی (۱۰۵۸-۱۱۱۱) جیسا مجدد اور مفکر دیا. شیخ قطب الدین بختیار کاکی (۱۱۷۳-۱۲۳۵) کی نگاہ نے سلاطین ہند شمس الدین التتمش (ح:۱۲۱۱-۱۲۳۶) اورغیاث الدین بلبن (۱۲۰۰-۱۲۸۷) کوعزیمت کا وہ جوہر بخشا کہ چنگیز خان جیسا خون آشام ان بادشاہوں کی ہیبت سے کانپتا تھا. سلطان سیف الدین قطز (۱۲۲۱-۱۲۶۰) اور سلطان رکن الدین بیبرس (۱۲۲۳-۱۲۷۷) کو تاریخی مقام شیخ العز عبدالسلام (۱۱۸۱-۱۲۶۲) کی توجہ سے حاصل ہوا.مخدوم علاء الدین انصاری برناوی (تیرھویں صدی) نے سلطان علاء الدین خلجی (۱۲۶۶-۱۳۱۶) کوجنوبی ایشیا کے سیاسی اتحاد پر راغب کیا. سلطنت عثمانیہ کے فکری بانی ارطغرل غازی (م:۱۲۸۰) کی شخصیت شیخ ابن العربی (۱۱۶۵-۱۲۴۰) نے بنائی. سلطنت عثمانیہ کے بانی عثمان خان غازی (۱۲۵۸-۱۳۲۳) کوشیخ ادہ بالی (۱۲۰۶-۱۳۲۶) کی سرپرستی حاصل ہوئی تو ایک عظیم سلطنت کی داغ بیل پڑی. سلطان محمد ثانی (۱۴۳۲-۱۴۸۱) کے فکری تعمیر شیخ الاسلام آق شمس الدین (۱۳۸۹-۱۴۵۹) نے کی تو فاتح قسطنطنیہ کو بنادیا. ابوالکلام آزاد (۱۸۸۸-۱۹۵۸) کوشیخ الہند مولانا محمود الحسن (۱۸۵۱-۱۹۲۰) نے امام الہند بنایا، ان کی سیاسی بصیرت کوعبدالرزاق ملیح آبادی (۱۸۷۵-۱۹۵۹) نے روشن کیا اوران کے علمی مقام کی پہچان سید سلیمان ندوی (۱۸۸۴-۱۹۵۳) کی توجہات کا ثمرہ تھی. دائرہ اسلام کے باہر بھی شاہ یونان سکندر مقدونی (۳۵۶-۳۲۳ق م) کوارسطو (۳۸۴-۳۲۲ق م) اورمگدھ کے راجہ چندرگپت موریہ (۳۴۰-۲۹۷ق م) کوچانکیہ (۳۷۵-۲۸۳ق م) کی سرپرستی نہ ملتی تو وہ دونوں دنیا کے

دیگر بے شمار بادشاہوں کی طرح گمنام ہوتے.

لہٰذا عام انسانی سطح پر عظیم انسانوں کی شخصیت سازی کے پیچھے ہمیشہ دو ایک سنجیدہ اور مخلص افراد کی فکری قوت اور عملی حکمت نظر آتی ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ انسانی سطح پر شخصیت سازی ایک مستقل عمرانی عمل ہے.

مگر ستم ظریفی ہے کہ جو لوگ کسی کی شخصیت بنا کر تاریخ کے حوالہ کر دیتے ہیں وہ خود اپنی بنائی ہوئی شخصیتوں سے زیادہ عظیم ہوتے ہیں اور اکثر گم نام رہ جاتے ہیں. اس کی وجہ کبھی کبھی وہی افراد ہوتے ہیں جن کی شخصیت کی تعمیر وہ گمنام لوگ کر دیتے ہیں.

مولانا قاری محمد طیبؒ سے پہلے چھ بزرگ دارالعلوم دیوبند کی مسند اہتمام پر بیٹھے تھے. علی الترتیب: مولانا محمد سید عابدؒ، مولانا رفیع الدینؒ دیوبندی، مولانا فضل حقؒ، شیخ منیر احمد نانوتویؒ، مولانا حافظ محمد احمدؒ اور مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ. ان میں کسی بزرگ کا عام تعارف نہیں ہے.

اس دورہ کے بعد مولانا محمد طیبؒ نے برما، حجاز، انگلستان، مصر، پاکستان، بنگلہ دیش، امریکہ، جنوبی افریقہ، رے یونین، مداگاسکر، ماریشس وغیرہ کے سفر کئے اور ان کے علمی وقار کے پیش نظر بعض مسلم ملکوں کے سربراہوں نے بھی ان سے ملاقاتیں کیں. تاہم افغانستان والی صورت ہر ملک میں نہیں تھی. البتہ جس ملک اور شہر میں بھی وہ گئے وہاں کے خواص اور علما نے ان سے ملاقات کو اپنا شرف جانا، اور ان کے علمی وقار نے عام لوگوں کو متاثر کیا اور ان کی اصلاحی کوششوں کو ثمر آور بنایا.

اس باب میں مولانا حامد الانصاری غازیؒ نے حکیم الاسلام سے اصلاح امت کا ایک بڑا کام لیا تھا. مولانا غازی ۱۹۴۵ میں پہلی بار بمبئی آئے تو وہاں لوگوں کی دینی حالت میں اصلاح کی شدید ضرورت محسوس کی اور اس عظیم ذمہ داری کے لئے انہوں نے مولانا محمد طیبؒ کا انتخاب کیا. پھر ۱۹۴۹ میں وہ مستقل قیام کے لئے بمبئی آئے اور اس کام کو ایک مستقل

مہم بنایا۔اول انہوں نے وہاں اپنا حلقہ اثر قائم کیا اور پھر مولانا قاری محمد طیبؒ کو بمبئی آنے کی دعوت دی۔اس موقعہ پر گجراتی،میمن اور کوکنی برادریوں کے کئی ممتاز افراد مولانا محمد طیبؒ سے متاثر ہوئے جن میں جان محمد سیٹھ لوکھنڈ والا،صوفی عبدالرحمان،عبدالشکور کیلے والے،احمد بھائی ریشم والا،اسماعیل منصوری،محمد حسین پالوبہ،احمد غریب،محمد صدیق میمنی،محمد حسین توفیق،احمد بھائی پٹنی،عزیزالحق سلہٹی کے نام نمایاں ہیں۔اس کے بعد مولانا حامدالانصاری غازی نے قاری مولانا محمد طیبؒ کو بار بار اس شہر میں دعوت سفر دینے اور ان کی متواتر اصلاحی تقاریر اور مجلسوں کا انتظام کیا جس کے نتیجہ میں ایک طرف تبلیغی جماعت کی سرگرمیوں کا میدان ہموار ہوا اور ساتھ ہی بمبئی کے مسلمانوں کے لئے اسلام کی سیدھی راہ روشن ہوئی۔

حالات کی تبدیلی کے نتیجہ میں بمبئی میں اور بھی بہت سے علمائے دین آنے لگے تھے اور اس مہم کے تحت اصلاحی مساعی کا حصہ بنے۔ان سب اللہ والوں میں مولانا قاری محمد طیبؒ کا خصوصی امتیاز قائم کرنے کے لئے مولانا غازی نے انہیں حکیم الاسلام کا عوامی لقب دیا جو مولانا محمد طیبؒ کی تقاریر اور مواعظ کے دیواری پوسٹروں اور اخباری اشتہارات، بیانات اور خبروں میں مستقل استعمال کیا جاتا تھا۔عہد رواں میں مولانا قاری محمد طیبؒ اس اعزاز میں بھی تنہا اور منفرد ہیں۔اسلامی تاریخ میں حکیم الاسلام کے لقب سے متصف وہ پہلے شخص نہیں ہیں لیکن برصغیر جنوبیشیا میں ان کے سوا کسی اور کو حکیم الاسلام کے لقب سے یاد نہیں کیا گیا۔

دردعیاں

سرسید احمد خاں نے ملت اسلامیہ ہند کی دنیاوی سربلندی کے لئے مدرسۃ العلوم مسلمانان کی بناڈالی تھی جس نے محمڈن اینگلواورینٹل کالج کی شکل اختیار کرلی. بعد میں یہی ادارہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نام سے جانا گیا.اس کی تفصیلات سے قطع نظر بتانا یہ مقصود ہے کہ مولانا محمد میاں منصور انصاریؒ کے والد شیخ الاسلام مولانا عبداللہ انصاری انبہٹویؒ اس ادارہ کے پہلے ڈین اور اول ناظم دینیات تھے اوراس وجہ سے مولانا منصور انصاری کو اس ادارہ سے تعلق خاطر تھا اور وہ اس ادارہ کوملّت اسلامیہ ہند کے وقار وعزّت کا محافظ سمجھتے تھے. یونیورسٹی کے حالات ناگفتہ بہ ہوئے اورنوبت یہاں تک پہنچی کہ نبیرہ سرسیّد سرراس مسعودوائس چانسلر کے عہدہ سے سبکدوش ہوگئے.مولانا انصاری کو اس خبر سے شدید قلق ہوجس کے اظہار میں انہوں نے ۴صفر۱۳۵۳(۱۹مئی۱۹۳۴) کوسرراس مسعودکوایک خط تحریرکیااور یونیورسٹی سے اپنا تعلق اوراس سے سرراس مسعود کی علیٰحدگی پرافسوس کااظہارکیا.

سرراس مسعود کے نام خط

برادرمحترم السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

آپ کے استعفیٰ سے دل حزیں میں خاص دردمحسوس کررہاہوں.آپ کی یونیورسٹی سے علیٰحدگی اس مسلم عصری تعلیم کے مرکز کے لئے فنا کا سامان ہے.

جن نظروں نے آپ سے پہلے کی حالت دیکھی ہے وہ آپ سے بعد آنے والی حالت کوبھی دیکھ رہی ہیں.

مسلم یونیورسٹی مسلمانوں کی امانت اور آپ کے دادا جان کی یادگار ہے.

میری عاجزانہ درخواست ہے کہ آپ اپنی خدمات کو مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کا ضامن دیکھتے ہوئے اپنا سب کچھ اس کے بقا پر قربان فرما دیں گے اور اپنی علیحدگی کی سعی کو چھوڑ کر اپنی اسلامی حمیت وایثار کا ثبوت دیں گے.

میں پھر بیمار ہوں میرے لئے دعائے صحت فرمایئے۔

فقط والسلام

آوارۂ ہند منصور انصاری

۴ صفر ۱۳۵۳ھ (۱۹ مئی ۱۹۳۴)

باب/ دیار تمنا

مسائل جہاں

دارالعلوم دیوبند کے ایک فارغ التحصیل نے جب مکہ و مدینہ، سواحل مغربی ہند، جہلم و چناب کے کناروں، یاغستان سوات و باجوڑ و چترال، کوہستان افغانیہ، گیاہستان ترکانیہ، دشت قفقازیہ، ازبکستان، آذربائیجان، ترکمانستان، برفزار روس، برکو چک اناطولیہ میں انقرہ، سمرنا کے علاوہ استنبول کے سفر پے بہ پے کئے اور کھلی آنکھوں اس امت کا حال زار دیکھا جو حادثاتی طور پر علم وشعور کی بلندیوں سے گری اور بے علمی و بے نگہی کی تاریکیوں میں خود کو کھو بیٹھی تو ملی وجود کی بازیافت کے لئے اس مجاہد مہاجر نے علم کے دروازہ پر دستک دی. وہاں ابھی آگ بھی تھی اور چنگاریاں بھی. وہیں امید کی روشنی تھی.

غالبًا یہی وجہ تھی کہ بیسویں صدی کی تیسری دہائی کے آغاز میں دنیا کے بدلے ہوئے حالات کے پیش نظر مولانا محمد میاں منصور انصاری آبلہ زار سیاست سے نکل آئے اور نخلستان تعلیم کی راہ لی. افغانستان بھی دیگر تمام مسلم ملکوں کی طرح عام طور سے علم و تعلیم سے بیگانہ ہو چکا تھا، مگر ابھی کچھ لوگ باقی تھے وہاں بھی. اپنے قلب کا عندیہ بھی تھا اور ان لوگوں کی درخواست بھی کہ مولانا منصور انصاری افغانستان کی وزارت تعلیم سے وابستہ ہو گئے.

یہی جذبہ ہندستانی مسلمانوں کے بارے میں تھا اور عالم اسلام کے لئے بھی. ہندستانی مسلمانوں یا ان کے اداروں پر آنچ آتی تو وہ بے چین ہو جاتے تھے. ایسی ہی کیفیت اس وقت ہوئی جب علی گڑھ میں حالات زیادہ ہی بگڑ گئے اور وہاں قائم شدہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کو بند کر دینے کے فیصلہ کی اطلاع انہیں ملی.

مولانا محمد میاں منصور انصاری کو جامعہ ملیہ اسلامیہ سے روحانی تعلق تھا. جامعہ کے

بانی ان کے استاذ شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ تھے، اگرچہ جامعہ ملیہ میں اب شاید ہی کسی کو اس حقیقت کا علم یا احساس ہو علی گڑھ کالج پر ابتدا ہی سے انگریز پسندی کی چھاپ تھی، مگر ملی اور قومی جذبہ وہاں بالکل مفقود نہیں تھا. شیخ الہند کی آواز پر وہاں کے چند بہترین دماغ بڑی خوش دلی سے ملی تحریک میں شامل ہو گئے تھے. مگر شیخ الہند کی صدا جب وہاں بازگشت نہ بن سکی تو ایک ''ملی مسلم یونیورسٹی'' کے قیام کا تصور شیخ الہند کے ذہن میں پیدا ہوا اور علی گڑھ ہی میں ۱۹۲۰ میں یہ تعلیم گاہ قائم کر دی گئی.

اس ادارہ کو انسانی وسائل تو بہت میسر آئے مگر مالی وسائل کی بڑی کمی تھی. اس وجہ سے جب قیام کے محض پانچ سال بعد ۱۹۲۵ میں اس کو بند کرنے کا فیصلہ ہوا تو مولانا محمد میاں منصور انصاری نے اپنے ایک دوست ماسٹر محمد شعیب قریشی کے نام کابل سے ایک خط میں اس فیصلہ پر اظہارِ افسوس کے ساتھ مسلمانانِ ہند سے وابستہ عالمی مسائل کا تذکرہ بھی کیا. یہ خط مولانا منصور انصاریؒ کے فکر اور سیاسی دانش کے پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے.

محمد شعیب قریشی کے نام خط

۱۹ ر جب ۱۳۴۳ھ مطابق ۱۳ فروری ۱۹۲۵

محترمی و مکرمی جناب بھائی ماسٹر محمد شعیب قریشی صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ! مسرور ہوں کہ اولین نامہ جناب کی خدمت میں اپنے ایک خاص دوست کے تعارف کے لیے لکھ رہا ہوں. عالی جناب محترم مرزا باز محمد خان صاحب (مدیر شعبہ ہند، وارد وزارتِ جلیلۂ خارجیہ کابل) آپ کے یہاں افغانی قونصل ہو کر تشریف لاتے ہیں میں امید کرتا ہوں کہ آپ ان سے مل کر نہایت مسرور ہوں گے. جناب موصوف کابل میں ہندستانیوں کے خاص معاون اور مہربان رہے ہیں.

پرسوں جناب خواجہ عبدالحیٔ صاحب (فاروقی) شیخ التفسیر جامعہ ملیہ (اسلامیہ) علی

گڑھ کے نامۂ گرامی سے جامعہ ملیہ کے بند کرنے کا فیصلہ معلوم ہوکر بہت افسوس ہوا

.انا لله وانا اليه راجعون.

(مکتبہ جامعہ ملیہ علی گڑھ نے ابتدائی زمانہ میں شیخ التفسیر مولانا خواجہ عبدالحی فاروقی کی کئی تفسیری کتابیں شائع کی تھیں. وہ کتابیں اب نایاب اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کی یادوں سے محو ہوچکی ہیں.)

مہاتما گاندھی کی غیر متوقع پسپائی حسرت افزا ہے، البتہ اس کے مقابل مسلمانوں میں تنظیم کی ابتدا (غالباً جمعیۃ علمائے ہند کے قیام کی طرف اشارہ ہے) جس سے اشک شوی ہوتی ہے. زندگی کا یہ واحد راستہ ہے.

روس و جاپان کا اتحاد اور چین کا اس اتحاد کا یقینی آلہ ہونا جن متوقعہ آنے والی ذمہ داریوں کا ہمارے لئے اعلان کرتا ہے مدبرین و جانفروش مسلمانان ہند اس سے غافل نہ ہوں گے. ان شاء اللہ تعالیٰ. میں دس سال افغانستان کے علاوہ یاغستان، بخارا، تاشکند، سمرقند، روس، قفقاز، ترکیہ میں خوب پھرا. ڈیڑھ سال سے کابل میں قیام پذیر ہوں. میری آوارگی کا حاصل صرف ایک خیال ہے کہ سو سال سے جو ہم نے کیا وہ تضیع وقت اور خلاف واقعہ خوش اعتقادیوں کا پروپیگنڈا تھا. اور یہ کہ اسلامی بقا اور ترقی کے لئے اول تنظیم داخلی اور پھر تنظیم صحیح خارجی ہے جس کے زور سے ہم اپنے برداران یوسف میں رہ کر مغرب سے خلاصی پاسکیں اور مشرقی خطرات کے مقابلہ میں مغلوب نہ ہوسکیں.

وفد ہلال احمر ترک کے ہمراہ سید توفیق بک بصری اول آئے تھے اور اب بھی بطور ترجمان آنے والے ہیں. وہ ایک راستباز ترکی جماعت کا خاص آدمی ہے. آپ اس پر ترکی مسائل میں اعتماد فرمائیں. شاید پہلے بھی سفر میں ہندستان گیا ہے جو دوبارہ آرہا ہے. سید توفیق بک کو میرا اسلام بھی فرمادیجئے.

کیا میں آپ سے سوال کرسکتا ہوں کہ آپ ان تصریحات کے بعد جو کمالیوں نے

کر دکھائیں کب تک اپنا پاک سرمایہ لگاتے رہیں گے. میں اس سوال کی جرأت زیادہ تر اس لئے کرتا ہوں کہ ان کے زمانہ میں بندہ انقرہ میں تھا.

میرا عرصہ سے ارادہ رہا کہ جناب سے خط و کتابت کروں لیکن اپنی بدنامی کی وجہ سے متأمل رہا کہ اس کا کوئی برا اثر مرتب نہ ہو. میں نے انقرہ میں رہتے ہوئے بہت سعی کی کہ مسلمانان عالم کی مرکزیت کو (برطانوی وزیر خارجہ کی) کرزنی (Lord Curzon's) ٹھوکر سے پاش پاش نہ کیا جائے لیکن سودمند نہ ہوا. کیونکہ ایسا کرنا (نئی قومی ترکی) حکومت کے غیر متغیر اصولوں میں داخل ہو چکا ہے. کمالیوں کی بیہودہ کاری اور اسلام کشی سے خود عوام ترک نالاں ہیں مگر ان کے ہاتھ میں نہ اب کچھ ہے اور نہ بعد میں کچھ آنے کی امید. یہ میرا پختہ خیال ہے. (اتاترک) کمال (۱۸۸۱-۱۹۳۸)، فتحی، عصمت (انونو/۱۸۸۴-۱۹۷۳) کو اگر اپنے زوال کا احتمال ہوا تو محض اس لئے کہ رؤف بک، موسیٰ کاظم قرہ باقر پاشا (۱۸۸۲-۱۹۴۸)، نورالدین پاشا (۱۸۷۳-۱۹۳۲) کی ہمتیں دوسری طرف مصروف ہو کر ضائع ہو جائیں ترکیہ کو کسی غیر متوقع جنگ میں دھکیل دیں گے نعوذ باللہ.

میرے خیال میں کمالیوں کی برباد کن روانگی نے ہم کو اس قابل بنا دیا ہے کہ ہم سوچ سکیں کہ سب سے اول ہم کو اپنے لئے قوت کا پورا سامان کرنا چاہیے. ہند کا رویہ، جاپان چین اور روس کے سب خطرات بھی اس کے پرزور دواعی ہیں.

ہر زمانہ میں مادہ پرست عناصر، قوت اور صرف قوت کے سامنے سربسجود ہوتے ہیں، تو آج کہ خالص مادہ پرستی کا عالم ہے اور حق پرستی کا کال اس کے خلاف کیسے ہوسکتا ہے. لہٰذا تنظیم کا خیال مبارک ہو. آپ تنظیم کے بعد ہی داخلی اور خارجی امور میں بات کرنے کے قابل ہو سکتے ہیں. امید ہے امور لائقہ سے مطلع فرمائیں گے.

آخر میں حضرت معظم مولانا شوکت علی صاحب (بیبر) کی خدمت میں سلام عرض کرتا ہوں اور جناب بھائی حکیم سعید صاحب گنگوہی (عرف حکیم اجمیری) و جناب

مولوی حکیم محمد ابراہیم صاحب جودھ پوری کی خدمت میں تبلیغ سلام کی تکلیف دیتا ہوں.

فقط والسلام مع الاکرام. سائر رفقائے کار بندہ کا سلام مسنون قبول فرمائیں.

آوارۂ ہندوستان

ابوالحامد محمد میاں انصاری عرف منصور

میرانشان: کابل. وزارت جلیلۂ معارف. منصور انصاری

(مجھے یہاں کوئی اصلی نام سے نہیں پہچانتا)

تعزیت اور تہنیت

شیخ سنوسی نور اللہ مرقدہ کی وفات اور مسٹر کے ایل گابا (خالد لطیف گابا)
اور رام داس خان کے خدام اسلام میں داخل ہونے کی خبروں پر تبصرہ

دنیا غموں اور شادیوں کا مجموعہ ہے، یہاں خالص خوشی کا نشان نہیں ملتا، اس لئے مبارک ہیں صدیقین کی وہ ذوات کہ دنیا کے ان دونوں عارضی حالات سے مغلوب نہ ہوتے ہوئے خدمات اسلامی اور ادائے وظائف ایمانی میں منہمک رہتے ہیں. آج مدینہ اخبار سے اسی قسم کی ایک ذات حضرت شیخ سنوسی نور اللہ مرقدہ جیسے عظیم الشان خادم اسلام کی وفات کے غم افزاء اور مشہور صاحب قلم مسٹر گابا (خالد لطیف) اور نامدار فاضل پرنسپل رام داس خان جیسی بزرگ ہستیوں کے خدام اسلام میں داخل ہونے کی مسرت آگیں خبریں معلوم ہوئیں، جنہوں نے عارضی غم وشادی کا دنیاوی معجون پیش کر کے حساس طبائع کو خالص اور سرمدی مسرتیں حاصل کرنے کی دعوت دی.

اس آوارۂ وطن کے خصوصی احباب اور بزرگوں (مہاجرین ہند، وترکستان روسی) نے ان خبروں کے مرکب اثر کے ماتحت اس کے غریب خانہ پر حضرت مولانا سیف الرحمٰن خان صاحب (مہاجر ہندی) کے قائم مقام (مولوی محمد عزیز الرحمٰن خان صاحب مہاجر) کی صدارت میں (جن کو ممدوح نے اپنی علالت کے باعث اپنی طرف سے جلسہ کی شرکت کے لئے بھیجا تھا) جلسہ کیا.

حضرت شیخ نور اللہ مرقدہ کے ایصال ثواب کے لئے اول تمام حاضرین نے ختم

کلام ملک العلام کیا. اس کے بعد صدر کی اجازت سے ننگ اسلام منصور انصاری نے حضرت شیخ سنوسی نور اللہ مرقدہ کی عظیم القدر صحیح اسلامی خدمات اور طریق کار پر روشنی ڈالی اور آخرین جنگ یونان کے زمانہ میں جب کہ ترکیہ کو برطانی عراق کی طرف سے خطرہ تھا تو شیخ قدس سرہ نے اپنے عالم گیر اثر کے زور سے اس کا عجیب و غریب علاج کیا تھا جسے خود حضرت شیخ (سنوسی) نے انقرہ میں اس آوارہ سے فرمایا تھا. اس کی تفصیلات بیان کر کے ممدوح کو ایصال ثواب کیا گیا.

اس کے بعد مسٹر خالد لطیف (سابق کنہیا لال گابا) صاحب اور پروفیسر رامداس خان صاحب کے اسلامی برادری اور حلقہ مساوات حقیقی میں داخل ہونے کی خبریں اور مسٹر (خالد) لطیف (گابا) کے حقائق آموز خطبہ کا (جو انہوں نے اپنے اسلام قبول کرنے کے محرکات پر جامع لاہور میں دیا ہے) ترجمہ سنایا گیا.

حاضرین جلسہ نے باتفاق رائے تجاویز ذیل پاس کر کے منظوری دی کہ روزانہ (اخبار) مدینہ (بجنور) کے ذریعہ سے ممدوحین کی خدمت میں ارسال کی جائیں.

۱- مہاجرین ہندستان و ترکستانات روسی کا یہ جلسہ حضرت مولانا الشیخ السید احمد الشریف السنوسی کے سانحہ ارتحال پر اپنے قلبی رنج و اندوہ کا اظہار کرتے ہوئے اعلیٰ حضرت واقدس الٰہی میں نہایت شکستگی اور خلوص کے ساتھ دعا کرتا ہے کہ وہ حی لایموت ان کے پسماندوں کو صبر جمیل و اجر جزیل کے ساتھ (سلسلۂ) سنوسیہ کی خالص عمرانی اسکیم کے کامیاب بنانے کی توفیق کامل عطا فرمائے آمین ثم آمین!

۲- اپنے پیارے بھائیوں مسٹر خالد لطیف اور پروفیسر رامداس خان صاحبان کی خدمات میں سلام مسنون برادرانہ پہنچاتا ہے.

۳- مسٹر خالد لطیف صاحب کی حسیات بلند خدمت اسلامی کو ان

کے جوش اسلام اور اعلیٰ قوت ایمانی کے شایان شان دیکھتے ہوئے ان کی کہ ان کے جہاد فی سبیل اللہ کے ہدف یہ دو نقاط ہونے چاہئیں!

نقطہ اول: اچھوت اقوام کو بلند کر کے بشریت کے ہموار اور با ناموس سطح پر لانا.

نقطہ دوم: تشکیل حکومت الہیٰ اور حقوق اسلامی کو (جس کے بدون دنیا سے فردی اور جماعتی فرعونیتیں گم ہو کر عالم انسانی میں ہرگز مساوات اصلی قائم نہیں ہو سکتی) اپنے مبارک اور غازیانہ قلم کی وساطت سے ملل ہند اور عام اقوام مشرق و مغرب کو تبلیغ کرنا.

راہ مستقبل

مولانا محمد میاں منصور انصاری ایک تنہا شخص ہی نہیں تنہا آواز تھے. وہ جماعت سے الگ نہیں تھے مگر جماعت ان کے ساتھ نہیں تھی. جماعت نے جو منزل طے کی تھی اس کی طرف جانے والی راہ اختیار نہ کی. ارادہ پر ادارہ حاوی ہو گیا اور بجائے خود مقصد بن گیا. مقصد کے لئے ادارہ کا وجود لازمی ہے اور عظیم مقصد کے لئے عظیم ادارہ درکار ہوتا ہے. لیکن ادارہ آلہ ہوتا ہے حصول مقصد کا. اسی سمت مولانا منصور انصاری اپنی جماعت کو بار بار متوجہ کرتے تھے.

اپنی جماعت میں مولانا محمد قاسم نانوتوی ایک بڑے انقلابی تھے. انہوں نے وہی خواب دیکھا تھا جو امام الانقلاب شاہ ولی اللہ نے دیکھا تھا اور اس انقلاب کے خطوط مراد اور اس کا نظام العمل حجۃ اللہ البالغہ میں مرتب کر دیا تھا، اس کے لئے اپنے خاندان اور خاندان سے باہر افراد کو تیار بھی کیا تھا اور صدا بھی لگائی تھی. اسی صدا کا ایک جواب مولانا نانوتوی تھے. وہ بھی اپنے عصر میں تنہا تھے. عہد بہ عہد ہر مفکر کی عمرانی تنہائی مشیت الٰہی تھی. فکر انقلاب تو مرتب و مدون موجود تھا، دمِ انقلاب مرضئ ربانی میں پوشیدہ تھا.

انسانی تقویم میں یہ انقلاب ملت کی اہم ضرورت تھا. اس ضرورت کا احساس انتشار کی شدت میں اضافہ کر رہا تھا. مولانا سید محمد یوسف بنوری کے نام مولانا محمد میاں منصور انصاری کے مکتوب میں یہ کیفیت ظاہر ہو گئی. دونوں عالم شیخ الہند کے سلسلہ تلامذہ میں تھے. شیخ الہند دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث تھے اور ملت اسلامیہ ہندیہ کے قائد انقلاب تھے. شیخ الہند کے شاگردوں کی شخصیات میں ان کی دونوں خصوصیات لازمی طور پر جمع نہیں تھیں. انقلابی قائد مولانا منصور انصاری شیخ الہند کے قبیلہ فکر سے راست تعلق رکھتے تھے. شیخ

الہند کے شاگرد مولانا سید انور شاہ کاشمیری سے اخذ علم کرنے والوں میں مولانا بنوری کی حیثیت نمایاں تھی. مولانا منصور انصاری کی ذات پر انقلابی فکر کا غلبہ تھا، مولانا بنوری کے ذہن پر نظری روایت کی حد بندی موثر تھی. مولانا منصور انصاری اور مولانا بنوری کے درمیان گہرے مخلصانہ تعلقات تھے مگر یہ دریا کے دو کنارے تھے. انہیں خود دریا ہونا تھا. وہ دو دریاؤں کا سنگم نہ بن سکے اور دریا کا بہاؤ ان کے مابین حد فاصل بن گیا تھا.

مولانا منصور انصاری کا یہ خط مولانا قاری محمد طیبؒ کے سفر افغانستان سے سال بھر پہلے لکھا گیا تھا. قیاس ہے کہ جو خیالات اس مکتوب میں پیش کئے گئے ہیں انہیں پر عمل آوری کی غرض سے انہوں نے مولانا قاری محمد طیبؒ کو افغانستان کے سفر کی دعوت دی تھی. مولانا منصور انصاری خود ہندستان آنے اور وہاں اپنی جماعت کی فکری رہنمائی کرنے سے قاصر تھے تو اوروں سے مایوس ہو کر انہوں نے مولانا قاری محمد طیبؒ کو اپنے پاس بلایا اور دارالعلوم دیوبند کو اس کے انقلابی منشور پر واپس لانے کی ایک کوشش کی. تاریخ میں یہ مہم نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوئی. مولانا قاری محمد طیب بھی ملت میں اسی فکری تنہائی کا شکار تھے.

بے شک، مولانا منصور انصاری کے مکتوب کا لہجہ بعض مقامات پر تلخ ہو گیا ہے لیکن دراصل وہ انقلابی فکر قاسمی اور مقصد ادارہ کی یاد دہانی کی ایک مخلصانہ کوشش تھا ضروری نہیں ہوتا کہ خلوص مقصد کا جواب بھی اسی پیمانہ پر ملے.

اس زمانہ میں مولانا محمد یوسف بنوری مصر میں مقیم تھے اور کسی خط میں مولانا منصور انصاری کو علماء مصر کی حالت پر تفصیل لکھ چکے تھے. مولانا منصور انصاری نے مندرجہ ذیل خط ان کو قیام مصر کے دوران ہی ارسال کیا تھا. یہ معلوم نہیں ہوا کہ مولانا بنوری نے اس خط کا جواب دیا تھا یا نہیں اور اگر ہاں تو وہ کیا تھا. مولانا بنوری کے نام مولانا انصاری کا خط کا اقتباس درج ذیل ہے.

مولانا محمد یوسف بنوری کے نام مکتوب

مقصد کی یاددہانی

۲۵ شعبان ۱۳۵۷

۲۰ اکتوبر ۱۹۳۸

از کابل

مجھے اس واقعہ کا ازحد افسوس ہے کہ ہم ننگ اسلام و اسلاف نے اسلام کی حقیقت اور اسلاف کے شاہکار (مدرسہ دیوبند) کے اصلی مقصد کو بدل کر اسے اپنے دماغ سے بھی نکال ڈالا ہے اور اس پیغام سے بھی غافل ہو رہے ہیں جو اس کے قیام کے پس پشت تھا یعنی تحفظ دین و بقائے اسلام کی جدوجہد.

ہندستان میں دوسرے مذاہب کے پیروکاروں نے اپنے مذاہب کی تبلیغ کا کام جن صورتوں میں شروع کیا تھا ان کے اخلاف نے نہ یہ کہ اس (مہم) کو زندہ کیا بلکہ اس کے ذریعہ سے اپنی زندگی کی حفاظت کر کے اسے اس درجہ تک ترقی بھی دی کہ آج یہ مردہ قومیں زندہ اور اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل اور اپنے حاکمانہ مقصد میں پوری طرح کامیاب ہیں. مگر ان کے مقابل اپنے عدیم المثال اسلاف کے علمبردار ہم جیسے اخلاف ہیں کہ ہم نے اپنی تو کیا اسلام پاک اور اپنے برگزیدہ اسلاف کی لٹیا ہی ڈبو دی ہے اور ایک زندہ اور زندگی بخش سیاسی اور دولتی مقصد کو رہبانیت اور گوشہ نشینی سے تبدیل کر لیا اور اپنے زندگی بخش مدارس کو بھی مردنی افزا خانقاہیں بنا چھوڑا ہے. تف ہے ایسے اخلاف پر اور ان کے مہلک اور لعنت افزا کاموں پر.

اخلاف کی اسی ہلاکت بار سعی کا نتیجہ ہے کہ آج ہمارے بزرگ کلیتاً ناکام ہیں اور ہماری پوری جماعت میں اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی مطلق سکت نہیں. اور وہ آج

دوسروں کا آلۂ کار بننے اور باعلم بےعمل کی خدمت کے تاریک صومعہ میں روپوش ہونے کے لئے مجبور ہیں.

اس آوارۂ ناکام کی آرزو یہ ہے کہ ہماری ننگ اسلام واسلاف جماعت جو آج عمل صحیح اور سیاسی اہمیت کی رو سے یہودیوں کی مثیل ہے اپنی اس تباہ حالی کا احساس پیدا کرے اور اسے انقلاب دے کر آمادۂ عمل ہو اور آفتاب اسلام اور اپنے بزرگوں کی مشعل ہدایت سے دنیا کو منور فرمادے. آپ بزرگوں کا زبانی پروپگنڈا فرمارہے ہیں، مگر میری نظر میں اس سے زبانی واہ واہ کے سوا کوئی عملی فائدہ نہیں پہنچ سکتا، حالانکہ ہمارا مقصد عملی فائدہ ہونا چاہیے. اس کے علاوہ ہم اخلاف کا غیر سیاسی عمل اپنے اسلاف کے سیاسی مقاصد کی تائید نہیں کرتا تو اس حال میں ہمارے قلمی پروپگنڈے کا حاصل یہ ہوگا کہ خود ہمارے ہاتھ ہمارے پروپگنڈے کے قلم کو توڑ ڈالیں گے. اس لئے نتیجہ معلوم.

اس لئے میری پختہ رائے یہ ہے کہ اول اپنے اسلاف کا مقصد معین کیا جائے. اس کے بعد خود کو اس کی تکمیل کوشش میں وقف کیا جائے. ان دونوں مرحلوں کے بعد اگر اپنے بزرگوں کے لئے زبانی مدح سرائی بھی کی جائے تو مفید، ورنہ ان کا نام نہ لینا ہی بہتر کیونکہ اس صورت میں وہ ناکام بزرگ (ثابت) ہوں گے.

میرے نزدیک ہمارے اسلاف کا مقصد ہندستان میں (فرنگی) حکومت کے مقابل ایک متوازن صحیح اسلامی حکومت کا ایک مرکز قایم کرنا اور اس کو کامرانی سے ہم آغوش کرنا ہے. اس لئے میری راہ عمل یہ ہے کہ

اول اسلاف کے اس مقصد کو روشنی میں لاؤں اور اس کے روحی انوار کے اوپر سے خانقاہ یا رہبانیت کے ڈالے ہوئے سیاہ پردے دور کروں.

دویم اسلامی حکومت کا نبوی نظام نامہ عصری عام فہم اسلوب پر مدون کروں اور اس کے اوپر فراعنۂ عہد اور علماء سو کے ڈالے ہوئے پردوں کو چاک کروں.

سویم اس کی تبلیغ کے لئے سیاہ اغراض سے پاک ایک جماعت (اگر چہ وہ صرف دو تین آدمیوں سے ہی مرکب کیوں نہ ہو) سیاسی اصول پر ترتیب دوں.

چہارم سیاسی اصول پر اس کی نہایت تدریجی ترقی اور قبل الہجرت عدم تشدد نبوی پر کار بند رہ کر اس کی پیش رفت کا سامان کروں جس طرح کہ ہند میں کانگریس نے کیا، اور کمیونسٹ پارٹی کر رہی ہے.

یہ ایک صبر آزما اور نہایت ہی دیرپا تعمیری کام اور کامیابی کی طرف سیدھی جانے والی راہ عمل ہے.

آپ اس راہ عمل پر غور کریں. اگر آپ اس راہ کے راہرو بن سکتے ہیں تو یہ سعادت ہوگی. اس صورت میں جتنا ہو سکے کام شروع کریں. جن میں سے ایک کام میری تالیفات کی شرح اور عربی میں اشاعت بھی ہے جو کہ آپ کے ہاتھ سے ہو سکتی ہے. اگر آپ منظور کریں تو تالیفات آپ کی خدمت میں روانہ ہو سکتی ہیں. آپ عصری عربی میں ان کا ترجمہ کر کے انہیں بمع تشریحات لازمہ امت عربیہ اور عربی داں عام مسلمانوں کے حلقہ میں شائع کریں. اس کے علاوہ بزرگوں میں سے بھی کسی کو اپنا ساتھی بنائیں تا کہ اس کے اثر سے جماعت اس راہ عمل پر ڈالی جا سکے.

اس امر کا مجھے خاص افسوس ہے کہ میرا لہجہ سخت ہے مگر کیا کیا جائے کہ صحت کے لئے تلخ دارو (دوا- کڑوی گولی) کی ہی ضرورت ہے. آپ میری یہ تلخ دوا حضرت قبلہ مبارک سے بھی گذاریں. میں ان کی حسن نیت وصلاح کاری کا قدیم سے معتقد ہوں. وہ ایک محقق اور لاغرض بزرگ ہیں. کیا عجب کہ خدائے کریم انہیں توفیق عطا فرمائے اور وہ جماعت میں میری ان تلخ گوئیوں کے قاسم بن کر اپنے شیریں اخلاق سے ان کے مزے کو گوارا بنا سکیں اور قاسم کے مقصد کو زندہ فرما سکیں. جب بھی ملنا ہو ان کی اور حضرت مولانا شبیر احمد صاحب کی اور صالح احباب کی خدمت میں میرا اسلام مسنون پہنچا دیں.

دعا کرتا ہوں کہ میرا یہ خط آپ کو مصر میں ملے اور وہیں آپ میری اس راہ کے عملی رھرو بن کر میری بعض تالیفات کو شائع فرماسکیں کیونکہ وہاں کی اشاعت کو ملت عرب اور یورپ میں خاص اہمیت حاصل ہے.

آپ نے علمائے مصر کی زبوں حالی کا ذکر کیا اس سے مجھے مطلق تعجب نہیں ہوا. نام کے علماء کا ہر جگہ یہی حال ہے. افغانستان میں بھی آپ علما کی یہی حالت دیکھیں گے بلکہ ہند میں بھی. فرق اگر ہوگا تو نسبتی اور جزوی. ایک جماعت کو اگر سیاسی احساس اور اجتماعی عمل اور صحیح نظام میسر نہ ہو تو وہ دنیا میں قوت حاصل نہیں کر سکتی اور قوت نہ ہو تو اہمیت کہاں. بہر حال علمائے مصر کے احوال معلوم کرنے کا بڑا اشایق ہوں.

فقط منصور انصاری

باب/ خیاباں بیاباں

حرب اور کرب

انگریزوں سے اقتدار واپس لینے کے لئے اہل ہند کے سامنے ۱۷۵۷ سے وہی ایک راستہ تھا جس سے گزر کر خود انگریزوں نے اول ایسٹ انڈیا کمپنی اور پھر وکٹوریائی لندن کے نام پر ہندستان پر معاشی اور پھر سیاسی قبضہ جمالیا تھا.

ہندستانیوں کی جنگ آزادی ۱۷۵۷ اور پھر ۱۸۵۷ میں شروع ہوکر چند ماہ میں ختم نہیں ہوگئی تھی. یہ ایک طویل اور متواتر جدو جہد تھی جس کے سنگ میل تاریخ کے انمٹ نشانات ہیں.سراج الدولہ/ پلاسی (۱۷۵۷)،شاہ عالم/بکسر (۱۷۶۴)، ٹیپوسلطان/ سرنگا پٹم (۱۷۹۹)،سید احمد شہید/ بالاکوٹ (۱۸۳۱)، بہادر شاہ ظفر/شمالی ہند (۱۸۵۷)، حاجی امداد اللہ تھانوی/ شاملی (۱۸۵۷)،لکشمی بائی/جھانسی (۱۸۵۷)،بیگم حضرت محل/ اودھ (۱۸۵۷)،شیخ الہند محمود الحسن/ افغانستان (۱۸۹۰-۱۹۱۵)،محمد میاں منصور انصاری/سرحدو پنجاب (۱۹۱۹)، اشفاق اللہ خان/ کاکوری (۱۹۲۵)،سبھاش چندر بوس/ انڈمان (۱۹۴۵) جیسے لوگ حوصلہ مندی کی قومی تاریخ میں نہ ہوتے تو آزادی حاصل نہ ہوتی.

ان حریت پسندوں کی انفرادی اور اتفاقی کامیابیوں وناکامیوں اور بظاہر بے ثمر قربانیوں سے قطع نظر حقیقت یہ ہے کہ جیالوں کی فوجوں نے ۱۸۸ سال تک انگریزوں کا ناطقہ بند کئے رکھا.اس میں شک نہیں کہ کابل و باجوڑ،سوات و پشاور، بالاکوٹ وراولپنڈی، پلاسی وبکسر، دہلی و اودھ،سرنگا پٹم و جھانسی، کانپورا ور انڈمان کے میدان مجاہدین نے نہ سجائے ہوتے تو انگریز اس خطہ سے ہرگز دستبردار نہ ہوتے.انگلستان کی متواتر گرتی ہوئی معیشت تو تقاضا کرتی کہ وھایٹ ہال ہندستان کو بدستور کالا دیس بنائے رکھتا.یہ ممکن نہیں

ہوا۔تاریخی حقیقت یہ ہے کہ فقط گاندھی جی کی اہنسا اس کا سبب نہیں تھی، اور بھی بہت کچھ تھا۔

ایک مستقل بحث ہے کہ بیرسٹر جناح، بیرسٹر اقبال، بیرسٹر گاندھی، بیرسٹر نہرو نے حربی اقدام پر انگریزوں سے مذاکرات کو کیوں ترجیح دی تھی۔کیا اس نئی پالیسی کے پس منظر میں ڈیڑھ سو برس کی دس حربی ناکامیوں کی تاریخ تھی؟ ہوسکتا ہے یہی وجہ ہو۔ممکن ہے انگریز نے بڑی چترائی سے انہی ناکامیوں کو جتا جتا کر ہندستانیوں کی ذلت کو اپنی عزت کی آڑ بنایا ہو۔آج سے سو دو سو سال بعد کا مورخ شاید اس تحقیق کا حق ادا کر سکے کہ آنے والے وقت میں جنوبی ایشیا کے ہمہ جہت حالات بالکل مختلف رخ لے چکے ہوں گے اور عوام کی موجودہ ہیجانی نفسیات میں ٹھہراؤ آچکا ہوگا۔سردست اس حقیقت کا اعتراف کافی ہے کہ بیسویں صدی میں ہندستانی ذہن دو سمتوں میں متحرک تھے۔ایک ذہن بیرسٹروں کی فوج کا تھا جسے لندن کے تعلیمی اداروں کی ہوائے ٹیمز بیز سے فرحت حاصل ہوتی تھی، اور دوسرا ذہن آلات حرب سے لیس فوج کی قومی قوت کو پھر آزمانا چاہتا تھا۔اس ذہن کی پرورش سراج الدولہ سے سبھاش بوس تک کی جانبازیوں نے کی تھی۔

مولانا محمد میاں منصور انصاری اس دوسرے ذہن کی نمائندگی کرتے تھے۔وہ تو نکلے ہی تھے جنگ کرنے کے لئے۔اور اس زمانہ کے ہندستان میں ایسی سوچ رکھنے والے کم نہیں تھے جو سوچتے تھے کہ یا تو جنگ میں فتح ہو، یا جنگ ایسا سیاسی تعطل پیدا کردے کہ دشمن مجبور ہوکر قومی انقلابیوں کی شرائط پر مذاکرات کے لئے بیٹھے جیسا کہ ۱۹۱۹ میں مولانا منصور انصاری نے معاہدہ راولپنڈی میں جزوی طور ثابت کر دکھایا۔

نئ تجویز حرب

ایک تجویز میرے ذہن میں ہے. ہندستان کے لئے تجربہ کار جنگی ماہرین افسران کا تیار ہونا لازمی ہے اوران کی تیاری اور مشق یا تو افغانستان میں ہوسکتی ہے یا ترکی میں. چونکہ ترکی میں عسکری تعلیم یورپ سے بھی اعلیٰ ہے، لہٰذا اگر اہل ہند کو اس امر کی طرف متوجہ کیا جائے تو ممکن ہے بعض ہندستانی خود ہی فنون حرب سیکھنے کے لئے آزاد سرحدی علاقوں میں آجائیں؛ کچھ افغانستان سے آئیں، اور کچھ براہ راست ہندستان سے.

امید ہے کہ اس محکمے کو آپ خود سنبھالیں گے اور دنیا کی یہ ایک بڑی خدمت ہوگی.

بندہ بہرحال یہ ارادہ کر رہا ہے کہ یہاں موجود ایک دو ہندستانیوں کو اس ضرورت کی طرف متوجہ کروں، مگر یہ بہت ناکافی ہے اور اس کے مصارف کو بھی یہاں کی مفلوک الحال حکومت برداشت نہ کر پائے گی.

باب/ خیاباں بیاباں

مسئلۂ ہندستان

مولانا منصور انصاری اس اعتبار سے اپنے عصر میں منفرد ماہر سیاسیات اور سیاسی قائد تھے کہ اکثر قائدین آزادی کے برعکس ان کی نظر فقط احوال حاضرہ میں الجھی ہوئی نہیں تھی بلکہ ہندستان کی دو ہزار سالہ تاریخ بھی ان پر ہویدا تھی اور مسلم عہد کی ایک ہزار سالہ تکوین عمرانیات سے بھی وہ باخبر تھے.

مولانا منصور انصاری کے عمرانی سیاسی نظریہ پر گفتگو سے پہلے یہ دیکھ لیا جائے کہ قدیم آریوں کے زمانہ میں جنوبی ایشیائی خطہ کے مذہبی، معاشی، تہذیبی اور سیاسی حالات پر قدیم گرنتھ کیا کہتے ہیں اور اس خطہ میں بسنے والے سماجی گروہوں کی قومی حیثیت کیا تھی.

اس پس منظر میں مولانا منصور انصاری ہندستان کی آزادی کے مسئلہ کو کئی جہتوں سے دیکھتے تھے. ایک طرف ان کے پیش نظر ہندو سماج کے اچھوت اور مجبور ومقہور جاتیوں کے جذبات کی رعایت کا مسئلہ تھا اور دوسری جانب سیاسی طور پر طے کی جانے والی اقلیتوں کے مساوی حقوق کا معاملہ تھا. وہ دیکھ رہے تھے کہ قائدین ہند ان دونوں امور کو سیاسی مفادات کے پس منظر میں دیکھ رہے تھے، انسانی مفادات سے انہیں غرض نہیں تھی. سیاسی لیڈر اس خطہ کی تاریخی حقیقتوں کو نظر انداز کر کے یہ سمجھے بیٹھے تھے اور سمجھا رہے تھے کہ اس خطہ میں ایک ہی قوم اور ایک ہی جماعت اور ایک ہی جاتی بستی ہے اور اس کے تمام افراد کے مفادات یکساں ہیں. یہ غلط تصور تھا. بہ صورت، مولانا منصور انصاری کے خیال کے مطابق، ملک کے ہمہ گیر ارتقا اور اس میں بسنے والے تمام اقوام اور جاتیوں اور جماعتوں کے حق میں نہیں تھی. اسی لئے وہ چاہتے تھے کہ تحریک آزادی کا رخ درست رہے تا کہ آزادی

کے بعد معاشرہ کے تمام طبقات مطمئن ہوں کہ ملک کے نئے تنظیمی ڈھانچہ اور سیاسی ہیکل میں ان کا مساوی حق ہے اور اس نظام میں رہتے ہوئے ان کے ملی، جماعتی اور جاتی مفادات کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا. یہ مضمون ہند کے بعض اخبارات میں شائع بھی ہوا تھا. یہاں نقل کیا جاتا ہے.

ہندستان کی سیاسی تشکیل

انسان میں اس کی باہمی مشاورت اس قدر اثر انداز ہے کہ اس کا کوئی فرد، کوئی خاندان، کوئی قبیلہ، کوئی قوم و وطن انکار نہیں کر سکتا لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کوئی شخص بھی اس پر راضی نہیں کہ دوسرے کے مقابل پست اور نمبر دویم بنے، اور کسی سے بن جائے تو اس پر قناعت فرما رہے.

یہی وجہ ہے کہ دنیا کے افراد خاندان اور اوطان اپنے پادشاہوں کے مقابل اور عالم انسانی کی ہر آزادی سے محروم جماعت اپنی اپنی تجاوز شعار (حد سے گزر جانے والی) قوتوں کے برخلاف جہاد آزادی میں منہمک رہتے ہیں اور آزادی ''یا تحصیل مساوات'' کے لئے ہر قسم کی جانی مالی اور عرضی قربانی دینے کے لئے تیار نظر آتے ہیں.

اس لئے ہندستان کے لئے جو کہ مختلف اقوام اور مذاہب سے مرکب ایک چھوٹی دنیا ہے ضروری ہے کہ وہ انسانی افراد اور مختلف النوع جماعات مذکورہ کے فطری جذبۂ آزادی خواہی سے اپنی آنکھیں بند کر کے اپنی ناکامی کا سامان فراہم کرے.

اس حقیقت حقہ کو روشن کرنے کے بعد اب ہم ان خطرات کو گنواتے ہیں جو ہندستان کی آزادی کی راہ میں فی الحال حائل ہیں یا مستقبل قریب یا بعید میں اس کی آزادی کو دھمکاتے ہیں.

موجودہ خطرات جن کے ہوتے ہوئے ہندستان آزادی کا منہ نہیں دیکھ سکتا

صرف دو ہیں:

اول: مدبرین یا مجاہدین آزادی ہند کا جذبۂ آزادی جماعات ہندستان سے مذاق کرنا، اور اس سے آنکھ بند کر کے آزادی ہند کا خواب دیکھنا.

یہ خطرہ نہایت مہیب اور سب سے مقدم ہے، اور سب سے اول آزادی خواہان ہند کے اوپر اسی کا علاج کرنا فرض آزادی خواہی (مطلوب) ہے، ہمارا یہ ایمان ہے کہ اس خطرہ کا علاج کئے بغیر آزادی کا تصور قطعاً ممکن نہیں ہے.

اس مہیب ترین خطرہ کا علاج صرف یہ ہے کہ قائدین ہند ہندستان کی نام نہاد اقلیتوں کے جذبۂ آزادی واستقلال کے سامنے احتراماً سر جھکائیں اور ہر قوم واہل مذہب کے استقلال کی حفاظت کرنا اور اس کو اس کی آزادی طبعی کے متعلق عملاً مطمئن کرنا اپنا اصلی وظیفہ بنائیں.

> دویم: بالفاظ دیگر قائدین ہند کو اپنا موجودہ فنا خیز اور ناکامی افزا یہ سیاسی غلط عقیدہ تبدیل کر دینا چاہیے کہ ہندستان میں ایک جماعت تو اکثریت ہے اور باقی جماعتیں اس کی اقلیتیں ہیں، بلکہ ان کو ضامن کامرانی اور بالکل صحیح عقیدہ قایم کرنا چاہیے کہ ہندستان یورپ جیسی ایک چھوٹی سی دنیا ہے جس میں مختلف العدد بہت سی ایسی قومیں آباد ہیں جن کے دلوں میں اپنے اپنے استقلال وآزادی کی لوا اپنی انتہائی شدت اور قوت کے ساتھ لگی ہوتی ہے اور ان میں سے کوئی قوم بھی راضی نہیں کہ اپنے استقلال کو کسی قیمت پر بھی بیچے. اور ان میں (کوئی) ایک جماعت بھی تصور نہیں کر سکتی کہ وہ خود کو اپنی پہلو نشیں جمعیت کے مقابلہ میں اس کے نفوس کی کثرت کے باعث اقلیت مان لے اور اس کے زیر حکم وفرمان بن کر اپنی آزادی واستقلال یا مساوات سے ہاتھ دھو بیٹھے.

دیش بھگت ہندستانی رہنما اس تصحیح عقیدہ کی برکت سے اپنی اس علت ناکامی سعی

سے ہاتھ کھینچ لینے کے قابل ہوجائیں گے جس کے باعث وہ انڈیا کی زبردست اقوام کو اقلیت کہہ کر آزاد ہند کا ایک مغلوب اور اسیر عنصر بننے پر راضی کرنا چاہتے ہیں اور اس سیاسی حماقت پر جمے رہ کر ہند کو آزاد دیکھنا چاہتے ہیں.

تصحیح عقیدہ کے بعد ان کی سعی و جہاد کا ہدفِ نظریہ ہوجائے گا کہ وہ ہر قوم وملت کو اقلیت سمجھنے کی جگہ ایک مستقل ملت تصور کر کے سعی کریں گے کہ انڈیا کی ہر قوم اس کی دوسری اقوام کو اپنی طرح مستقل اور آزاد سمجھے اور ہر قوم ایک دوسرے کے استقلال وآزادی کی حمایت اور تحصیل کے لئے آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ متحد ہوجائے.

تبلیغِ مساوات

ایسا ہوتا ہے کہ انسان خود ہی انسانیت کے بلند مرتبہ سے گرتا ہے اور احساس کمتری کا شکار ہو جاتا ہے تو معاشرتی خفت مٹانے کے لئے خود کو اونچی جاتی والا سمجھنے لگتا ہے اور اس کا اتنا پرچار کرتا ہے کہ سیدھے سادے عام شریف لوگ علم کی کمی کی وجہ سے خود ہی انسانی شرافت سے محروم ان لوگوں کو اپنے سے افضل اور برتر ماننے لگتے ہیں. آریہ معاشروں میں عام طور سے تمام انسانوں کو بطور مخلوق عزت کے قابل نہیں مانا جاتا جس کا اظہار آئے دن نسل پرستی کے وحشت ناک جرائم میں امریکہ، کینیڈا اور یورپ میں بھی ہوتا رہتا ہے.

ہندستان میں انسانوں، خاص طور سے مقامی اصلی باشندوں، کی اکثریت کی تذلیل کا قانون ویدوں کے زمانہ سے رائج ہے. دراصل یہ منفی نقطۂ نظر آریوں کے سماجی وجود سے بھی پہلے کا ہے. قرآن حکیم میں حضرت نوح علیہ السلام کے ذکر میں آتا ہے کہ اس زمانہ کے چودھری اور خود کو اونچی جاتی سمجھنے والوں کا جواب تھا

قَالُوۡٓا اَنُؤۡمِنُ لَكَ وَاتَّبَعَكَ الۡاَرۡذَلُوۡنَ ۝ (الشعراء ۲۶:۱۱۱)

وہ لوگ کہتے تھے کہ کیا ہم تم کو مانیں جبکہ رذیل (نیچ) لوگ ہی تمہارے پیچھے چلتے ہیں.

ایک اور موقعہ پر خود کو اونچی جاتی سمجھنے والے ان لوگوں نے پھر حضرت نوح سے کہا

وَمَا نَرٰكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيۡنَ هُمۡ اَرَاذِلُنَا بَادِىَ الرَّاۡىِ (هود ۱۱:۲۷)

اور ہم دیکھتے ہیں کہ تمہاری پیروی وہی کرتے ہیں جو ہم میں نیچ (رذیل) ہیں،
اور وہ پیروی بھی (بلا سوچے سمجھے) محض سرسری رائے سے ہے.

نسل پرستی اور انسانوں کی تذلیل کی ایک مثال امریکی سہ روزہ رسالہ فوربس

میگزین (Forbes Magazine) پیش کرتا ہے. اس رسالہ میں ہر سال پابندی سے دنیا کے دولت مند ترین ارب پتی (billionaire) سو افراد کی فہرست شائع ہوتی ہے ٹھیک اس وقت جب افریقہ، ایشیا، جنوبی امریکہ میں اربوں انسان بدترین غربت وافلاس، بھوک اور موت کا شکار ہوتے رہتے ہیں، کوئی ان کا پرسان حال نہیں ہوتا.

موجودہ عالمی معاشرہ کا ارب پتی گروہ ان کمزور انسانوں کے بارے میں وہی تصور رکھتا ہے جو قوم نوح کے چودھریوں کا کہنا تھا کہ وہ تو **اَرَاذِلُـنَـا** - ہمارے رذیل، نیچ لوگ ہیں.

انسان کا دوسرے ہم جنس انسانوں سے خود کو برتر سمجھنا ایک بیماری ہے. انسان کو اپنی عقل، اپنی وسعت معلومات، اپنے بے تحاشا مال و دولت کا بڑا غرور ہے مگر اس مرض سے بظاہر ناواقف ہے. انسانوں کی بھاری اکثریت اس بیماری میں مبتلا ہے اور علاج سے انکاری بھی ہے لیکن طبیب کے سامنے کوئی بیمار آئے تو وہ نظر نہیں پھیر لیتا. ہندستان میں مسلمانوں نے یہی کیا اور غلط کیا. ان کی دینی، اخلاقی اور انسانی ذمہ داری تھی کہ وہ ان مظلوم انسانوں کا ہاتھ تھامتے. برصغیر کی ۸۰ فی صدی آبادی ڈیڑھ دو ہزار سال سے شدر اور اس سے بدتر اچھوت بنائی ہوئی تذلیل وتحقیر کی کھائی میں پڑی کراہ رہی ہے اور کوئی ان کا دکھ بانٹنے والا نہ ہوا.

ہندستانی حالات کے تاریخی تناظر میں مولانا محمد میاں منصور انصاری کا نقطۂ نظر تھا کہ باشندگان ہند کی یہ مظلوم اکثریت دادرسی کی حق دار ہے اور یہ کام مسلمانوں کی سماجی اور اخلاقی ہی نہیں دینی ذمہ داری ہے. وہ خود ہندستان میں رہتے اور ریشمی رومال تحریک کا عطر اور صفر نہ بن جاتے تو شاید انہی مظلوم انسانوں میں جا کر کام کرتے. مگر زندگی نے انہیں قریبی معاشرتی مقاصد سے بہت دور کر دیا تھا تو انہوں نے بعض ممتاز ہندستانیوں کو اس سمت توجہ دلائی. مقدر نے ان کی ہر آواز کو صدا بصحرا کا درجہ عنایت فرمایا. انسانی معاشرہ

کے صحرا میں ایسی لاتعداد آوازیں گونج رہی ہیں مگر کانوں کے پردوں میں ارتعاش نہیں ہوتا.

افسوس مسلمان حکمرانوں نے رواداری کے طور پر ملک کے معاشرہ کی اصلاح کی اثباتی کوشش نہ کی. انگریزوں نے اس سمت میں اپنے مفادات کی غرض سے چند اقدامات ضرور کئے. جب ۱۸۶۵ میں مردم شماری مہم کا آغاز ہوا تو مذہب کے خانہ میں ۳۳ کروڑ دیوی دیوتاؤں کو ماننے والوں کے ۳۳ کروڑ مذہبوں کا اندراج گنتی کے لحاظ سے ناممکن تھا. تو انگریز شمارندوں نے ۱۸۸۱ کی پہلی مردم شماری رپورٹ میں ان سب کو ''ہندو'' کا ایک نام دے دیا. اس دیس کے باشندوں کی کسی بھی مقدس کتاب گرنتھ میں یہ دھرمی عنوان بیان میں نہیں آیا. یہ مقامی انتہا پسندی کا بیج تھا. اچھوتوں کو بھی اسی دھرم کے تحت شمار کیا گیا حالانکہ عملاً وہ اس دھرم سے خارج تھے. مگر انگریزوں نے انہیں ستم دیدہ طبقہ - دَل، گروہ - (depressed classes) کہا. گاندھی جی نے انہیں ہریجن (بھگوان کی اولاد) کا لقب دیا جسے اس مظلوم طبقہ کے ذہین لوگوں نے رد کر دیا کہ اس کا مطلب تو ناجائز اولاد ہوا.

ہندستانی مسلم صفوں سے ایک درخواست مولانا محمد میاں منصور انصاری نے ۷ اکتوبر ۱۹۳۶ کو کابل سے تحریر کئے ہوئے ایک مکتوب میں مورخ اسلام مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی سے کی تھی.

فرض کفایہ ادا ہو گیا تھا. فرض عین کے لئے آنکھ نہ کھلی.

تو اگر سویا ہوا ہو تو جگاؤں تجھ کو

ہائے جاگے ہوئے مسلم کو جگاؤں کیسے

مولانا اکبر شاہ خان نجیب آبادی کے وجود میں مجاہدانہ روح بے چین تھی. وہ مولانا حامد الانصاری غازی اور جگر مرادآبادی کے قریبی دوستوں میں تھے. تاریخ ان کا موضوع تھا. اور یہ تینوں بزرگ دیکھ رہے تھے کہ حالات نے ہندستان کے مسلمانوں کو ان کی تاریخ سے کاٹ دیا تھا اور ۱۸۵۷ کے بعد بڑے منظم انداز میں انہیں احساس کمتری کا شکار

بنایا جارہا تھا.اس وقت تنہا شبلی نعمانی نے اس سمت میں بڑا کام کیا تھا. جب ایک گروہ اپنی تحریروں میں لگاتار مسلمانوں کو خود ان کی نگاہوں میں ذلیل کر رہا تھا، شبلی نعمانی نے ملت کو پست ہمتی اور اجتماعی تحقیر کے گڑھے سے نکالنے کی کوشش کی. اسی زمانہ میں مولانا حامد الانصاری غازی نے اکبر شاہ خاں نجیب آبادی کو متوجہ کیا اور انہوں نے تین جلدوں میں مبسوط تاریخ اسلام لکھنے کا بیڑا اٹھایا اور ساتھ اسباب زوال مسلم پر بھی ایک پر جوش کتاب لکھی. تاریخ اسلام پر کام چل رہا تھا کہ مولانا محمد میاں منصور انصاری نے مولانا اکبر شاہ خان کو کابل سے خط لکھا اور ایک نئی مہم کی طرف توجہ دلائی.

اکبر شاہ خان نے تاریخ اسلام کے مسودہ پر سے قلم نہ اٹھایا اور ٹھیک کیا. ان کے سوا وہ کتاب کوئی اور نہیں لکھ سکتا تھا. اسلم جیراجپوری نے بھی تاریخ اسلام لکھی تھی مگر وہ بات نہ پیدا ہوئی. تاریخ اسلام لکھنے کے لئے صرف کاغذ اور درکار نہیں ہوتا. قلم کاغذ سے پہلے ان بزرگوں سے محبت، ان سے عقیدت، ان کے کارناموں کی عزت، نظر میں تاریخی فراست، قلب میں حوصلۂ دیانت کی روشنائی چاہئے. اسی لئے تاریخ اسلام مورخ کا سخت ترین امتحان ہوتی ہے اور بڑے بڑے اس میں فیل ہوتے دیکھے گئے ہیں.

بہر حال مولانا منصور انصاری کے خط نے ایک راز جو دنیا پر کھول دیا وہ یہ کہ امت مسلمہ قحط الرجال کے سراب میں پیاسی کھڑی تھی. بیسویں صدی کے ابتدائی عشروں میں ملت اسلامیان ہند کے پاس ذہنوں کی بھی قلت تھی، ہاتھوں کی بھی اور قدموں کی بھی. مہمات بے شمار تھیں اور کام کرنے والے وہی چند لوگ. گھوم پھر کر انہی چند لوگوں سے توقع ہوتی تھی کہ کھیت بھی بو دیں گے، فصل بھی کاٹ دیں گے، آٹا بھی پیس دیں گے، روٹی بھی پکا دیں گے اور لقمے بنا کر کھلا بھی دیں گے.

ان لمبی امیدوں کے نتیجوں سے کون بے خبر ہے.

گزشتہ صدی کے ایک مہاجر مجاہد کی آرزو آج بھی زندہ ہے کہ شاید اکبر شاہ خان

نجیب آبادی جیسا کوئی نیا عبقری اس زندہ امت میں کہیں سے اٹھ کر ایک مظلوم طبقہ کے حق میں اس آرزو کو پورا کر دے. اور کون نہیں جانتا کہ آج ہندستان کا مسلمان بھی اسی دلدل میں اتارا جاچکا ہے. جیب خالی، سکول مدرسہ خالی، دماغ خالی، دل خالی. ان کا ایک خود ساختہ لیڈر اپنی بیٹی کی منگنی پر چار کروڑ روپیہ خرچ کر ڈالتا ہے جب کہ خود اس کے پارلیمانی حلقۂ انتخاب میں لاکھوں بیٹیوں کے سر پر عزت کی چادر تک نہیں ہے، ہاتھ میں عزت کی روٹی تک نہیں ہے اور ان بچیوں اور بچوں کا کوئی مستقبل تک نہیں ہے. --م ط غ

علامہ اکبر شاہ خاں نجیب آبادی کے نام مولانا محمد میاں منصور انصاری کا مکتوب یہاں نقل کیا جاتا ہے:

زندہ آرزو

۲۱ رجب المرجب ۱۳۵۵ / مطابق ۱۷ اکتوبر ۱۹۳۶

حضرت اکبر اکابر مدظلہ العالی. السلام علیکم ورحمۃ اللہ

خیریت سے ہوں اور عافیت مزاج کے لیے دست بدعاء. الحمد للہ! اس وقت ایک خاص غرض سے عریضہ لکھ رہا ہوں اور احساس رکھتا ہوں کہ میری عرض آنجناب کے موجودہ پروگرام کے نہایت ضد اور متصادم ہے لیکن وقتی دعوت کے بالکل مطابق ہونے کی وجہ سے اسے تقدیم کرنا لازم وقت سمجھتا ہوں. اس لئے امید ہے کہ جناب اس پر خاص الخاص غور وخوض فرما کر اپنا فیصلہ صادر فرمائیں گے.

اس آپ کے دعاء گو آوارۂ وطن کو آپ کے پیش نظر کام آپ کی تصنیف تاریخ اسلام سے اس کی اہمیت کے پیش نظر دلچسپی رہی ہے. جناب نے اس کے مقدمہ کا جزو حکومت الٰہی کو بھی بنایا. یہ ایک خاص الخاص توفیق ہے جو کہ اعلیٰ حضرت واقدس الٰہی کے دربار سے جناب کو ملی، مگر میں محسوس کرتا ہوں کہ اس نے نظام سلطنت کی اشاعت کے

متصل اچھوت اقوام کے لئے اسلام کی طرف رجحان کا سامان فرما کر ایک طرف آپ کی اس للّٰہی سعی کو مقبولیت کا پروانہ عطا فرمایا ہے تو دوسری طرف آپ کو اور خاص آپ کو اس اصول پر دعوت عمل دی ہے جس سے ماننا پڑتا ہے کہ تالیف تاریخ (اسلام) کی وہ زبردست ضرورت جو اس کے آغاز کا باعث ہوئی تھی اب نہیں رہی. اس لئے اس میں آپ جیسی ذات کا مصروف رہ کر لازمِ وقت عمل سے الگ رہنا صواب نہ ہوگا. مجھے امید ہے کہ آں محترم اس الٰہی دعوت کو قبول فرمانے میں پس وپیش نہ فرمائیں گے اور تالیف تاریخ کا کام کسی رشید شاگرد کے سپرد فرما کر نومسلم اچھوتوں کی حکومت الٰہی کے اصول پر تنظیم عملی خدمت میں مصروف ہوجائیں گے. **بعونه تعالی و حسن توفیقه.**

کانگریس اور اس جیسی دوسری قوتیں حکومت ہند کے مقابل اور متوازی حکومتیں ہیں. حکومت ہند کا زبردست حوصلہ ان سے زیادہ اچھوت نومسلموں کی تنظیم کو برداشت کر سکے گا. کیونکہ اول وہ صرف ایک تبلیغی نظام ہوگا اور سیاسی تحریک سے زیادہ تبلیغ فطرت اس کا ہدف نگاہ ہوگا. دوسرے یہ کہ وہ امن کی ایک زبردست تحریک ہے جس کا بلاتفریق مذہب و ملت بشریت کا ہر فرد اور ہر قوم محتاج ہے. میرے خیال میں اس کام کو عالمگیر امن کی خدمت کی صورت سے اور اسی غرض سے ہی ہاتھ میں لینا چاہیے.

میری دعا ہے کہ حضرت الٰہی اس عہد ضرورت میں آنجناب کو اس مقدس اور امینت عمومی کی اساس قایم کرنے کی خدمت کے لئے چن لے. آمین.

اگر آنجناب نے اس دعوت عمل کو قبول فرمالیا اور اپنی ہم رکابی کے لئے اس آوارہ کو امر دینا بھی مناسب سمجھا تو اس شرف کے لئے یہ ناکارہ بھی اپنی آوارگی کو خیرباد کہہ دینے کے لئے تیار ہے. فقط والسلام مع الاکرام۔

مخلص دعا گو

منصور انصاری. کابل

۱۲ رجب المرجب ۱۳۵۵ (۱۷ اکتوبر ۱۹۳۶)

صحرا کا سناٹا

مولانا محمد میاں منصور انصاری کا یہ مقالہ تاریخ آزادی کے بحرانی دور کا آئینہ دار ہے.

موجودہ حالت میں ہمارا جو رویہ ہونا چاہیے اس پر عام بحث (کے بعد) اس کا طے ہو جانا لازم قطعی ہے. ہندو بالکل تیار ہو چکے ہیں. ان کو جو کچھ کرنا ہے وہ ضرور اس پر عمل پیرا ہو کر رہیں گے. ایسی حالت میں جامعۂ اسلامیہ (مسلم معاشرہ) کا تذبذب اور موجودہ افتراق ان کی محرومی اور ہلاکتِ اجتماعی کا قطعی سبب ہوگا.

میرے خیال میں اولین اور اہم ترین ضرورت جس پر ہماری کامیابی کا مدار ہے اور جس کے ذریعہ سے ہم برطانیہ سے اپنے حقوق کے لئے لڑ سکتے اور دوسری قوتوں کے غاصبانہ اقدامات سے انہیں محفوظ رکھ سکتے ہیں صرف جامعۂ اسلامیۂ ہندیہ (مسلمانانِ ہند کی تنظیموں) میں مرکزیت کی تولید (پیدا کرنا) ہے. امت مسلمۂ ہندیہ پر فرض اتم ہے کہ بدون ایک آن ضائع کیے اپنے لیے ایک سیاسی مرکز اسلامی اصول اخوت کے مطابق تعمیر کر کے اپنی مختلف سیاسی انجمنوں کو اس کے ماتحت کر دیں. یہ مرکز امت کے آمال (امیدوں) کا اجرائی خادم اور اس کے اقتدار کے زیر اثر خدمت گار ہو. اور امامت کے اصول انتخاب کے اوپر عصری رجحانات کی خاطر قانون موقتی کا اضافہ تا وقت ضرورت قبول کر لے.

میرے نزدیک ایسے مرکز کی تعمیر جلد از جلد اس لیے بھی ضروری ہے کہ ہم برادران ہنود کو اپنے حقوق کے منوانے پر اسی مرکزی قوت سے راضی کر سکتے ہیں. ایک وقت مسلم لیگ ہمارا یگانہ سیاسی مرکز تھا. اگر وہ (اتحاد) اب تک اپنی ابتدائی ہم آہنگی کے ساتھ

قائم رہتا تو ہم جدید سیاسی تعمیر کے محتاج نہ ہوتے. مگر افسوس کہ ہم اپنے مرکز کو مصنوعی اتحاد کی بھینٹ چڑھا کر کانگریس کی تزویر میں اسیر ہوگئے اور جب کہ اکثریت اقلیت کو ہضم کررہی تھی ہم اس کے اصلی مقصد اور اس کے آنے والے نتائج کو بالکل نہ سمجھ سکے، اور کانگریس کو یہ سمجھنے کا موقع ہاتھ آگیا کہ مسلم ہند اب ہماری مفتوح قوم ہے.

اگرچہ سچ ہے کہ گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں، لیکن پھر بھی الحمدللہ ہم وقت سے پہلے بیدار ہوگئے اور اب بھی کافی وقت ہے جس میں مافات (گزری غلطیوں) کی تلافی کی جاسکتی ہے. الحاصل جب تک مسلمانان ہند اپنا مستقل سیاسی مرکز تعمیر نہ فرمالیں اصولاً و مذہباً ان کا کوئی اجتماعی اقدام معتبر، مقبول، اور صحیح طریقہ سے منتج برکات نہیں ہوسکتا.

مرکز کی تعمیر دنیا کے مشکل ترین مسائل میں سے علے الخصوص مسلمانان ہند میں زیادہ تر اس وجہ سے اور بھی مشکل تر ہوگئی ہے کہ ہم بہ نسبت دوسرے عناصر کے اجتماعیات سے ناآشنا اور پدرم سلطان بود کے مہلک رو میں ہمہ تن غریق ہیں. خود رائی، خود پرستی ہمارے چھوٹے چھوٹے خود ساختہ بڑوں کا شیوہ اور انفرادیت (خود پسندی) اور نخوت (بدمزاجی) ہمارا عام مسلک بنا ہوا ہے. کیا مسلمانان ہند موجودہ ماحول میں ہوتے ہوئے بھی اپنی انفرادیت اور شخصی نخوت سے دست بردار نہ ہوں گے؟

ہمارے رہنما کانگریسی تجاویز کے جال میں پھنسے رہے اور امت کے سامنے خود کوئی نقطۂ نظر ایسا نہیں پیش کرسکے جس سے ان (عام مسلمانوں) کو دلچسپی ہوتی اور وہ اس کی جاذبیت سے مسحور ہوکر دیوانہ وار ایک نقطہ پر جمع ہوجاتے. مثلاً ہندو قوم ایک مرکز پر جمع ہے کیوں کہ اس کے سامنے ایک مہم اور نہایت جاذب نقطۂ نظر جلوہ گر کیا گیا ہے کہ طویل عریض ہندستان کی تمام آبادی اور ثروت (مادی وسائل) اصول جمہوری کے اعتبار سے تمہارے ہاتھوں کا کھلونا ہوگی. بالفاظ دیگر یہ کہ ہندستان میں کانگریس ہندو راج قائم کررہی ہے. اب اس کے مقابلہ میں دیکھا جائے کہ مسلمان رہنماؤں نے کیا کیا ہے؟

کانگریسی مسلمان

اگر چہ سب میرے بزرگ اور حق دار ہیں لیکن جذبۂ اظہار حق اور نزاکت وقت سے مجبور ہوکر عرض کرتا ہوں کہ میرے مجاہد بزرگوں نے نہایت ہی ناقص نقطۂ نظر پر مسلمانوں کو باہمی اتحاد کی دعوت دی ہے.

ہندستان سے برطانی سیادت کا اٹھانا میرے اعتقاد میں ایک آزادی خواہ کا اولین مقصد ہے اور میں بھی اس مقصد کو امت کی حیات اجتماعی کی شرط اول سمجھتا ہوں.لیکن یہ مقصد تنہا تو اس وقت امت کا نقطۂ نظر قرار پاسکتا تھا اور جاذب قلوب ہوسکتا تھا کہ ہندستان یا تو خالص مسلمانستان ہوتا یا کم از کم اس میں مسلمانوں کو اکثریت فائقہ حاصل ہوتی.بحالات موجودہ کہ وہ اقلیت فائقہ میں ہیں اور جہاں ان کو اکثریت حاصل ہے وہاں بھی وہ خالص نہیں، (لہٰذا) صرف برطانی سیادت کا قلع قمع امت کی آزادی اور استقلال حیات کے لیے کافی نہیں ہوسکتا.

ہندستان سے برطانیہ کا کوچ دو یقینی اثر (نتائج) رکھتا ہے

اول : برطانی قصر شہنشاہیت کا فوق العادہ (غیر متوقع) تزلزل.

دوم : اکثریت ہند کا ہندستان میں برسرحکومت آجانا.

ان دونوں یقینی آثار مجموعہ سے،ہم ابدی غلامی کے سوا کیا حاصل کریں گے؟ اور وہ کون سی ارضی یا سماوی جنت ہے جو اس جہاد میں شرکت سے ہمارا حصہ قرار پا جائے گی؟

بے شک دشمنِ تجاوز کار (ظالم) سے دشمنی اور اس پر ضرب لگانا ہمارا ناقابل تبدیل مذہب ہے،مگر وہ کسی ایک نسل کے ساتھ مخصوص نہیں کیا جاسکتا، اس کی تعمیم (عمومیت) اور ہر تجاوز کار کو تجاوز کار سمجھنے میں ہی شرف حیات کی حفاظت مضمر ہے،خواہ سات سمندر پار ہوکر آیا ہو یا وہ ہمارے پہلو میں بیٹھا ہوا ہمیں اسیر کرنے کے لیے مصر ہو.

کانگریسی مسلمانوں کا مقصد ایک دشمن کو ضرب لگانا معلوم ہوتا ہے، مگر اپنے انجام پر اس کی نظر نہیں معلوم ہوتی. میں اپنے نہایت برگزیدہ بزرگوں کے حضور میں باادب عرض کرتا ہوں کہ اپنے نقطۂ نظر پر نظر ثانی فرمانے کی زحمت گوارہ فرمائیں تا کہ امت کو اس نازک وقت پر جمع فرما سکیں.

اس لیے کہ صرف برطانیہ کے نقصان اور اخراج سے مسلمانان ہند کو نفع پہنچنا علی الخصوص موجودہ وقت میں نہایت مشتبہ بلکہ مخالف عقل و تجربہ ہے.

اس موقع پر اگر مولانا حسرت موہانی کی تجویز متحدہ لامرکزیہ (علاقائی خودمختاری) (confederation) کا ذکر نہ کردں تو سخت ناشکری ہوگی. دستور ہند میں لامرکزیت کی رعایت اقلیتوں کی اجتماعی حیات کی جان ہے. مگر مجھے افسوس ہے کہ مسلمانان ہند نے اس پر شایان شان توجہ نہیں فرمائی.

نزاکت وقت کا لحاظ کرتے ہوئے معیوب نہ ہوگا کہ ایک گمنام آوارۂ وطن بھی امت ہندیہ کے نقطۂ نظر اور نیز دستور اساسی کے متعلق اپنے خیالات اپنے بزرگوں کے حضور میں پیش کرنے کا شرف حاصل کرے، اور امید کرتا ہے کہ اس پر نہ صرف اپنے بلکہ پرائے بھی ٹھنڈے دل سے غور فرمائیں گے کیوں کہ میری معروضات کی غرض امت ہندیہ کی آزادی کے ساتھ یہ بھی ہے کہ اس وقت صلح عناصر مختلفۂ ہندیہ کا ایسا حل تجویز کر کے بروئے کار لایا جائے جس سے عناصر ہند کا اتحاد پائدار اور خوشگوار ہو جس سے نہ صرف ہندستان بلکہ تمام مشرق و مغرب امن و سلامتی کا گہوارہ بن سکے.

یہ حقیقت نہایت روشن ہے کہ ہندستان کی مغلیہ زمانہ کی وحدت شاہان مغل کی اور موجودہ وحدت برطانیہ کی قوت کی آثار سے ہیں. ہندستان کے اندر مختلف عناصر موجود ہیں جن کے عقائد، سیاسی آمال (مقاصد) اور نسلیں اور زبانیں، معاشی قوانین باہم متبائن (الگ الگ) اور بالکل متضاد ہیں. اور اپنی قوتوں اور جغرافی اہمیت کے اعتبار سے اس قابل

نہیں ہیں جوایک دوسرے کی سیادت قبول کرلیں.

ان عناصر میں سے ہندستان کی تین اہم جماعتوں کا موجودہ اتحاد جس کی ہر کھڑکی سے اختلاف بھی منھ نکالے ہوے ہے صرف ایک عارضی اور نہایت عارضی احتیاج (وقتی ضرورت) پر مبنی ہے: وہ برطانی تسلط میں ان کا اشتراک ہے.

آج ہندستان کے جو خطے فرانس وغیرہ کے قبضہ میں ہیں ان میں موجودہ تحریک سے دلچسپی نہ ہونا میرے اس خیال کی دوسری دلیل ہے.

برطانیہ کا موجودہ قبضہ اگر ہندستان سے اٹھ جائے تو ان عناصر میں کوئی ایسی مشترک چیز باقی نہیں رہتی جوان کے اختلاف کا گلا گھونٹ کر اتحاد عام کی ضمانت کر سکے.

کانگریس نے - جس نے مدت سے آل انڈیا ہونے کا طرہ بھی اپنے سر پر لگا رکھا ہے اور گاندھی جی جیسے ریاضت کش اور تارک الدنیا مہاتما بھی اسے نصیب ہیں - مسلمانوں، سکھوں کے مطالبات کا اس کامل احتیاج کے زمانہ میں کتنا احترام کیا یہ ہم پر آشکارا کرتا ہے کہ ہندستان کے ہر عنصر کا دعوای اتحاد چنداں حقیقت نہیں رکھتا.

اس لیے تمام رہنماؤں پر فرض ہے کہ اس حقیقت باہرہ سے آنکھ بند کر کے ہندستان کو طویل کشت وخون اور بے امنی کے گرداب میں نہ دھکیلیں، بلکہ لازم ہے کہ جو فیصلہ کیا جائے اور اپنی اپنی جمعیتوں کے لیے جو نقطۂ نظر پیش کیا جائے وہ اس حقیقت کی روشنی میں اور اس سے پیدا ہو سکنے والے نتائج کی موافقت میں ہونا چاہیے، اور اس کے مخالف ہر تحریک کے سنہرے سے سنہرے اعلان اور ارادہ کو مہلک اور فنا خیز سمجھنا چاہیے.

سو سال پہلے

مولانا محمد میاں منصور انصاری وہ ممتاز فاضل دارالعلوم دیوبند تھے جو بیک وقت نظریہ آفریں سیاسیاتی مفکر (political scientist) بھی تھے، سیاست داں بھی تھے، حربی مدبر بھی تھے، سفارت کار بھی تھے، سیاسی مبصر اور تجزیہ کار بھی تھے؛ جنہوں نے تقریباً سو سال پہلے ایک تہائی مہذب دنیا کی سیاسی سیاحت کی تھی؛ حجاز، یاغستان، افغانستان، تاجکستان، ازبکستان، روس، ترکی کے سفر کئے،، مصر اور لیبیا کے ہم عصر لیڈروں سے ان کی ملاقات تھی؛ سیاسی یا فکری غلامی میں مبتلا مسلم دنیا اور جنوبی ایشیا کی مسلم سیاست اور ہندو سیاست پر ان کی گہری نظر تھی. انہیں ملک میں سرگرم مختلف معاشرتی گروہوں کے مقاصد اور نشانوں کا اندازہ تھا. اس دور کی سیاسی صورت حال پر ان کے تجزئے اور تبصرے ایک عہد کی حیرت انگیز عکاسی کرتے ہیں. سچ یہ ہے کہ دارالعلوم دیوبند ان جیسا سیاسی مفکر دوبارہ نہ پیدا کر سکا.

خلافت تحریک کے قائدین مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی جوہر کی والدہ آبادی بانو بیگم ملک میں بی اماں کے عرف سے مشہور اور تحریک خلافت کی ممتاز حمایتی تھیں. ان کا انتقال ۱۳ نومبر ۱۹۲۴ کو ہوا تو مولانا محمد میاں منصور انصاری نے تعزیتی خط میں مولانا شوکت علی کی توجہ جن قومی امور اور ہندستانی سیاست پر اثر انداز ہونے والے بین الاقوامی رابطوں پر مبذول کی ان کے نتائج کم و بیش وہی نکلے جن کی پیش گوئی ۱۹۲۴ کے آخری ہفتوں میں اس خط میں کر دی گئی تھی.

آزادی کے بعد ہندستان جن حالات سے گزر رہا ہے اور اس کے مسلم باشندوں

کے ساتھ جو سلوک روا رکھا گیا ہے اسے چند آنکھیں سو سال پہلے دیکھ رہی تھیں.

مولانا منصور انصاری نے مولانا شوکت علی کے نام اس مکتوب میں مولانا محمد علی جوہر کے بعض مقالات یا بیانات پر تشویش ظاہر کی تھی جو افغانستان اور قادیانیوں کے سلسلہ میں ان کی طرف سے سامنے آئے تھے. افغانستان میں بچہ سقہ کے بعد نادر شاہ کی حکومت قائم ہوچکی تھی اور وہ حکومت ہندستان اور ہندی مسلمانوں کے معاملہ میں نرم رویہ رکھتی تھی. قادیانیوں کا معاملہ جداگانہ تھا. وہ ایک شدید داخلی تضاد کا شکار تھے اور ہیں. انہیں اسلام کی اصولیت سے شدید اختلاف بھی تھا اور مسلمان ہونے کا گمان بھی. وہ ایک اساسی دینی مسئلہ تھا. گاندھی جی کو اگر قادیانیوں سے دلچسپی تھی تو وہ سیاسی معاملہ تھا جس کی ضرب براہ راست مسلمانوں پر پڑتی تھی. یہ نکتہ اگر گاندھی جی کے علم میں نہیں تھا تو ضرورت تھی کہ انہیں اس سے باخبر کیا جاتا، اور اگر یہ حقیقت ان کے علم میں تھی تو قادیانیوں سے ان کی دلچسپی مسلمانوں کو کانگریس کے سلسلہ میں اپنی پالیسی پر نظر ثانی کرنے میں آزاد کردیتی تھی. لہٰذا یہ بات گاندھی جی کے علم میں لائی جاتی. اس کو سیاست کہا جاتا ہے.

مولانا منصور انصاری نے اپنے مکتوب کے بین السطور میں یہی بات علی برادران کو سمجھائی تھی. مولانا محمد علی جوہر کے رخ میں تبدیلی آئی تھی اور گاندھی جی سے ان کے اختلافات کھل کر سامنے آگئے تھے. بظاہر یہ تبدیلی اسی مکتوب کی بنا پر آئی تھی.

اس زمانہ میں جمعیۃ علماء ہند ایک نئی اور آزاد جماعت تھی. مسلمانوں کی طرف سے تقسیم کا مسئلہ ابھی پیدا نہیں ہوا تھا اس لئے ملک کی مسلم قیادت بھی متحد تھی اور اس قیادت پر مسلمان بھی سیسہ پلائی دیوار تھے. اس دور میں جمعیۃ علماء ہند کی قیادت مولانا مفتی کفایت اللہ، مولانا معین الدین اجمیری، مولانا احمد سعید دہلوی کے پاس امانت تھی.

یہ خط جو آئندہ صفحات میں پیش کیا جارہا ہے اس کے کچھ صفحات غائب ہیں لیکن موجودہ جارحانہ فسطائی طاقتوں کے متعلّق کم وبیش نوے سال قبل مولانا منصور انصاری نے

جن خیالات کا اظہار کیا تھا وہ آج سب کے سامنے عیاں ہیں.

بے خبر نہ تھے

مولانا شوکت علی کے نام مکتوب

میں نے حضرت استاذی واستاذ العالم مولانا شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے سانحۂ وفات کا حال تاشکند میں سنا تھا طبعی اس کا صدمہ بہت ہونا تھا، ہوا، لیکن قبلہ بی اماں کے بابرکت وجود سے ایک گونہ طمانیت حاصل تھی. اب انہوں نے بھی جوار رحمتِ الٰہی میں جابسیرا کیا. انا للہ وانا الیہ راجعون.

اس وقت آپ دونوں بھائیوں کی سلامتی مرہم دل تھی مگر ساتھ ہی اندیشہ بھی دامن گیر تھا کیونکہ بعض علمائے روحانیات کے خیال کے مطابق آپ حضرات کے صراط مستقیم پر الوالعزمانہ اقدامات صرف حضرتہ مرحومہ کی نگہداری ورہبری کے برکات تھے.

آج جناب مولانا محمد علی صاحب کی قلمی راہ (تحریر) نے جو قادیانی اور افغانی مسئلہ کے متعلق بلاضرورت بلکہ خلاف ضرورت اختیار فرمائی گئی اس عقلی اندیشہ کو واقع کر کے دکھا دیا.

کس قدر حیرت اور حسرت کا مقام ہے کہ حضرتہ مرحومہ کا اثر اتنی جلد ایک ایسے قلب سے دور ہو گیا ہے جو اس کے سب سے زیادہ قریب اور سب سے زیادہ زیر تربیت رہا ہے.

میں ایک آوارۂ ہند اور آپ کی نیک نامی وعزت ابدی کا حامی ہونے کی حیثیت سے توجہ سامی کو اس فروگذاشت کی طرف مبذول کرنے کا شرف حاصل کر کے کامیابی کا امیدوار جناب حق تعالیٰ سے ہوں.

آنجناب حضرتہ مرحومہ کے جانشین خاص ہیں اور اب آپ کا سایہ جناب مولانا (محمد علی) کے سر پر بی اماں کی جگہ لے چکا ہے. آپ کا خاص فرض ہے کہ اپنے چھوٹوں کو مسلمانوں سے اسی طرح جدا نہ ہونے دیں جس طرح مرحومہ کا تعامل رہا ہے.

مولانا، آپ کو قبول فرمانے میں تامل نہ ہوگا کہ جزئیات مسائل میں پڑنا آج محرومی کا باعث ہوسکتا ہے. اس لیے یہ آپ جیسے حضرات کے لیے بہت ہی معیوب بات ہے اور (آپ کو) اس عام اعتراض کا نشانہ بنانے والا ہے جو آج تک ایسے گروہوں کی نسبت کیا جاتا رہا ہے.

یہ حقیقت واضح ہو چکی ہے کہ افغانستان نے جو کچھ کیا وہ اوامر شرعیہ کی بجا آوری تھی، اور اعلی حضرت (نادر شاہ) غازی کا مقصد زیادہ تر حفاظت مذہبی ہے. تمام علمائے افغانستان و ہندستان اس کی ضرورت پر متفقہ طور پر زور دیتے ہیں اور افغانی اجرائے احکام کی حمایت میں ہر ممکن سعی صرف فرما رہے ہیں. کیا اس صورت میں کسی کا اس کے خلاف میں کھڑا ہونا اخروی ملامت کا باعث نہیں اور کیا یہ بی اماں مرحومہ کی روح مبارک کے لیے سوہان ہو کر ان کی نام نامی کے موت کا باعث نہ ہوگا.

دینی نتائج مدہشہ کے علاوہ جناب محترم سیاسی نقطۂ نظر سے ملاحظہ فرمائیں.

جس زمانہ میں مصطفے کمال پاشا کے ہر عیب اور کفر آگیں حرکت سے اغماض برتنا سیاسی نقطۂ نظر سے محمود خیال کیا جاتا ہے، عین اس وقت افغانستان کے مفتیٰ بہ (فتویٰ پر مبنی) عمل کی علانیہ مخالفت کیسے جائز ہوسکتی ہے. جناب مولانا محمد علی صاحب کے اس تخالف احوال کی وجہ سمجھنے سے میں عاجز ہوں. ممکن ہے مولانا کا یہ فعل مہاتما گاندھی کی تقلید اور ہندو ہم وطنوں کی رضا جوئی کے باعث ہو. لیکن اس رضا جوئی و تقلید کے لیے اس قسم کی حرکت کو ایک مسلم دماغ کبھی تجویز نہیں کرسکتا.

میں ہندستان سے دور ہونے کی وجہ سے وہاں کے اصلی حالات کے علم کا دعوی

نہیں کرسکتا، تاہم بعض باتیں باہر پڑھنے والوں کو حاصل ہیں جن سے وہ خارجی سیاسی پروگراموں کا زیادہ صحیح اندازہ لگا سکتے ہیں. اس لیے اگر جناب کی خدمت میں افکار ذیل عرض کروں تو بے جا نہ ہوگا.

آج مہاتماجی اپنی تلون مزاجی کا ثبوت دے رہے ہیں لیکن میرے نزدیک ان کا متلون ہونا اسی طرح غلط ہے جیسا کہ آسمان کے ستاروں کا بے ترتیب ہونا.

مولانا، ہندوؤں کے بعض بگلہ بھگت اور دور اندیش افراد (اشارہ راجہ مہندر پرتاپ وغیرہ کی طرف ہے) عرصہ سے اتحاد اسلام کی حرکت (تحریک) میں جرمن اور ترکیہ کے دست و بازو بن کر کام کرتے رہے ہیں اور اس حرکت کے ذیل میں ان کو مسلمانوں کی کمزوریوں پر مطلع ہونا تھا جس چھان بین سے وہ کماحقہ فارغ ہو چکے ہیں. آج ان کو وثوق حاصل ہے کہ موجودہ مسلمانوں کی (تحریک آزادی کی) یہ بیل منڈھے چڑھنے والی نہیں، لہٰذا یہ ہوا ہندو جاتی کے واسطے بالکل خطرناک نہیں ہے (اس کے وجوہ کسی وقت بیان ہو سکتے ہیں). اس وقت ان کو صرف یورپ اور امریکہ سے کھٹکا ہے. اور اس خطرۂ دوطرفہ کے لیے وہ کافی انتظام کر چکے ہیں.

میرے نزدیک ان کا پروگرام یہ ہے کہ خطرۂ نصرانیت سے دو دو ہاتھ کرنے کے وقت وہ مسلمانوں کی امداد حاصل نہ کریں کیونکہ اس سے وہ (مسلمان) قوت حاصل کر لیں گے اور چونکہ ان (مسلمانوں) کی قوت خار دلدوز کی قوت کے مرادف ہے اس لیے بعد میں اس کو دل سے نکالنا بہت مشکل کام ہوگا، بلکہ بسا ممکن ہے کہ وہ (مسلمان) رہی سہی نصرانی قوتوں سے ساز باز کر کے ہندوؤں کو مہلک صدمہ پہونچائیں. پس ضرور ہے کہ لگے ہاتھوں مسلمانوں کا خاتمہ بھی کر دیا جائے. اس کام کے لیے انہوں نے دولت بلشویک روسیہ سے کامل ساز باز کر لی ہے. اس کا مقصد ہندستان سے افغانستان کا خطرہ کم کرنا ہے، یعنی جب ہندو حرکت (تحریک) شروع ہو تو روس افغانستان کو ہندستان میں استفادہ سے روکے.

میں نے اس قسم کی ایک اتفاقیہ تصریح راجہ مہندر پرتاب سے خود سنی ہے.

ہندوؤں سے میری مراد بدھ ازم سے ساز باز ہے جس کا مرکز آج جاپان ہے. جاپان کی مالی اور آہنی قوت اور اس کی خاموش اور نہایت دانشمندانہ مہیب تیاریاں عام ہندوؤں کو مسلح کرنے اور حرکت میں لانے کے قابل ہیں. چین اور ہندستانی ہنود کا دماغ، روپیہ اور نفوس اس کے آلۂ کار اور روس کی وحشی سرخ فوج اور تمام وسائل نقل و حرکت اس کی پشت پناہی کریں گے.

عالمی سیاست کے اس تجزیہ کی تصدیق دوسری عالمی جنگ کے دوران

جاپان کے ساتھ سبھاش چندر بوس کے فوجی روابط سے ہوتی ہے.

یہ حالت اور پروگرام بہت زیادہ مدہش (دہشت انگیز) ہے. اس وقت آپ کے ہندو بھی آپ کے گم کرنے کا خیال کریں تو اسپین کی تاریخی نظیر اس کی ہمت افزائی کے لیے موجود ہے کہ موجودہ زمانہ کی طرح مختلف، غیر منتظم اور کاہل اور عیاش مسلمانوں کی کروڑوں کی تعداد کو ایک چھوٹی سے قوم نے بیک بینی و دو گوش یورپ کی سرحد سے نکال دیا.

اس بنا پر مہاتما جی کو بھی اسی خیال کا ایک آدمی تصور کرتا ہوں. ہندستانی ہنود کو اپنے عالمگیر پروگرام کو مرتب کرنے کے لیے وقت کی ضرورت تھی. اس کے لیے مہاتما جی نے مسلمانان ہند کو غافل رکھنے میں ''ٹرارولوں اور بھیجا کھاؤں'' والی مثال پر عمل کیا، اور مہندر پرتاب نے بیرونی مسلمانوں کو سبز باغ دکھا کر ان کے پورے راز اور حقیقت معلوم کر کے یاروں کو نفع پہنچایا، اور مدن موہن (مالویہ) نے ہندوؤں کی صحیح رہنمائی کی، اور راش بہاری بوس نے چین و جاپان کو اور (ایم. این.) رائے نے روس کو تیار کیا.

آج ہندوؤں کا مجوزہ پروگرام مکمل ہو چکا ہے اور وقت آ گیا ہے کہ اب وہ یورپ (انگریزوں) کے ساتھ مسلمانوں کو بھی ہندستان سے نکال دیں اور افغانستان اور ایران میں مغلوب و محکوم بنا لیں.

آپ کے مہاتما جی کا قادیانی مسئلہ پر قلم فرسائی کرنا میرے نزدیک اس مجوزہ پروگرام کے مطابق ہندو سنگھٹن کی طرف پہلا قدم ہے، کیونکہ اب ان کو مسلمانوں کے ٹٹرارولنے کی زیادہ ضرورت نہیں رہی.

ہاں، جاپان (بدھ ازم) اور روسیہ (سوویت روس/بلشویزم) ایک زمانۂ دراز کے لیے باہمی طبعی حلیف ہیں کہ ان دونوں کے لیے یورپ اور مسلمان دونوں خطرہ ہیں. ممکن ہے کہ اس اتحاد مساوی کے زمانہ میں بلشویزمی پروپگنڈا ہندوازم کو اپنے اندر ہضم کر لے اور یا بصورت عدم ہضم ان خطرات سے فارغ ہونے کے بعد ان میں تصادم واقع ہو. میری راے میں احتمال اول غالب ہے۔ **والغيب عند الله الحليم الحكيم**

اگر فرض کر لیا جائے کہ ایسا نہیں بلکہ اس وقت ہندوازم اور بلشوازم پان اسلام ازم کو بھی اپنا حلیف بنائے گی و نیز مہاتما جی شخصاً (ذاتی طور پر) فریب کار نہیں ہیں تب بھی ان کی لیڈری پر (بعض مسلم جماعتوں اور لیڈروں کا) اس قدر اصرار کہ کوئی جزئیہ بھی اس کی اقتدا (پیروی) سے خالی نہ جائے خواہ اس سے کتنے ہی مذہبی اور سیاسی نقصان پیدا ہوں آپ حضرات جیسے اکابر کے شان کے کسی طرح مناسب نہیں ہے.

مجھے جناب مولانا محمد علی صاحب سے سیاسی رہبری کی آپ سے بھی زیادہ امید تھی، مگر ان کی اس حرکت سے دل بیٹھا جاتا ہے. للہ آپ اس وقت بی اماں مرحومہ کا فرض ادا کر کے ان کو اس خطرناک راستہ سے باز رکھیں جس پر وہ جا رہے ہیں کیونکہ کام اور اشخاص کا بننا بہت ہی دشوار ہے اور بگڑ جانے میں کوئی دیر نہیں لگتی.

مجھے امید ہے کہ آپ میری گمنامی پر نظر نہ فرما کر میری اس جسارت کو اس دلی درد مندی پر محمول فرمائیں گے جو آپ دونوں حضرات سے آپ کی خدمات کی بنا پر رکھتا ہوں.

فرمودات منصور

■ ہند سے میری آوارگی ایک احتجاجی صورت رکھتی ہے. اس صورت کی تبدیلی کے لئے میرے خیال میں ایک تبدیلی کی ضرورت ہے جو ابھی تک عمل میں نہیں آئی. اگر چہ مجھے اس کا بھی پورا احساس ہے. پر اس احتجاج سے استفادہ کا خیال ہند میں کسی کو بھی نہیں، بالخصوص ہماری مست قوم کو تو قطعاً نہیں.

باب واپسی کی مساعی. مولانا محمد طارق قاسمی کے نام خط

■ میرے بلانے کا اولین موقع وہ تھا جبکہ ملک نے متحدہ طریقہ پر اور اصرار کے ساتھ حضرت مولانا شیخ الہند قدس سرہ کا معاملہ طے کیا تھا. معلوم نہیں بزرگوں اور ملک نے کن علل کی بنا پر ہم چھوٹوں کو بھلایا. بہر حال یہ مناسب ترین موقع اب ہاتھ نہیں آ سکتا.

باب واپسی کی مساعی. مولانا محمد طارق قاسمی کے نام خط

■ جنگِ عظیم کے زمانہ میں سلطنت عثمانیہ نے غالب پاشا کو اختیارات کلی دے دیئے تھے کیونکہ مکہ معظّمہ مرکز اسلام ہے. امید تھی کہ غیور مسلمان یہاں جمع ہوں گے. اسی بناء پر حضرت مولانا شیخ الہند نے بندہ کے ذمہ فریضہ مقرر فرمایا کہ عالم اسلام کی قوی ترین جگہ ہماری دسترس ہونی چاہیے اور وہ افغانستان ہے.

باب صبر آزما مرحلے

■ یہاں (کابل میں) سفراء ترک و جرمن پہنچے. ان کا اعزاز پورا ہوا لیکن مقصد میں ناکام رہے. وجہ یہ ہے کہ ترکی کا فرض تھا کہ ایام ناطرفداری میں ایران و افغانستان سے ان کی ضروریات معلوم کرتا، اس کے پورا کرنے کی کوششیں کرتا اور حسب احوال معاہدہ دوستی کرتا. افغانستان نہ تو بڑی جنگ میں شرکت کا سامان کاری رکھتا ہے اور نہ ہی کوئی بڑی دولت اس کے نقصانات کے تلافی کی ذمہ دار ہے. اس لیے شریکِ حرب نہیں ہو سکتا. اگر ضروری افسران، اسلحہ، روپیہ دیا جائے اور بصورت غلبہ کفر امداد و اعانت کا عہد نامہ کیا جائے تو شرکت کے لیے تیار ہیں.

باب جہد ریشمی. مولانا منصور انصاری کا ریشمی خط شیخ الہند کے نام

■ بندہ جس وقت ہندستان پہنچا غوغا تھا کہ حضرت مولانا مدظلہ کو مع کل جماعت کے انگریز نے عدن میں قید کردیا. اب یہ مشہور ہے کہ شریف مکہ نے خدانخوستہ حضرت مدظلہم کو گرفتار کر کے انگریزوں کو دے دیا. خداتعالیٰ سے اس کی امید نہیں.

مولانا حسین احمد مدنی کے نام خط

■ عوام کا اختلاف خواص کے اختلاف کا آئینہ دار ہوتا ہے اور اس وطن میں خواص صرف دو طرح کے ہیں (یعنی علمائے کرام ودانشوران عظام). چونکہ ان دونوں گروہوں کے بیچ کی مخاصمت بدقسمتی سے عرصۂ دراز سے جاری رہ کر اس وطن کے عوام کو دو حصوں میں تقسیم کر چکی ہے اس لئے ان کا علاج خواص کے گروہ (مشائخ وخوانین وطن) کے اتحاد کے بغیر ممکن نہیں ہے.

حاجی ترنگ زئی کے نام خط

■ اس وقت اگر انگریز اسلامی علاقوں پر قبضہ نہ بھی کرے تو بھی ان کی خفیہ سازشوں سے بچنا بغیر اتحاد قومی کے حفاظت کرنا ممکن نہیں ہے.

حاجی ترنگ زئی کے نام خط

■ امید رکھتا ہوں کہ افغانستان میں تبدیلی آئے گی. تو بندہ اپنی پوری قوت کے ساتھ تحفظ اسلام کی خدمت اپنے کندھے پر لے گا لیکن اسے خلاف توقع سمجھ رہا ہوں کیونکہ اس وطن کے خواص کا باہمی اختلاف اس حد تک پہنچ چکا ہے کہ اس کی امید تقریباً ناممکن ہے. وطن کی حالت یہ ہے کہ لامرکزی اقوام خود اجتماعی کی قابلیت قطعاً نہیں رکھتے ہیں. یہ لوگ ایک دوسرے کو برباد کرنے کے لئے خوب دوستی رکھتے ہیں اس میں انہیں ید طولیٰ حاصل ہے حالانکہ اس کو حاصل کرنے کی ضرورت نہیں تھی اور اجتماعیات میں بھی ان کے تمام امور ترقی کے محتاج ہیں.

خط بنام بادشاہ گل خان ابن حاجی ترنگ زئی

■ میں پوری کوششوں کے باوجود مرکز میں قوت پیدا نہیں کر پایا. اور ان کوششوں کا حاصل صرف یہ ہے کہ چند دوست اپنے کام کے خدمت کرنے والے ہاتھ آئے ہیں ان کی قوت اور کوشش بیکار نہیں جاسکتی کہ وطن میں اتحاد جو کہ ہمارا قومی فریضہ ہے اسی سے پیدا ہوگا. اللہ وطن کے امین ہیں. بظاہر وطن اہل علم کے باہمی اختلافات اور ان کی آپسی دشمنی کی وجہ سے غیروں کے قبضہ میں

جا رہا ہے. بعض لوگ حد سے بھی تجاوز کر گئے، بعض لوگ ٹانگ اڑا کر خدمات اجتماعی کی قابلیت کو کھو رہے ہیں اگر کسی کے اندر کسی حد تک کوئی صحیح جذبہ ہے تو وہ اپنے دوستوں کے طعن وتشنیع سے عذاب میں مبتلا ہو جاتا ہے.

خط بنام بادشاہ گل خان ابن حاجی ترنگ زئی

■ مجموعۂ وطن ایک مٹھی بالوریت کے مانند ہے کہ باہمی نظام کی پختگی کی صلاحیت نہ رکھنے کی وجہ سے طاقتور دشمن کے سر پر ضرب مارنے کی قابلیت ہرگز نہیں رکھتا.

باب شمال/ خط بنام بادشاہ گل خاں ابن حاجی ترنگزئی

■ مشائخ کے لنگروں نے اول تو بلند مرتبہ روحانیت کو مادیت کی پستی میں گرا کر ان کو بیکار بنا دیا ہے دوسرے یہ کہ روحانی قیادت نے لنگر کے کام کو نان دہی کی مجبوریوں میں گرفتار کر کے (خود کو) اس بات پر آمادہ بنا دیا ہے کہ وہ دشمن سے بھی خواہش ولالچ کا چہرہ نہ پھیریں. تجربہ کار لوگوں کے لیے اس مصیبت کبریٰ سے چشم پوشی ممکن ہے؟

امیر نادر خان کے نام تحریر

■ علاقہ آزاد میں اپنی کامیابی کے لیے برطانیہ کی بنیادی سیاست یہ ہے کہ وہ ایک علاقہ میں اپنا اثر قایم کر کے، ایک ''کام کا آدمی'' حاصل کر کے، ایک اہم علاقہ کا واحد منظّم مرکز بنا کر، اس کے ذریعہ دولت عُلیہ (افغانستان) کے اثر اور اقدامات کو اس علاقہ سے زایل کر دیتے ہیں.

امیر نادر خان کے نام تحریر

■ ہمارے دنیا دار روحانی پیشواؤں نے سوائے اس کے کہ بعض اسلامی مرکزوں کی تکفیر کریں یا اپنے مسلسل تکفیری گیتوں سے ملی حکومت کو مردان کار کے لیے اجنبی بلکہ مخالف بنا کر ناکامی کے کنویں میں دھکیل دیں، اور کوئی کام آگے نہیں بڑھایا.

امیر نادر خان کے نام تحریر

■ سو سال سے جو ہم نے کیا وہ تضیع وقت اور خلاف واقعہ خوش اعتقادیوں کا پروپگنڈا تھا. اور یہ کہ اسلامی بقا اور ترقی کے لئے اول تنظیم داخلی اور پھر تنظیم صحیح خارجی ہے

باب عالم اسلام/ انقلاب ترکی-ماسٹر محمد شعیب قریشی کے نام خط

■ میری آوارگی کا حاصل صرف ایک خیال ہے کہ سو سال سے جو ہم نے کیا وہ تضیع وقت اور خلاف واقعہ خوش اعتقادیوں کا پروپیگنڈا تھا. اور یہ کہ اسلامی بقا اور ترقی کے لئے اول تنظیم داخلی اور پھر تنظیم صحیح خارجی ہے جس کے زور سے ہم اپنے برادران یوسف میں رہ کر مغرب سے خلاصی پا سکیں اور مشرقی خطرات کے مقابلہ میں مغلوب نہ ہو سکیں.

باب عالم اسلام/ انقلاب ترکی - ماسٹر محمد شعیب قریشی کے نام خط

■ بندہ حالت عین ناتجربہ کاری میں وطن سے آوارہ ہوا. دنیا کے ایک حصہ میں رنگا رنگ حالتوں میں پھرا. عزتیں دیکھیں. ذلتیں اٹھائیں. بیابانوں، پہاڑوں کی پیادہ منزلیں کاٹیں. ریگستانوں کو گھوڑوں کے پیروں سے روندا. اچھے، برُے، چھوٹے بڑے لوگوں کو دیکھا. مسلمانوں کی بڑی چھوٹی دور ونزدیک قوموں کا ان کے اندر رہ کر تجربہ کیا. ملکوں کے انقلاب عروج وزوال اپنی آنکھوں سے دیکھے. بلند آہنگ دعوے سنے اور پھر مدعیوں میں رہ کر ان کے دعووں کو پرکھا. علے الخصوص اس قوم کو جو عالم اسلام کی مرکز المراکز ہے جا کر دیکھا نہ صرف جا کر دیکھا بلکہ مدتوں اس کے اندر ایک اس کے ذاتی فرد کی حیثیت سے گھس کر دیکھا اور اس قدر زرین تجربات کے مواقع عطا ہوئے کہ کسی دوسرے کو نصیب نہیں ہوئے. ماسکو سفارت فوق العادہ افغانستان میں ایک معتمد کی حیثیت سے پہنچا. انقرہ میں بھی رسمی عضو سفارت تھا بلکہ ایک ماہ سے زائد وکیل سفیر رہا. وہاں کی پارٹیوں میں اس کے اعضا کی طرح مقبول رہا. بخارا، تاشقند، فرغانہ، باشقر وترکستان سے تعلق رہا. آج رئیس بخارا اور ترکستان کے سرگرم خفیہ کارکن اس آوارہ کے شخصی دوستوں میں سے ہیں. قفقاز (آذربیجان اور داغستان) کے غیور مسلمانوں سے سابقہ رہا. اعلیٰ حضرت شیخ (احمد) السنوسی کے سے بےنظیر خادم اسلام ذات سے راز داری رہی، اور اس وقت بھی یاغستان (مہمند، باجوڑ، دیر، سوات) میں دوست رکھتا ہوں اور افغانستان میں بھی یہاں کی پارٹیاں بفضلہ عزت واعتماد کی نظر سے دیکھتی ہیں.

اس تمام افضال خداوندی کے باوجود چونکہ بےسُر ہوں عالم اسلام کی خدمت کے ہاتھ پاؤں نہیں رکھتا، انا للہ و انا الیہ راجعون، اِنَّمَا اَشکُوا بَثِّي وَحُزنی اِلٰی اللّٰہِ.

ہندستانی رہنماؤں کے نام ایک مکتوب عام

■ آج کی انسانیت انس اور انسانیت سے عاری ہے. متمدن قومیں تک بھی بدترین درندوں سے زیادہ وحشی اور باران ہلاکت کے چوٹی کے دیوتا ہیں. تمام متمدن اقوام اپنی پوری دماغی اور جسمانی، مالی اور فنی قوتوں کو اس ایک شرمناک مقصد اور وحشیانہ ہدف نظر پر وقف کئے ہوئے ہیں کہ دنیا، اس کے اہالی، اس کی آبادی اور سرسبزی کو جلد سے جلد تباہ و برباد کرنے کی کیا صورت ہے. میرے درد بھرے دل نے مجھے آمادہ کیا کہ اس انتہائی نکبت و زوال بشری کے ازالہ کی تدبیر سوچی جائے. دل کی آواز سے متنبہ ہو کر گہری سوچ کے بعد نظر آیا کہ اس بے سابقہ بربریت کی یگانہ علت قومیت پرستی کے فتنہ انگیز فلسفہ کی حاکمیت ہے. اس کے بعد میرے قلب پر وارد کیا گیا کہ اس عالم تباہ زہر کا تریاق صرف و صرف حکمت حکومتی قرآنی کی تدوین اور اس کی تبلیغ میں ہے

ہندستانی رہنماؤں کے نام ایک مکتوب عام

■ قابل غور و دقت صرف یہ امر ہے کہ (سید احمد شہید کی تحریک مجاہدین کے) اس نظام عمل کی کامیابی سے پہلے ناکام بلکہ محو ہو جانے کے عامل و اسباب کیا ہیں.

ہندستانی رہنماؤں کے نام ایک مکتوب عام

■ ایک ناکام تحریک اور ناکام جماعت کی تاریخ اور ناکام رہنما کے سوانح حیات میں اگر اسباب ناکامی پر پوری روشنی نہ ڈالی جائے تو اس سعی تاریخی و سوانح کو ناکام تصور کرنا پڑے گا.

ہندستانی رہنماؤں کے نام ایک مکتوب عام

■ مسلمانان ہند کی عظیم الشان امدادوں کے بعد مجھے سخت تعجب تھا کہ مصطفٰے کمال پاشا نے ان کی رائے کو ٹھکرا کر کیوں اقتدار کو خلافت سے چھین لیا. مگر میرا تعجب جناب منیر بک مشاور قانونی وکالت (وزارت خارجیہ) انقرہ کی ملاقات کے بعد دور ہو کر معلوم ہو گیا کہ خلافت کی بے اقتداری میں مسلمانان ہند کی امداد بھی مصطفٰے کمال پاشا کی پشت پناہ رہی ہے.

ہندستان کے ملی اخبارات میں شائع شدہ ایک تحریر

■ جناب منیر بک مجلس لوزان (Lausanne Conference 1922-23) میں عصمت (انونو) پاشا کے ساتھ مشاور قانونی کی حیثیت سے آخر تک شریک رہے ہیں. عصمت پاشا، جبکہ مجلس اول لوزان کے (اجلاس) میں تشریف لے گئے تھے تو یہی منیر بک ہمارے لندن سے جانے

والے مسلمان ہندستانیوں کے ترجمان بھی رہے تھے. جب یہی انقرہ سے لوزان کی دوسری کانفرنس میں جارہے تھے تو میں نے ان سے اثنائی (باہمی) ملاقات میں کہا کہ حکومت کمالی نے خلافت کو بے اقتدار کردیا ہے. یہ ٹھیک نہیں ہوا اس سے ہندستان میں بہت برا اثر پڑے گا منیر بک نے میرے اس فقرہ پر حیرت کا اظہار کر کے کہا کہ ہم پیرس میں مسلمانان ہندستان سے (جو کہ لندن سے آئے تھے) مفصل گفتگو کر کے فیصلہ کر چکے ہیں. مسلمانان ہند نہ صرف خلافت وسلطنت کی تفریق کو نہایت گرم جوشی کے ساتھ سراہتے ہیں بلکہ وہ اس مسئلہ میں مصطفٰے کمال پاشا کی امداد کا آخری دم تک وعدہ بھی کرتے ہیں.

ہندستان کے ملی اخبارات میں شائع شدہ ایک تحریر

■ شاہ حجاز (حسین، شریف مکہ) تو، اس وقت کہ مصطفٰے کمال پاشا کو اس قسم کا خواب وخیال تک نہ آتا تھا، عظیم الشان جہاد فرما کر عرب کو خلافت سے نکال چکے ہیں اور ایک ہاشمی دولت قائم فرما کر نہ صرف حجاز کے بار سے بلکہ عراق، یمن، عسیر، نجد، سیریا (شام) وفلسطین وغیرہ کے جھگڑوں سے خلافت مبینہ کو نجات دلا چکے ہیں.

ہندستان کے ملی اخبارات میں شائع شدہ ایک تحریر

■ شریف حسین) خلیفہ عبدالمجید خاں کی خلافت پر بیعت رکھتے ہوئے ترکیہ کو ان کے ہاتھ سے نکال کر خلافت کو اس سے نجات دلاتے ہیں اور ان کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو یونان کے ساتھ خونریز جنگ صرف اس لئے نہ تھی کہ ترکی سے یونان کا اخراج ہو بلکہ اس جنگ میں ایک مقصد مہم یہ بھی مضمر تھا کہ ترکی سے خلافت کا اخراج بھی یونان کے ساتھ ساتھ کیا جائے

ہندستان کے ملی اخبارات میں شائع شدہ ایک تحریر

■ جمہوریت اسلامیہ میں قانون اسلام اس کا اساسی قانون ہوتا ہے. اس جمہور کے اختیارات اسلامی احکام کے ساتھ الی الا بد مقید ہیں مگر دوسری جمہورتیں اس قید سے بالکل آزاد ہیں. جمہوریت کی ان دونوں قسم (جمہوریت مقید اور جمہوریت غیر مقید) کے علاوہ ایک تیسری بھی قسم ہے جس کو جمہوریت شخصی کہنا زیبا ہے.

ہندستان کے ملی اخبارات میں شائع شدہ ایک تحریر

■ ترک ملت اپنی صفائی حال میں عام اسلامی ملتوں جیسی پاکیزہ ہے. اس کی نیک نہادی، اس کا حسن اعتقاد، اس کا عدیم النظیر ایثار، ثبات، اس عظیم الشان عسکریت میں کوئی شک نہیں.

ہندستان کے ملی اخبارات میں شائع شدہ ایک تحریر

■ یہ عام اسلامی ملتوں کا حقیقی مرض ہے کہ جس قدر ان کے عوام اچھے ہیں اس سے زیادہ ان کے رہنما برائیوں کے مجسمے ہیں.

ہندستان کے ملی اخبارات میں شائع شدہ ایک تحریر

■ دکھانے کے دانتوں سے آپ کھانا نہیں کھا سکتے

ہندستان کے ملی اخبارات میں شائع شدہ ایک تحریر

■ اگر دنیا میں مسلمانوں کو واقعی جینے کی تمنا ہے، اگر وہ درحقیقت اپنی بات کو حقیقی اساس پر تعمیر کرنا چاہتے ہیں، اگر ان کی خواہش ہے کہ کل کو وہ اپنی غلط کاریوں کے یقینی مکافات سے بچیں، اگر وہ یہودیوں بلکہ مسلمانان اسپین کی طرح منقرض (تتر بتر) نہیں ہونا چاہتے تو کم از کم ان کے چوٹی کے علماء کا یہ فرض ہے کہ وہ سنی سنائی پر اعتماد نہ فرمائیں.

ہندستان کے ملی اخبارات میں شائع شدہ ایک تحریر سے اقتباس

■ دولتوں (ریاستوں، قوموں) کی نسبت رائے دینا ان سے معاملہ کرنا، ان کی خوشامدوں اور چکنی چپڑی باتوں پر کان رکھنا اس وقت ہمارے لئے مفید راہ نجات ہوسکتا ہے کہ ہم ان کے خالص اسرار سے باخبر ہوں.

ہندستان کے ملی اخبارات میں شائع شدہ ایک تحریر

■ تحریک لادینی ایک عالمگیر اور عالم سوز آتش ہے. یورپ کا مذہب، خدا تعالے کی طرف سے اس عصر سعادت کے لیے ناکافی ہونے کی وجہ سے، منسوخ کر دیا گیا تھا. عقلاء یورپ کی آنکھ نے اس کی عدم کفایت کا توصحیح ادراک کیا مگر دنیا کی بدقسمتی سے اس کے نعم البدل کو نہ پہچان سکے اور مذہبیت اور عبدیت الٰہی کی قید سے لادینی اور لاقیدی (آزادی) کے گڑھے میں جا گرے.

باب عالمی تحریکات پر نظر

■ اشتراکیت کی قوت نے اول مزدوروں کا علم بلند کر کے مزدوروں کے ممالک (مغرب) کی

طرف رخ کیا، ان کو وثوق تھا کہ یورپ کے مزدوران کے جھنڈے تلے جمع ہوکر مشرق پر بھی اپنا پھریرا اُڑا سکیں گے بگر (یورپی قوموں نے) . . جس وقت تجاوز کارلینن کا بوریا بستر ہ مملکت روم سے بندھوا کر مغرب کے قلب کو اس آتش جہان سوز سے بچالیا، تو اس نے مغرب کا لوہا مانا اور فوراً اپنے ہجوم اور تجاوز کا رخ مشرق کی طرف پھیر دیا. چنانچہ ماسکو نے اپنی حزب کے بہترین فرد (لیو-Leo) قراخان ارمنی کو چین روانہ کیا اور مسٹر (ایم این) رائے اور (پنجابی زبان کے شاعر) خوشی محمد وغیرہ کو ہندستان کے ہندو مسلم کو دام تزویر میں لانے کے لیے پوری طرح مسلح کیا، راجہ مہندر پرتاب کے ذریعہ سے غدر پارٹی کا مرکز افغانستان میں قائم کیا اور اس کا تعارف روسی سفارت سے کر کے اس کو افغانستان، فرنیٹر، ہندستان میں اشتراکی انقلاب کے لیے وقف عمل بنایا اور اس مقصد کے لیے کروڑوں پونڈ اور لاتعداد انسان چین، افغانستان، سرحد آزاد، اور ہندستان کے لیے صرف کیے اور کیے جارہے ہیں.

باب عالمی تحریکات پر نظر

■ جاپان کی (صنعتی) دانائی اور ہمت یورپ سے کسی درجہ میں کم ثابت نہیں ہوئی.

باب عالمی تحریکات پر نظر

■ یہ عام اسلامی ملتوں کا حقیقی مرض ہے کہ جس قدر ان کے عوام اچھے ہیں اس سے زیادہ ان کے رہنما برائیوں کے مجسمے ہیں.

باب عالم اسلام/ترک سیاست کا تجزیہ

■ ہم نے ہمیشہ کاغذی یا زبانی پروپیگنڈوں میں آکر اسلام کی آستین میں سانپ پالے ہیں.

باب عالم اسلام/ترک سیاست کا تجزیہ

■ مسلم ہند کی بے نظمی ایک بدترین لعنت ہے جو اس کو کبھی سرسبز نہ ہونے دے گی اور جس سے عالم اسلام کے دوسرے قطعات میں بھی کفر استفادہ کرنے میں کامیاب ہوتا رہے گا.

باب عالم اسلام/ترک سیاست کا تجزیہ

■ آج کی انسانیت انس اور انسانیت سے عاری ہے. متمدن قومیں تک بھی بدترین درندوں سے زیادہ وحشی اور ہلاکت کے چوٹی کے دیوتا ہیں. تمام متمدن اقوام اپنی پوری دماغی اور جسمانی، مالی

اور فنی قوتوں کو اس ایک شرمناک مقصد اور وحشیانہ ہدف نظر پر وقف کئے ہوئے ہیں کہ دنیا، اس کے اہالی، اس کی آبادی اور سرسبزی کو جلد سے جلد تباہ و برباد کرنے کی کیا صورت ہے.

باب عالم اسلام/ترک سیاست کا تجزیہ

■ میرے درد بھرے دل نے مجھے آمادہ کیا کہ اس انتہائی نکبت و زوال بشری کے ازالہ کی تدبیر سوچی جائے. دل کی آواز سے متنبہ ہو کر گہری سوچ کے بعد نظر آیا کہ اس بے سابقہ بربریت کی یگانہ علت قومیت پرستی کے فتنہ انگیز فلسفہ کی حاکمیت ہے. اس کے بعد میرے قلب پر وارد کیا گیا کہ اس عالم تباہ زہر کا تریاق صرف وصرف حکمت حکومتی قرآنی کی تدوین اور اس کی تبلیغ میں ہے.

باب عالم اسلام/ترک سیاست کا تجزیہ

■ عمل اور نظام عمل کا اتنے جلدی محو ہو جانا بالخاصہ جب کہ اس کا منبع حضرت شاہ ولی اللہ صاحب جیسے زبردست مجدد کا علم قرآن و حدیث ہو اور اس کے علمبردار حضرت سید (احمد شہید) صاحب، مولانا عبد الحی صاحب، مولانا اسمعیل ساحب، مولانا ولایت علی صاحب، مولانا محمد علی (مونگیری) صاحب وغیرھم جیسے عدیم المثال مجاہد ہوں ایک نہایت حیران کن امر ہے. یہاں قابل غور و دقت صرف یہ امر ہے کہ اس نظام عمل کے اس کی کامیابی سے پہلے ناکام بلکہ محو ہو جانے کے عامل و اسباب کیا ہیں.

باب عالم اسلام/ترک سیاست کا تجزیہ

■ انسان، انس و محبت کا پتلا ہونے کی علت سے حیوان عاشق ہے اور اسی عشق خانہ آباد کی برکت سے وہ اشرف کائنات ہے. اس عاشق کی اس بلند شرافت کا تقاضہ ہے کہ اس کا محبوب ضرور ہو. اور وہ محبوب اس سے بھی اشرف و اعلیٰ اور اجل و اکبر ہو، یعنی مساوی اور اس سے پست نہ ہو. کیونکہ مساوی اور پست میں وہ کون سی رمزیت ہے جو ایک سمجھدار انسان اسے اپنا دل دے کر خود کو اس سے دوسرے نمبر کی ہستی بنائے.

باب قرآن اور متمدن دنیا

■ قرآنی فلسفہ میں انسانیت کا مفہوم عشق الٰہی ہے.

باب قرآن اور متمدن دنیا

■ عشق وغرض میں نور وتاریکی جیسا بیر ہے. جہاں عشق اثر انداز ہوتا ہے وہاں سے غرض کافور ہوجاتی ہے .اور جہاں عشق نہیں رہتا وہاں غرض کالی گھٹا بن کر چھا جاتی ہے.

باب قرآن اور متمدن دنیا

■ حیوان انسانوں کے کام آتے ہیں.ان میں افادیت ہے، پاکی ہے،اس لئے قرآن حکیم عشق الٰہی سے خالی آدمیوں کو شیطان کا لقب دے کر حیوان کی مفید اور پاک صفت تک سے نکال باہر کرتا ہے.

باب قرآن اور متمدن دنیا

■ امام خدا تعالیٰ کی طرف سے مبعوث نہیں ہوتا بلکہ وہ بہتر شخص جس کو جمہور امت اسلام اور امت کی خدمت کے لئے انتخاب کر لیں وہی شخص خدائے ذوالجلال کے دربار میں بھی منظور ومعتبر ہو جاتا ہے.

باب شال .امامت کی ضرورت

■ دنیا تو جمہوریت کے لفظ سے یورپین جمہوریت ہی سمجھتی ہے.

باب جمہوریت کا مفہوم

■ جمہوریت کی ایجاد کا سہرا یورپ کے سر ہے اور اسلام کی تاریخ سے ثابت نہیں ہوتا کہ کسی عصر معتبر میں اسلام نے یہ بچہ جنا ہو تو پھر کیسے ہوسکتا ہے کہ آپ یورپ کے حقیقی فرزند کو اس سے چھین کر اور اسلام کی گود میں دے کر باور کرانے لگیں کہ یہ اسلام کا صلبی مولود ہے.

باب جمہوریت کا مفہوم

■ دنیائے اسلام میں میں نے جہاں تک آوارہ گردی کی ہے وہاں لفظ جمہوریت سے صرف ایک ہی معنٰی مراد لیے جاتے ہیں اور وہ صرف یورپین جمہوریت ہے.

باب جمہوریت کا مفہوم

■ ورثاء انبیاء کا کام تصنیف لغات نہیں بلکہ ان کا وظیفہ متعارف لغات میں مسائل حقہ کی تفہیم وتبلیغ ہے.

باب جمہوریت کا مفہوم

■ ہمارے نوجوان جو حکومت شرعیہ شورویہ کو جانتے ہی نہیں اور ان کے کان صرف یورپ ہی کے

کارناموں سے آشنا کیے گئے ہیں اس لفظ سے اس کے متعارف معنی یورپین جمہوریت سمجھ کر اسی کی طرف مائل ہوں گے.

باب جمہوریت کا مفہوم

■ ہر سیاسی نظام آغاز میں اور مرنے کے بعد نا قابل عمل ہوتا ہے.

باب اسلامی اقتصادیات/مکتوب بنام مولانا حفظ الرحمان

■ ہر دولتی (سیاسی) نظام آغاز میں اور مرنے کے بعد نا قابل عمل ہوتا ہے. اگر ایک شخص کو اس کی صداقت پر یقین آجاتا ہے اور اس کا ایمان ہوتا ہے کہ بنی نوع کا اس میں بھلا ہے تو وہ صرف اسی پر عمل کی دعوت دیتا اور اس راہ کے کانٹے پابرہنہ عبور کر کے اس کو قابل عمل بنا چھوڑتا ہے. اور وہ ایسا نہیں کرتا تو قیامت تک وہ (نظریہ) قابل عمل نہیں بنتا اور اس کے نا قابل عمل رہنے کا گناہ مبلغ کی سستی کی گردن پر رہتا ہے.

باب اسلامی اقتصادیات مکتوب بنام مولانا حفظ الرحمان

■ مقاطعہ قریش کے وقت بنی ہاشم کے کفار کا آپؐ سے معاملہ اس وقت کی خاندانی تشکیل کی حیرت انگیز قوت وربط وضبط کا مظاہرہ ہے جس میں آنحضورؐ اور جماعت مومنین کی طرف سے بنی ہاشم کے سامنے دست معاونت دراز نہیں کیا گیا تھا بلکہ بنی ہاشم نے جماعت مومنین کی مدد خاندانی اصول پر کرنا لازم سمجھا تھا.

باب اسلامی اقتصادیات مکتوب بنام مولانا حفظ الرحمان

■ رسول علیہ السلام نے یہ ہرگز نہیں فرمایا کہ حالات کے سازگار ہونے کے انتظار میں بنی ہاشم یا ابو طالب وعبدالمطلب کا مسلک معمول بنالو.

باب اسلامی اقتصادیات مکتوب بنام مولانا حفظ الرحمان

■ قرآن حکیم کی نظر میں. . .نظام سرمایہ داری اور نظام سوشلسٹی دونوں کا ایک ہی حکم ہے

باب اسلامی اقتصادیات مکتوب بنام مولانا حفظ الرحمان

■ (ہندستان میں) پچاس سال کے بعد. . .اگر آپ چاہیں کہ دوسروں کا پکا ہوا کھائیں تو یاد رکھیں دوسرے اپنا کھایا ہوا ہرگز آپ کو نہ کھانے دیں گے. بلکہ اپنی چکی کا ہتھہ آپ کے ہاتھ میں

دیگر آپ سے پسوائیں گے اور آپ کا پیسا ہوا بھی خود کھا جائیں گے اور اس میں سے آپ کو نہ کھانے دیں گے.

باب اسلامی اقتصادیات مکتوب بنام مولانا حفظ الرحمان

■ خدا پرستی کو مسجد کی چار دیواری کی قید و بند سے نکال کر دولتی اور سیاسی اور اقتصادی نظامات تک آمرانہ وسعت دیں.

باب اسلامی اقتصادیات مکتوب بنام مولانا حفظ الرحمان سے اقتباس

■ کسی کو مدد دینے اور کسی کی مدد قبول کرنے سے پہلے اپنے وجود کی تعمیر ضرور ہے.

باب اسلامی اقتصادیات مکتوب بنام مولانا حفظ الرحمان

■ کسی کے گھر کی تعمیر میں مدد دینے سے اپنا گھر نہیں بن سکتا. اپنا گھر تو بنائے سے ہی بنتا ہے.

باب اسلامی اقتصادیات مکتوب بنام مولانا حفظ الرحمان

■ آپ کو موقع حاصل ہے کہ تبلیغ نظام اقتصادی اسلام کے لئے ایک سیاسی مرکز قائم کر کے مسلم مزدور اور دہقان اور صناعوں کو اس پر سوشلسٹوں کی طرح جمع کرنا شروع کریں.

باب اسلامی اقتصادیات مکتوب بنام مولانا حفظ الرحمان

■ یورپ کے حقوق کو اسلامی لباس پہنانے کے بجائے کتاب وسنت و سیرت شیخین سے اسلامی حقوق عصری ترتیب واسلوب پر مدون کئے جائیں

مضمون آفتاب و ذرہ کا مسئلہ سے اقتباس

■ مسلمان طلبہ کے لئے دستور اساسی امامت امت کی تعلیم داخلِ نصاب کر لی جائے تو ان مسائل کو سمجھنے میں سہولت ہوگی.

مضمون آفتاب و ذرہ کا مسئلہ سے اقتباس

■ میرا نظریہ یہ ہے اور ایمان کہ کتاب وسنت اور سیرت نبوی و شیخین (حضرات ابوبکر و عمر) سے نظام سلطنت القرآن مدون کر کے نئے سرے سے اس کی تبلیغ علمی ٹھوس اصولوں پر شروع کی جائے.

باب نظام سلطنت قرآن/ یکم اکتوبر ۱۹۴۴ کابل

■ میری انسانی خدمت وطن کی آزادی سے نہایت بلند ہے. اور اس لیے میں اس کو وطن دوستوں

کے لیے چھوڑتا ہوں.

باب نظام سلطنت قرآن/ یکم اکتوبر ۱۹۴۴ کابل

■ اگر آج عام دنیا اور خاص عالم اسلام بستر مرگ پر پڑے ہوئے جان توڑ رہے ہیں تو اس کی صرف یہ وجہ ہے کہ لوگوں نے عمل سے ہٹ کر صرف علم تک اپنے کو محدود رکھا ہے.

مکتوب بنام شیخ الجامعہ ملیہ/ از کابل ۲ دسمبر ۱۹۳۴

■ امت اسلامیہ کا موجودہ افتراق اور جمود اور قعود اور امم غیر مسلمہ کا انقلابات جہاں سوز میں پہنچ کر قریب بہ فنا پہنچنا صرف اور صرف اس وجہ سے ہے کہ زندگی کا صحیح نقطۂ نظر نہیں رہا.

مکتوب بنام شیخ الجامعہ ملیہ/ از کابل ۲ دسمبر ۱۹۳۴

■ آج امت اسلامیہ کے سامنے کوئی صحیح نقطۂ نظر پیش نہیں کیا جا رہا ہے. اس لیے اس کی بے حسی اور بے احساسی بھی دور ہونے میں نہیں آتی.

مکتوب بنام شیخ الجامعہ ملیہ/ از کابل ۲ دسمبر ۱۹۳۴

■ امم غیر مسلمہ کے سامنے نقطۂ نظری ضرور ہیں مگر سب غیر صحیح حتیٰ کہ بعض غیر انسانی ہیں.

مکتوب بنام شیخ الجامعہ ملیہ/ از کابل ۲ دسمبر ۱۹۳۴

■ یہ رب العلمین، رب الناس کی ملوکیت کا معاملہ ہے. اس لیے اس کی تبلیغ عمومی کی ضرورت ہے.

قرطاس ابیض سے اقتباس/ ۱۸ شعبان ۱۳۴۳ (۱۴ مارچ ۱۹۲۵)

■ ہندستان کے رہنماؤں نے بالضرور اپنی آزاد حکومت کی تشکیل کے لئے متحدہ لامرکز یہ (وفاقی جمہوریہ/ confederation) کے اصول پر (مولانا حسرت موہانی کی رائے کے بموجب) ترتیب دیا ہے. یہ ہندستان کی مختلف اقوام اور مختلف عناصر (قدیم باشندگان، آرین اقوام، اہل اسلام، سکھ، منگول، عیسائی اور پارسیوں) کے درمیان مضبوط اتحاد کے لئے فرمایا گیا ہے کیونکہ ہندستان کے امن اور اتحاد کے زور پر دنیا کے امن و اتحاد کی بے مثال خدمت انجام دی جا سکتی ہے.

باب جدید تفسیر کی ضرورت/تحریر ۱۹۲۳. طباعت شعبان ۱۳۵۰ (دسمبر ۱۹۳۱ء)

■ سیاسی میدان میں انسانی عظمت کی کامیابی تین باتوں پر منحصر ہے اول عبادت الٰہی (قیام نماز) اپنے شرف کے مرتبہ کی حفاظت کے لئے، دوسرے ریاست میں امن و سلامتی کا قیام اور تیسرے

انسان کے لئے دلی آرام وسکون کا حصول.

باب جدید تفسیر کی ضرورت/تحریر۱۹۲۳،طباعت شعبان ۱۳۵۰ (دسمبر ۱۹۳۱ء)

■ ہندستان کے امن اور اتحاد کے زور پر دنیا کے امن واتحاد کی بے مثال خدمت انجام دی جا سکتی ہے.

باب جدید تفسیر کی ضرورت/تحریر۱۹۲۳،طباعت شعبان ۱۳۵۰ (دسمبر ۱۹۳۱ء)

■ امم اسلامیہ جن میں ملل عربیہ بھی ہیں بلند اجتماعی حریت فکر، جرأت اجتماعیہ اخلاق سے افغانستان وایران کی طرح عموماً محروم ہیں.

مکتوب بنام قاری حمید میاں انصاری

■ ہوسکتا ہے کہ ممالک اسلامیہ، اسیر ہوں یا آزاد، کچھ افراد ایسے پیش کر سکیں جو حکومت الٰہی کو سمجھ اور سمجھا سکیں، مگر ان ممالک میں ایسی قوم پیش کرنے کی صلاحیت نہیں دیکھتا جو اپنے حلقۂ اقتدار میں حکومت الٰہی کا جھنڈا گاڑ کر اس کو صحیح اصول پر عملاً دنیا کے سامنے رکھ بھی سکیں.

مکتوب بنام قاری حمید میاں انصاری

■ جماعت جو کسی اجتماعی ہدایت کی علمبردار بن سکے اور جو اجتماعی اصول کو تہہ تک سمجھ کر اس کی اصلی شکل میں دنیا کے سامنے پیش کر سکے ان ممالک میں ان ملل میں مل سکے گی جو بشریت کی ہمدردی و انسیت کی خاطر سرفروشی کے خوگر ہیں. جن میں اجتماعی تحقیقات کا آزاد دریا بے خوف وخطر ٹھاٹھیں مار رہا ہے اور جن میں جرأت اخلاقی بھی ہے، جن کو اب حیات اجتماعی کی بے حد طلب ہے، جو غلامی وآزادی میں امتیاز کر سکتے ہیں، اور آزادی انسانی ان کو دنیا و مافیہا سے زیادہ عزیز ہے. میری رائے میں، اگر وہ غلط نہ ہو، وہ یورپ وامریکہ اول نمبر، جاپان بہ مرتبہ دوم ہے. اس لئے میرا خیال ہے کہ اگر ہندستان مرکز تبلیغ قائم کر سکے تو اس کو نمبر اول.

مکتوب بنام قاری حمید میاں انصاری

■ حکومت الٰہی کی تبلیغی نظر میں ہندو، مسلم، یہودی، نصرانی، آتش پرست وصابی اور موحد ودہری اور سیاہ وسفید، زرد وسرخ اور مشرقی مغربی وغیرہ وغیرہ کی مطلق تمیز نہیں. وہ سب کی یکساں طریقہ پر بہی خواہ ہے اور وہ بلاتفریق انسانیت کے ہر شخص، ہر قوم کی نسبت خواہش رکھتی ہے کہ انسان شخص،

قوم،حزب کی غلامی وعبدیت کی رذالت سے نجات پائے اوراس کے ساتھ ہی وہ آپس کی سر پھٹول کے حامی فلسفوں کے تنویمی تاثرات رکھ کر اپنے جامعہ کی یگانہ تعمیر، انس ومحبت، لطف و احسان کی امن پرور اساس پر قائم کرے.

باب اسلامی نظام نامہ/مکتوب بنام قاضی دیروسوات

■ آج ہر غیر سیاسی جزئیہ کے متعلق تو ہمارے یہاں تحقیقات کے انبار لگے ہوئے ہیں اور سیاسیات نبویہ اوراصول دولتی قرآن کے متعلق ایک عام خاموشی طاری ہے

باب اسلامی نظام نامہ/مکتوب بنام قاضی دیروسوات

■ قرآن کی تازہ خدمت کے علمبردارصرف وہی پاک نیت اور پاک نفس افراد ہو سکتے ہیں جو حضرات صحابہ کی طرح غرض شخصی، قومی، حزبی سے بالکل پاک ہوں اور بہی خواہی بنی نوع کے سوا ان کا کوئی نقطۂ نگاہ مطلق نہ ہو.

باب اسلامی نظام نامہ/مکتوب بنام قاضی دیروسوات

■ ہرایک حکومت اپنی حیات وبقا کی اولین شرط اس امر کو جانتی ہے کہ یکے بعد دیگرے تمام دوسری حکومتوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا کر ان کے محروسوں کو اپنے محروسہ کا ضمیمہ بنالے. اس طرح کلیہ انسانی کے ان غرض پرست عناصر کے اندر سر جوڑ کر بیٹھنے کی اہلیت مطلق نہیں رہتی، اور نہ پھر وہ ان میں کسی طرح پیدا ہوتی ہے.

باب اسلامی نظام نامہ/ قاضی دیروسوات کے نام مکتوب

■ (اہل غرض) کی ہمیشہ سے یہی کوشش چلی آئی ہے کہ وہ بنی نوع انسان کو دھوکہ دے کر اپنی غرض میں پھانس لیں. ان کی غرض یا تو شخصی ہوتی ہے یا قومی یا حزبی. شخص پرست لوگ ایک شخص کی، اور قوم کے بندے اپنی قوم کی، اور کسی انسانی ساخت کے مسلک سیاسی کے پجاری اپنی جماعت کی حکومت اپنی مساوی المرتبہ بنی نوع پر قائم کر دیتے ہیں. ان کی اس غرض پرستانہ کوشش کی کامیابی سے مساوات کی مبادی کے ساتھ امن وسلام عالم بھی برباد ہوجاتا ہے.

باب اسلامی نظام نامہ/مکتوب بنام قاضی دیروسوات

■ اسلام، جمہوریت، مشروطیت، اشتراکیت، فسطائیت کی طرح ایک دولتی (سیاسی) مسلک

ہونے کے باوجود ان کے ساتھ نا قابل جمع ہے. ان باطل مسالک کی بنیاد نا قابل جمع سیاہ غرضوں پر رکھی گئی ہے اور اس لئے وہ آپس میں مطلق جمع نہیں ہو سکتے.

باب اسلامی نظام نامہ/مکتوب بنام قاضی دیروسوات

■ ہر مسلمان پر لازم ہے کہ وہ پورا قرآن شریف ترجمہ کے ساتھ پڑھے کیونکہ سورۂ فاتحہ اور قرآن مبین کے ترجمہ کے بدون کوئی مسلمان ہرگز نہیں سمجھ سکتا کہ اس نے عرضی میں کیا عرض کیا اور بادشاہ اور قدر دان مالک کی طرف سے اس کی عرضی کا کیا جواب ہے. اور کیا وظیفہ مہربان مقرر ہوا ہے اور اس کو سلطنت کا کون سا نظام دیا گیا ہے کہ جس کو وہ دنیا میں تبلیغ کے ذریعہ قایم کرے اور اس کو کون سا قانون عطا ہوا ہے جسے وہ اپنے اور اپنوں اور اپنے ملک پر جاری کرے.

باب اساس انقلاب/۳ رجب ۱۳۶۰ھ (۲۸ جولائی ۱۹۴۱)

■ معنوں کے ساتھ قرآن شریف پڑھنا ہر مسلمان مرد وعورت پر سب سے زیادہ لازم ہے.

باب اساس انقلاب/۳ رجب ۱۳۶۰ھ (۲۸ جولائی ۱۹۴۱)

■ اعتماد علی اللہ کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انسان تدبیر اور تیاری آلات واسباب سے بےغم ہو کر ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائے. ایسا کرنا حماقت اور خدا کے احکام سے جہالت ہے.

باب اساس انقلاب/۳ رجب ۱۳۶۰ھ (۲۸ جولائی ۱۹۴۱)

■ فلق اور صبح صادق سے مراد قرآن عظیم کا وہ ابتدائی اثر ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں عرب وعجم کی چیدہ چیدہ ہستیوں پر اساسی طور پر پڑا تھا.

باب اساس انقلاب/۳ رجب ۱۳۶۰ھ (۲۸ جولائی ۱۹۴۱)

■ ایک اور زمانہ آنے والا ہے جس کو قرآن عظیم کی بشارت **یظھرہ علی الدین کلہ** ظاہر فرماتی ہے. . . . میں اس زمانہ کو قرآن عظیم کے طلوع سے تعبیر کرتا ہوں.

باب اساس انقلاب/۳ رجب ۱۳۶۰ھ (۲۸ جولائی ۱۹۴۱)

■ جزئیات مسائل میں پڑنا آج محرومی کا باعث ہوسکتا ہے.

باب سوسال پہلے. بےخبر نہ تھے. مولانا شوکت علی کے نام مکتوب

■ میرے نزدیک ان (کانگریس) کا پروگرام یہ ہے کہ خطرۂ نصرانیت (امریکہ اور یورپ) سے

دو دو ہاتھ کرنے کے وقت وہ مسلمانوں کی امداد حاصل نہ کریں کیونکہ اس سے وہ (مسلمان) قوت حاصل کرلیں گے اور چونکہ ان کی قوت خار دلدوز کی قوت کے مرادف ہے اس لیے بعد میں اس کو دل سے نکالنا بہت مشکل کام ہوگا، بلکہ بسا ممکن ہے کہ وہ (مسلمان) رہی سہی نصرانی قوتوں سے ساز باز کر کے ہندوؤں کو مہلک صدمہ پہنچا ئیں. پس ضرور ہے کہ لگے ہاتھوں مسلمانوں کا خاتمہ بھی کر دیا جائے. اس کام کے لیے انہوں نے دولت بلشویک روسیہ سے کامل ساز باز کر لی ہے. اس کا مقصد ہندستان سے افغانستان کا خطرہ کم کرنا ہے ،یعنی جب ہندو حرکت شروع ہو تو روس افغانستان کو ہندستان میں استفادہ سے روکے. میں نے اس قسم کی ایک اتفاقیہ تصریح راجہ مہندر پرتاپ سے خود سنی ہے.

باب سو سال پہلے . بے خبر نہ تھے. مولانا شوکت علی کے نام مکتوب

■ ہندوؤں کے بعض بگلہ بھگت اور دور اندیش افراد (اشارہ راجہ مہندر پرتاپ وغیرہ کی طرف ہے) عرصہ سے اتحاد اسلام کی حرکت میں جرمن اور ترکیہ کے دست و باز و بن کر کام کرتے رہے ہیں اور اس حرکت کے ذیل میں ان کو مسلمانوں کی کمزوریوں پر مطلع ہونا تھا جس چھان بین سے وہ کما حقہ فارغ ہو چکے ہیں. آج ان کو وثوق حاصل ہے کہ موجودہ مسلمانوں کی (تحریک آزادی کی) یہ بیل منڈھے چڑھنے والی نہیں. لہٰذا یہ ہوا ہندو جاتی کے واسطے بالکل خطرناک نہیں

باب سو سال پہلے . بے خبر نہ تھے. مولانا شوکت علی کے نام مکتوب

■ آج ہندوؤں کا مجوزہ پروگرام مکمل ہو چکا ہے اور وقت آگیا ہے کہ اب وہ یورپ کے ساتھ مسلمانوں کو بھی ہندستان سے نکال دیں اور افغانستان اور ایران میں مغلوب ومحکوم بنالیں.

باب سو سال پہلے . بے خبر نہ تھے. مولانا شوکت علی کے نام مکتوب

■ معنوں کے ساتھ قرآن شریف پڑھنا ہر مسلمان مرد و عورت پر سب سے زیادہ لازم ہے.

باب مقصد صلاۃ

■ کانگریس اور اس جیسی دوسری قوتیں (برطانوی) حکومت ہند کے مقابل اور متوازی حکومتیں ہیں. حکومت ہند کا زبردست حوصلہ ان سے زیادہ اچھوت نو مسلموں کی تنظیم کو برداشت کر سکے گا. کیونکہ اول وہ صرف ایک تبلیغی نظام ہوگا اور سیاسی تحریک سے زیادہ تبلیغ فطرت اس کا ہدف نگاہ

ہوگا.دوسرے یہ کہ وہ امن کی ایک زبردست تحریک ہے جس کا بلاتفریق مذہب وملت بشریت کا ہر فرداور ہرقوم محتاج ہے.

باب بلیغ مساوات.زندہ آرزو.مولانا اکبرشاہ خاں کے نام مکتوب

■ اول اپنے اسلاف کا مقصد معین کیا جائے.اس کے بعد خود کو اس کی تکمیل کوشش میں وقف کیا جائے.ان دونوں مرحلوں کے بعد اگر اپنے بزرگوں کے لئے زبانی مدح سرائی بھی کی جائے تو مفید، ورنہ ان کا نام نہ لیناہی بہتر کیونکہ اس صورت میں وہ ناکام بزرگ ہوں گے.

باب راہ مستقبل/مولانا یوسف بنوری کے نام خط

■ ہندستان یورپ جیسی ایک چھوٹی سی دنیا ہے جس میں مختلف العدد بہت سی ایسی قومیں آباد ہیں جن کے دلوں میں اپنے اپنے استقلال وآزادی کی لو اپنی انتہائی شدت اور قوت کے ساتھ لگی ہوتی ہے اور ان میں سے کوئی قوم بھی راضی نہیں کہ اپنے استقلال (آزادی) کو کسی قیمت پر بھی بیچے.

باب ہندستان کی سیاسی تشکیل

■ ہندو بالکل تیار ہو چکے ہیں.ان کو جو کچھ کرنا ہے وہ ضرور اس پر عمل پیرا ہوکر رہیں گے.ایسی حالت میں جامعۂ اسلامیہ (مسلم معاشرہ) کا تذبذب اور موجودہ افتراق ان کی محرومی اور ہلاکت اجتماعی کا قطعی سبب ہوگا.

باب خیاباں بیاباں/صحرا کا سناٹا

■ ہندوقوم ایک مرکز پر جمع ہے کیوں کہ اس کے سامنے ایک مہم اور نہایت جاذب نقطۂ نظر جلوہ گر کیا گیا ہے کہ طویل عریض ہندستان کی تمام آبادی اور ثروت اصول جمہوری کے اعتبار سے تمہارے ہاتھوں کا کھلونا ہوگی. بالفاظ دیگر یہ کہ ہندستان میں کانگریس ہندوراج قائم کررہی ہے.اب اس کے مقابلہ میں دیکھا جائے کہ مسلمان رہنماؤں نے کیا کیا ہے؟

باب خیاباں بیاباں/صحرا کا سناٹا

■ ہندستان سے برطانی سیادت کا اٹھانا میرے اعتقاد میں ایک آزادی خواہ کا اولین مقصد ہے اور میں بھی اس مقصد کو امت کی حیات اجتماعی کی شرط اول سمجھتا ہوں.لیکن یہ مقصد تنہا تو اس وقت امت کا نقطۂ نظر قرار پاسکتا تھا اور جاذب قلوب ہوسکتا تھا کہ ہندستان یا تو خالص مسلمانستان ہوتا یا

کم از کم اس میں مسلمانوں کو اکثریت فائقہ حاصل ہوتی. بحالات موجودہ کہ وہ اقلیت فائقہ میں ہیں اور جہاں ان کو اکثریت حاصل ہے وہاں بھی وہ خالص نہیں. (لہٰذا) صرف برطانی سیادت کا قلع قمع، امت کی آزادی اور استقلال حیات کے لیے کافی نہیں ہوسکتا.

باب خیاباں بیاباں/صحرا کا سناٹا. کانگریسی مسلمان

■ ہمارے رہنما کانگریسی تجاویز کے جال میں پھنسے رہے اور امت کے سامنے خود کوئی نقطۂ نظر ایسا نہیں پیش کر سکے جس سے ان (عام مسلمانوں) کو دلچسپی ہوتی اور وہ اس کی جاذبیت سے مسحور ہو کر دیوانہ وار ایک نقطہ پر جمع ہو جاتے.

باب خیاباں بیاباں/صحرا کا سناٹا

■ صرف برطانی سیادت کا قلع قمع امت کی آزادی اور استقلال حیات کے لیے کافی نہیں ہوسکتا.

باب خیاباں بیاباں/صحرا کا سناٹا. کانگریسی مسلمان

■ صرف برطانیہ کے نقصان اور اخراج سے مسلمانان ہند کو نفع پہنچنا علی الخصوص موجودہ وقت میں نہایت مشتبہ بلکہ مخالف عقل و تجربہ ہے.

باب خیاباں بیاباں/صحرا کا سناٹا=کانگریسی مسلمان

■ برطانیہ کا موجودہ قبضہ اگر ہندستان سے اٹھ جائے تو ان (علاقائی) عناصر میں کوئی ایسی مشترک چیز باقی نہیں رہتی جو ان کے اختلاف کا گلا گھونٹ کر اتحاد عام کی ضمانت کر سکے.

باب خیاباں بیاباں/صحرا کا سناٹا. کانگریسی مسلمان

■ بے شک دشمنِ تجاوز کار (ظالم) سے دشمنی اور اس پر ضرب لگانا ہمارا ناقابل تبدیل مذہب ہے ،مگر وہ کسی ایک نسل کے ساتھ مخصوص نہیں کیا جاسکتا، اس کی تعمیم (عمومیت) اور ہر تجاوز کار کو تجاوز کا رسمجھنے میں ہی شرف حیات کی حفاظت مضمر ہے، خواہ سات سمندر پار ہو کر آیا ہو یا وہ ہمارے پہلو میں بیٹھا ہوا ہمیں اسیر کرنے کے لیے مصر ہو.

باب خیاباں بیاباں/صحرا کا سناٹا. کانگریسی مسلمان

کتابیات

آزاد، محمد حسین. دربار اکبری (سن ندارد) مکتبہ کلیاں لکھنؤ.
آسی، محمد حنیف. خطبات شیخ الہند: ڈاکٹر احمد حسین کمالی کی نظر میں. (۱۹۸۸) شیخ الہند سوسائٹی. کبیر والا. پاکستان.
احمد، اسرار. جماعت شیخ الہند اور تنظیم اسلامی. (۱۹۸۷) مرکزی انجمن خدام القرآن. لاہور.
احمد، عزیز. (ار: تر: جمیل جالبی). ہند و پاک میں اسلامی جدیدیت (۱۹۹۰). ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس. دہلی.
ادروی، اسیر. تحریک آزادی اور مسلمان (پانچویں اشاعت ۱۹۹۹)، دار المؤلفین. دیوبند.
اورا کے علمی رفقا. مرج البحرین (۲۰۱۸). اقرا ایجوکیشن فاؤنڈیشن. ممبئ.
اکرام، شیخ محمد.
آبِ کوثر. (۱۹۹۷). ادبی دنیا. دہلی.
رودِ کوثر. (۱۹۹۷). ادبی دنیا. دہلی.
موج کوثر. (۱۹۹۷). ادبی دنیا. دہلی.
الحسینی، قاضی وجدی (سید عابد علی).
مولانا برکت اللہ بھوپالی. (۱۹۸۶). مدھیہ پردیش اردو اکادمی. بھوپال
ہندستان اسلام کے سائے میں. (۱۹۸۶) (؟) بھوپال.
امروہی، محمد ضیاء الدین علوی. مراۃ الانساب. (اپریل ۱۹۱۷). رحیمی پریس. سوائی جے پور.
انصاری، محمد میاں منصور. آسمانی حکومت کی تصویر (حکومت الٰہی) (تاریخ وسن؟). ماہ نامہ قائد. مرادآباد.
بنسل، رتن لال. مسلم دیش بھکت (تازہ اشاعت ۱۹۹۱). ہندستانی کلچرل سوسائٹی الہ آباد.
پانی پتی. کریم الدین. طبقات الشعراء ہند (۱۹۸۳). اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ.
جلالی، سید فرخ. دیوبند اور مولانا عبداللہ انصاری. رسالہ الحبیب (ماہ؟ - ۲۰۰۰) علی گڑھ.
چند، سرکار. تاریخ تحریک آزادی ہند. (جلد ۲-۳) (۲۰۰۱) (اردو ترجمہ: غلام ربانی تاباں وقاضی عدیل عباسی) قومی کونسل برائے فروغ اردو نئی دہلی.
خان، اقبال حسن. شیخ الہند مولانا محمود حسن، حیات اور علمی کارنامے (۱۹۷۳). مسلم یونیورسٹی علی گڑھ.
راشد، نور الحسن. ناموران علی گڑھ: دوسرا کاروان: مولانا عبداللہ انبہٹوی فکر و نظر (سن؟). مسلم یونیورسٹی علی گڑھ.

رضوی، سید محبوب.
تاریخ دارالعلوم دیوبند (۲ جلد) (دوسری اشاعت ۱۹۹۳). دارالعلوم دیوبند. دیوبند
تاریخ دیوبند (۱۹۷۲). مکتبہ تاریخ دیوبند. دیوبند.
سرور، محمد. مولانا عبیداللہ سندھی (۱۹۴۳). سندھ ساگر اکادمی. لاہور.
سندھی. عبیداللہ.
شاہ ولی اللہ اوران کی سیاسی تحریک (۱۹۴۴). سندھ ساگر اکاڈمی. لاہور
مولانا عبیداللہ سندھی کی ذاتی ڈائری (سن ندارد) نواز پبلکیشنز. دیوبند.
شاہجہانپوری، ابوسلمان (مرتب) کلیات شیخ الہند (سن ندارد). ربانی بک ڈپو. دہلی.
شہابی، مفتی انتظام اللہ. غدر کے چند علماء (سن ندارد). نیا کتاب گھر. دہلی.
صدیق، عادل. شیخ الہند مولانا محمود الحسن. روزنامہ قومی آواز (۱۵ اگست ۲۰۰۰) نئی دہلی.
طیب، محمد (حکیم الاسلام). روداد سفر افغانستان: (۱۳۵۸ھ/۱۹۴۰). دارالعلوم دیوبند. دیوبند
عاصم، عبید اقبال. مولانا ظفر احمد عثمانی تھانوی: ایک مطالعہ. (۲۰۰۹). حافظی بکڈ پو. دیوبند.
عاصم، عبید اقبال اور غازی، ارشد منصور. ذکر غازی (۱۹۱۸). اقرا ایجوکیشن فاؤنڈیشن. ممبئی.
عباسی، قاضی عدیل. تحریکِ خلافت (دوسری طباعت ۱۹۹۷) قومی کونسل اردو. دہلی.
عبدالخالق، خواجہ. تحریک آزادی اور شیخ الہند محمود الحسن. روزنامہ اردو ٹائمز (۱۵ اگست ۲۰۰۰) ممبئی.
عبدالرحمٰن، صباح الدین.
ساتویں صدی تک کے رجال سندو ہند. ماہنامہ معارف (اپریل ۱۹۵۸). اعظم گڑھ.
ہندوستان کے سلاطین، علماء ومشائخ پر ایک نظر. ماہنامہ معارف (مئی ۱۹۶۴). اعظم گڑھ.
غازی، ارشد منصور تحریک شیخ الہند کا شعوری سرمایہ. ہفتہ وار معرکہ (تاریخ وسن ندارد) نئی دہلی.
غازی، حامد الانصاری.
مولانا عبیداللہ سندھی اور مولانا محمد میاں منصور انصاری. جمہوریت ویکلی (آزادی نمبر ۱۹۵۷): بمبئی.
صد سالہ یادگار ۱۸۵۷ (۱۹۵۷). جمعیۃ علماء ہند ممبئی سٹیٹ: بمبئی.
غازی، محمد طارق. تذکار الانصار (۲۰۱۸). اقرا ایجوکیشن فاؤنڈیشن. ممبئی.
فاروقی، برہان احمد. شیخ مجدد کا نظریہ توحید (سن ندارد). سندھ ساگر اکاڈمی. لاہور.
فرشتہ، محمد قاسم. تاریخ فرشتہ (۲ جلد). اردو ترجمہ عبدالحق (۱۹۸۳). مکتبہ ملت. دیوبند.
فکری، سید ابراہیم. ہندوستانی مسلمانوں کا جنگ آزادی میں حصہ (۱۹۹۷). مکتبہ جامعہ نئی دہلی.
قیصر، سید ازہر شاہ. یادگار زمانہ ہیں یہ لوگ. (سن ندارد) شاہ منزل. دیوبند.
کمال، میم تحریکِ خلافت. اردو ترجمہ: نثار احمد. (۱۹۹۱). سنگ میل پبلکیشنز. لاہور

کاندھلوی، حبیب الرحمٰن. مذہبی داستانیں اوران کی حقیقت (جلد اول) (چھٹی اشاعت ۱۹۹۵). الرحمٰن پبلشنگ ٹرسٹ. کراچی.
لال، پنڈت سندر. سن ستاون (۱۹۵۷). انجمن ترقی اردو ہند. علی گڑھ.
لدھیانوی، عزیز الرحمٰن. جنگ آزادی کے مسلم مجاہدین (حصہ سوم) (۱۹۵۷). الجمعیۃ بک ڈپو. دہلی.
مبارکپوری، قاضی اطہر. عرب و ہند عہد رسالت میں. (سن ندارد). ندوۃ المصنفین. دہلی.
مدنی، حسین احمد.
سفرنامہ اسیر مالٹا. (سن ندارد). مکتبہ الفضل. دیوبند.
نقشِ حیات (۲ جلد) (۱۹۹۹). مکتبہ دینیہ. دیوبند.
مظاہری، اسلام الحق. تذکرہ مشائخ ہند (۱۳۹۷ھ) اسلامی دار المطالعہ. سہارنپور.
میاں، سید اصغر حسین.
(مرتب) کلیات شیخ الہند. (۱۳۴۰ھ) مطبع قاسمی. دیوبند.
مکتوبات شیخ الہند (سن ندارد). مطبع قاسمی. دیوبند.
میاں، سید محمد.
تحریک شیخ الہند (۱۹۹۱). نگارشات. لاہور.
علمائے ہند کا شاندار ماضی (مکمل) (سن ندارد). کتابستان. دہلی.
میرٹھی، محمد عاشق الٰہی
تذکرۃ الخلیل. (۲۰۰۳). دار الکتاب. دیوبند.
تذکرۃ الرشید. (۲۰۰۲). دار الکتاب. دیوبند
ندوی، سید سلیمان. ہندوستان میں اسلام کی اشاعت کیوں کر ہوئی. ماہنامہ معارف (جنوری ۱۹۲۴). اعظم گڑھ.
ندوی، محمد اسجد قاسمی. حضرت شیخ الہند (۲۰۱۴). مرکز الکوثر التعلیمی والخیری. مرادآباد.
نظامی، خلیق احمد. شاہ ولی اللہ دہلوی کے سیاسی مکتوبات (سن نامعلوم). انجمن ترقی اردو. دہلی.
ہاشمی، عبد القدوس (مرتب). تقویم تاریخی. (۱۴۰۷ھ). ادارۂ تحقیقات اسلام. اسلام آباد. پاکستان.

انگریزی

Ghazi, Abidullah. The Silk Letters Movement. Unpublished article.
Irfan, M. (Eng Tr. S Iftkhar Ali). Barkatullah Bhopali (2003). Babul Ilm Publications. Bhopal.

سدا مہاجر

سوانح حیات علامہ محمد میاں منصور انصاریؒ

جناب مولانا منصور انصاریؒ کو وحدت اسلامی اور مسلم ممالک کی آزادی سے عشق تھا اور تمام عمر اسی راہ پر مردانہ وار چلتے رہے۔ احکام قرآنی کی اساس پر حکومت اعلائے الٰہی کی تشکیل ان کا مقصود تھی۔ صدہا شاگردان کے دامن فیض سے تربیت پا کر نکلے۔ وہ مسلمانان عالم میں استبدادی نظاموں اور مسلم ممالک کے حکمرانوں کے پھیلائے ہوئے فساد کو بڑے استعماری ملکوں کی تخریب کاری سے کمتر نہیں گردانتے تھے۔ اسی لئے ریاست کے بڑے عہدے انہیں پیش کئے جاتے مگر وہ نرمی سے انکار کر دیتے تھے اور تفسیر قرآن کریم کے اجزا کی تالیف اپنی جیب سے کرتے تھے اور ان کے لبوں پر ہمیشہ تاسیس حکومت الٰہی کے دلائل رہتے تھے۔ افغانستان کے مسلمان انہیں صدر اسلام کے مجاہد علماء کے مکارم اخلاق کا نمونہ تصور کرتے تھے کہ جو بھی ان کی خدمت میں حاضر ہوتا انہیں پدر روحانی اور اجتماعیات کا آموزگار، حقیقی مجاہد اور اسلامی سیاست کا مدار سمجھتا تھا۔

اے کاش وہ دن جلد آئے جب ان کے گراں بہا آثار زیور طبع سے آراستہ ہوں اور فرزندان توحید اس قیمتی خزانہ اور اعلیٰ ذخیرہ سے استفادہ کر سکیں۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

IQRA EDUCATION FOUNDATION

A-2, Firdaus, 24. S.V.Savarkar Road

Mahim West

Mumbai-40001 (India)

Tel: +91 22 24440494/ 9359210010

EmaiL: contact@iqraindia.org

Visit: WWW.IQRAINDIA.ORG

Price: Rs.500/-